اردو میں تفسیری ادب

(ایک تاریخی اور تجزیاتی جائزہ)

پروفیسر ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی

عثمانیہ اکیڈمک ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
ایس ٹی ۵/۱۰، گلشن اقبال کراچی

نام کتاب ـــــــــ اردو میں تفسیری ادب

سال اشاعت ـــــــــ ۱۹۹۲ء

تعداد ـــــــــ ۵۰۰

مطبوعہ ـــــــــ آر آئی پرنٹرز کراچی

قیمت ـــــــــ ۱۰۰ روپے

ناشر

عثمانیہ اکیڈمک ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
ایس ۔ ٹی ۔ ۱۰/۱۰ ۔ گلشنِ اقبال ۔ کراچی

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۳۶	مقبول احمد دہلوی	۱۱۸
۳۷	اردو تراجم پر مختصر تشریحی حواشی کا جائزہ	۱۱۸
	باب چہارم	
۳۸	اردو کی مشہور تفاسیر ـ تاریخی جائزہ اور تجزیہ ـ فارسی تفاسیر (مثلاً تفسیر بیضاوی، تفسیر حسینی، تفسیر کبیر وغیرہ کے اردو تراجم	۱۲۸
۳۹	لفظ تفسیر کی تشریح، تفسیر نویسی کا آغاز و ارتقا اور اصول تفسیر	۱۲۹
۴۰	اردو میں تفسیر نویسی کا آغاز اور اہم تفاسیر کا انفرادی جائزہ	۱۵۱
۴۱	ابتدائی دور کی اردو تفاسیر	۱۶۱
۴۲	تفسیر سورہ یوسف	۱۶۲
۴۳	تفسیر سورہ ہود و الحجر	۱۶۸
۴۴	تفسیر حسینی	۱۷۳
۴۵	تفسیر سورہ بنی اسرائیل و کہف	۱۷۹
۴۶	تفسیر مرادی از شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی	۱۸۳
۴۷	تفسیر مرتضوی (منظوم) از غلام مرتضیٰ جنون	۱۸۹
۴۸	تفسیر موضح القرآن از حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ	۱۹۲

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

عرضِ مولف

تحقیقی مقالے کے لئے موضوع کی تلاش کسی طرح بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اس کدوکاوش میں کئی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ موضوع اچھوتا ہو اور اس پر کسی اور نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ یا اگر کی ہو تو اس کے بعض گوشے ایسے رہ گئے ہوں جن پر پوری طرح روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ موضوع ایسا ہو جو افادیت کا حامل اور دل چسپ ہو۔ ماخذ کثیر تعداد میں اور سہل الحصول ہوں اور ان پر پورے اعتماد سے مقالہ لکھا جا سکے۔

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر میں نے مختلف موضوعات کا جائزہ لیا اور بہت غور وخوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میں قرآن کریم سے متعلق کوئی موضوع منتخب کروں۔ اس لئے کہ یہی ہماری اصل محسن کتاب اور ہماری دینی و دنیوی سعادتوں کا سرچشمہ ہے۔ یہی ہمیں راہِ ہدایت دکھاتی ہے اور اسی سے ہمیں اپنا نظامِ زندگی مرتب کرنے میں روشنی ملتی ہے۔

یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد کہ مجھے اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے قرآن کریم سے کوئی موضوع لینا ہے، میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس جامع کتاب سے متعلق جو اللہ کا کلام ہے، موضوعات بھی کثیر تعداد میں حاصل ہو سکتے ہیں، اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کتابِ ہدایت کہہ کر نازل کیا ہے اور اس سے ہدایت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس کے

مطالب و مفہوم اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی زبان میں لکھی جانے والی تفاسیر کا مطالعہ کرنا اور ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس خیال نے مجھے یہ فیصلہ کرنے میں مدد دی کہ میں قرآن کریم کی اردو میں لکھی جانیوالی تفاسیر ہی کو اپنی تحقیق کا موضوع بناؤں تاکہ اس سے خود بھی فائدہ حاصل کرسکوں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا سکوں۔ یہ فیصلہ میرے لئے طمانیت کا موجب ہوا لیکن جب میں نے اس سلسلے میں معلومات بہم پہنچائیں تو پتہ چلا کہ اور بھی بعض حضرات اس موضوع پر کام کر چکے ہیں جن میں ڈاکٹر سید عبدالحمید شطاری صاحب نے ۱۹۱۴ء تک لکھی جانے والی تفاسیر پر کام کیا ہے۔ حالانکہ زیادہ وقیع کام اس کے بعد ہوا ہے۔ اس بعد کے دور میں نہایت تفصیلی تفاسیر لکھی گئیں جس میں دوسری زبانوں بالخصوص عربی میں لکھی جانے والی بہت سی تفاسیر کے تراجم بھی اردو میں ہوئے ہیں۔ لہٰذا میرے لئے بہتر ہوگا کہ میں اپنے مقالہ کا موضوع بنیادی طور پر اسی دور کی تفاسیر کو بناؤں اور ربط و تسلسل قائم کرنے کے لئے اس سے پہلے کی تفاسیر کو بطور تمہید کام میں لاؤں۔

جب مجھے اس معاملہ میں انشراحِ قلب حاصل ہوگیا تو میں نے استادِ محترم جناب ڈاکٹر ابواللیث صاحب سے جن کی رہبری اور رہنمائی میں مجھے کام کرنا تھا اس کا ذکر کیا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب نے میرے انتخاب کو سراہا اور مجھے اردو زبان میں لکھی جانے والی چودھویں صدی ہجری کی تفاسیر کا جائزہ لینے کی اجازت دے دی۔ یہی نہیں بلکہ مقالہ کا عنوان بھی مقرر کر دیا " اردو میں تفسیری ادب۔ ایک تاریخی اور تجزیاتی جائزہ "۔ بعد میں کراچی یونیورسٹی نے بھی منظوری دے دی اور میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔

پہلا کام یہ تھا کہ مجوزہ مقالہ کا خاکہ تیار کیا گیا جو حسب ذیل پانچ ابواب و مباحث پر مشتمل ہے۔

باب اوّل: تمہید۔

تفسیری ادب کا تاریخی پس منظر۔ عربی اور فارسی میں تفسیری ادب کا مختصر جائزہ۔

باب دوم:۔

برصغیر پاک و ہند میں اردو کے ابتدائی دور میں تبلیغ اور تعلیم دین کے سلسلہ میں صوفیاء اور علماء کا کردار۔ ابتدائی دور کے ملفوظات، منظومات اور تفسیر کے نمونے دکن کا دینی سرمایہ ہیں۔

باب سوم:۔

قرآن کے اردو تراجم اور ان کے حواشی ــــــ شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے دورِ حاضر تک حواشی کا جائزہ۔

باب چہارم:۔

اردو کی مشہور تفاسیر۔ تاریخی جائزہ اور تجزیہ۔ فارسی تفاسیر مثلاً تفسیر بیضاوی، تفسیر حسینی، تفسیر کبیر وغیرہ کے اردو تراجم۔

باب پنجم:۔

اردو میں تفسیر نگاری کے مختلف مکاتبِ فکر اور ان کے اسلوب و منہاج کا جائزہ۔

ان پانچوں مباحث کے لئے بے شمار کتابوں کی ضرورت تھی۔ کتابوں کی فہرست تیار کی گئی تو ان کی کثیر تعداد کو دیکھ کر مجھے اپنی کم سوادی اور کام کی دشواری کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ لیکن چونکہ کلام اللہ کی تفسیر کا معاملہ تھا اس لئے یقیناً ہر مرحلہ پر نصرت خدا شامل حال ہی

اور آسانیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ بہت سے کرم فرماؤں کے تعاون سے
کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ان حضرات نے مجھے اپنے ذاتی
ذخائر کتب اور اپنے زیر نگرانی کتب خانوں سے استفادہ کا پورا
پورا موقع دیا اور اس معاملہ میں میری ہر طرح مدد کی۔ میں کھلے دل سے
اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ اگر ان حضرات کا تعاون نصیب نہ
ہوتا تو میرے لئے اس راہِ دشوار کو طے کرنا مشکل ہو جاتا۔ لہٰذا
ان کی کرم فرمائیوں کے لئے مجھ پر ان کی خدمت میں ہدیۂ شکر و
امتنان پیش کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ کتابیات پر نظر ڈالنے سے
پتہ چلا اور میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ دیگر دینی علوم کی طرح تفسیر
کے موضوع پر بھی جتنا کام اردو زبان میں ہوا ہے اتنا عربی کے
علاوہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوا۔ چودھویں صدی ہجری
اور بیسویں صدی عیسوی میں جو کام ہوا ہے وہ کمیت اور کیفیت
دونوں اعتبار سے پچھلی تمام صدیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ
وقیع ہے۔ لیکن کلام اللہ کی وسعتوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے ۔

ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

ظاہر ہے اس ہستی کے کلام کی تفسیر کا حق کما حقہٗ کون ادا کر سکتا ہے
جس کے اس چیلنج کا بھی ابھی تک کسی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا
"اگر تم سے ہو سکے تو اس جیسی ایک ہی آیت بنا کر لے آؤ"

انسان کے اس عجز کے باوجود ہمارے مفسرین نے اپنی
بساط کے مطابق اس سلسلہ میں اپنے اپنے انداز میں گراں قدر
کام انجام دیا ہے۔ جس میں ان کے حسنِ نیت کے جلوے صاف
دکھائی دیتے ہیں۔ قرآن جیسے بلیغ کلام کی تفسیر میں اختلاف کا ہونا

تو ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن اگر یہ کام خلوص اور للہیت سے کیا گیا ہے تو وہ لوگ دین و دنیا میں اجر کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ ان حضرات نے اللہ کے کلام کا فیض آئندہ نسلوں کی جانب منتقل کرنے میں اس مقدس ذات کا اتباع کیا ہے جس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

بَعَثَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

میں نے اس کام کے لئے جس کی انجام دہی کی مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے سب سے زیادہ ممنون و متشکر استادِ محترم ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا ہوں جنہوں نے نہایت شفقت بزرگانہ سے کام کے ضروری رہبری و رہنمائی فرمائی۔ مجھے پوری طرح احساس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی مشغولیتیں اتنی زیادہ ہیں کہ میرے کام کے لئے وقت نکالنا ان کیلئے تقریباً ناممکن تھا۔ دوسرے ان کی صحت جسمانی بھی خاصی کمزور ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں مجھ ناچیز کے کام پر اتنی توجہ مبذول کرنا اور نہایت خوش دلی سے اس میں صائب مشورے دینا اور کوتاہیوں کی اصلاح کرنا ان کی بزرگانہ شفقت اور کرم بے نہایت کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ان نوازشوں کے مقابلے میں مجھے شکریہ کا لفظ ہلکا اور قطعاً ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ میں بارگاہ رب العزت میں ان کی صحت و سلامتی اور درازیٔ عمر اور جزائے خیر کے لئے صمیم قلب سے دعا کرتا ہوں۔

آخر میں اللہ ربّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی بارگاہ میں شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس نیک کام کرنے کی توفیق ارزانی فرمائی اور اس کو تکمیل کی منزل تک پہنچانے کی سعادت عطا کی۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

احقر العباد

محمد نسیم عثمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا لیکن زبان کی ترقی میں مذہب کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہی ہے کہ عربی جو عرب ممالک تک محدود تھی اسلام کی دعوت اور نعمت کے ساتھ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئی اور اسی بنا پر جن کی مادری زبان نہیں تھی ان کی تعلیم و تدریس اور تبلیغ کے لیے اس کی ضرورت پڑی تو صرف و نحو کی تدوین وجود میں آئی، لغت کی ضرورت ہوئی اور جن ملکوں کی اپنی اپنی زبانیں اور بولیاں تھیں وہاں بھی عربی کا دور دورا ایسا ہوا کہ عرف عام میں عربی کے عالم کو ہی عالم سمجھا جاتا اور بکثرت علوم کی کتابیں ان ملکوں میں عربی میں لکھی گئیں۔ اور آج بھی دنیائے اسلام میں عربی کی بڑی اہمیت اور حیثیت ہے۔ اور خدا وہ دن جلد لائے کہ جملہ ممالک اسلامیہ کی اپنی ایک وفاق اور سلطنت ہو تو عربی کی اہمیت اور بڑھ جائے گی اور اس اتحاد و اتفاق کی نشانی عربی ہو گی۔

بات صرف عربی تک محدود نہیں سنسکرت ہندوؤں کے مقدس ویدوں کی زبان ہے اور روایت یہ ہے کہ سنسکرت کی موجود قواعد کی کتابوں میں پانی کی قواعد قدیم ترین ہے جو ٹکسلا (حالیہ پاکستان) میں لکھی گئی۔ مقصد یہی تھا کہ وید جو برہمنوں کے طبقہ میں ایک نسل سے دوسری نسل تک صرف زبانی منتقل ہونے کے باعث اس کی عبادت اور

قواعد میں فرق آ گیا تھا۔ دورِ جدید میں بھارت اور پاکستان کے قیام
کے بعد ہندوستان نے اپنی سرکاری زبان کو اپنے قدیم مذہب اور
کلچر کا رنگ دینے اور پکا کرنے کے لیے اس میں سنسکرت کے متروک
اور مردہ الفاظ داخل کرنا شروع کر دیئے۔ اسی طرح لاطینی کو اور پھر
انگریزی کو عیسائی مذہب کی تبلیغ کا سہارا نصیب ہوا۔ اسی کی ایک
مثال خود اردو کی سلسلے میں ملتی ہے، جہاں ایک طرف اردو کے ابتدائی
دور میں ہمارے علماء، صوفیائے کرام اور مبلغین نے جن کی اپنی
زبانیں فارسی، عربی، ترکی تھیں، اردو کو جسے اس دور میں ہندوی
اور ہندی کے نام سے پکارتے تھے .... کیا اور ذریعہ تبلیغ
و تعلیم و تدریس بنایا۔ حالانکہ اس دور میں علماء کی تصانیف و تالیفات
عربی یا فارسی میں زیادہ تھیں اور فارسی تو تہذیبی زبان تھی لیکن عوام
کی تالیف قلوب کے لیے ان سے ان کی زبانوں میں ہم کلام ہو کر تبلیغ کا فریضہ
خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ جبکہ سلاطین اور امراء اپنی سیاسی مصلحتوں
کی بنا پر تبلیغ کی طرف سے غافل رہے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جس ملک پر
انھوں نے آٹھ سو سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی وہاں وہ اقلیت
میں رہے اور خود دارالخلافہ دہلی میں ان کی آبادی سولہ اور بیس فیصدی
سے زیادہ نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کی سلطنت کمزور ہوئی تو پہلے تو فارسی کو
جو ہندوستان سے لے کر ایران، افغانستان، وسط ایشیا اور ترکی
تک کے مسلمانوں کا ایک مشترکہ ورثہ تھا۔ انہی کوششوں سے اس کی تعلیم کو
ایسا صدمہ پہنچایا کہ جو عالم تھے وہ ایک دن میں جاہل ٹھہرے اور انگریزی
مدرسوں کے نیم خواندہ تعلیم و تدریس کے لیے مقرر ہوئے لیکن انگریزی
اس ملک کی زبان کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ اور اگرچہ ایک

دور میں سلطنت برطانیہ کے اقبال کا آفتاب چوبیس گھنٹے میں کبھی غروب
نہیں ہوتا تھا۔ ان کو عوام سے رابطہ کے لیے پھر ان کی زبانوں کا سہارا لینا
پڑا اور مشنریوں نے خود اردو سیکھی اردو کی قواعد نویسی کی طرف متوجہ
ہوئے۔ اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیے بھی وہی زبان اختیار کی جو سب سے
زیادہ بولی اور سمجھی جاتی تھی اور جسے وہ عجیب عجیب ناموں سے یاد کرتے
تھے۔ کوئی اسے فارسی کی ایک شاخ بتاتا، کوئی مورس (MOORS) یعنی
مسلمانوں کی زبان کہتا۔ یہ خطاب انھوں نے ہسپانیہ کے مسلمانوں کو دیا
تھا۔ بعض اسے ہندوستانی کہتے بعض ہندوی، بعض مسلمانی لیکن استعمال
سب وہی کرتے جسے ہم آج اردو کہتے ہیں۔

اس طویل مدت میں "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا
کام" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو
میں دینی یعنی اسلامی لٹریچر روزِ اول سے ہی تخلیق ہو رہا تھا۔ پہلے پہل تصوف
اور روزمرہ زندگی کے مختلف مسائل پر نظم اور نثر میں تصنیف و تالیف اور ترجمہ
کا کام شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اردو میں مذہبی لٹریچر کا ایک بہت بڑا
ذخیرہ جمع ہو گیا۔ مولوی عبد الحق کی نگرانی میں اردو میں مذہبی لٹریچر کے
حوالوں کی ایک جلد مرتب کرائی تھی جو شائع ہو چکی ہے اور اس میں بھی بہت کچھ
اضافے کی گنجائش ہے۔

اس کے بعد وہ دور آیا جس میں اسلامی لٹریچر کو اردو میں فروغ
دینے کی کوشش شروع ہوئی۔ قرآن حکیم کا ترجمہ پہلے فارسی میں، پھر اردو
میں ہوا تاکہ عوام جو عربی سے واقف نہ ہوں اس کے مطالب سے آگاہ ہو سکیں۔
اسی طرح اسلامی علوم عقلی و نقلی، حدیث، فقہ، اسماء الرجال، صرف و نحو
قواعد، تاریخ وغیرہ کے موضوعات پر اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے کہ بعض

حضرات کے بقول شاید ہی کسی دوسری زبان میں ہو۔ اس میں ہر علاقہ ہر مسلک، ہر مکتبِ فکر، اور نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی اعلیٰ درجے کی علمی و تحقیقی کتابیں، رسالے، مضامین اور مقالات شامل ہیں۔ تفسیری ادب بھی اس فہرست کا ایک اہم جزو ہے۔ اور یہی اس تحقیقی مقالے کا موضوع ہے۔

ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی مرحوم نے میرے مشورے پر اس موضوع پر تحقیقی کام شروع کیا اور اسے ایک نظم و ضبط کے ساتھ مکمل کرنے کے لیے بطور عنوان و موضوع مقالہ برائے پی ایچ ڈی جامعہ کراچی سے منسلک ہوئے۔ عثمانی صاحب مرحوم کے تہذیبی اور خاندانی پس منظر سے میں کسی قدر واقف تھا۔ انھوں نے علامہ شبیر عثمانی کے نام پر پہلے ہی ایک اکیڈمی اور اس سے منسلک ایک اسکول قائم کیا تھا۔ وہ خود ایک طویل مدت تک بطور علوم اسلامی کے استاد کے وفاقی گورنمنٹ اردو آرٹس کالج کے شعبۂ علوم اسلامی سے وابستہ رہے۔ اور اس کے صدر تھے۔ وفات سے صرف چند ماہ قبل ان کا تبادلہ اردو سائنس کالج میں اسی حیثیت سے ہوا۔ میں علوم دینی میں اپنی کم علمی سے واقف ہوں لیکن میں نے مقالے کی نگرانی صرف نسیم عثمانی مرحوم کے علم اور ان کے اصرار پر قبول کی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ انھوں نے تحقیق، تجزیہ، تبصرہ میں پوری محنت کی اور ایک ایسا مقالہ پیش کیا جو اس موضوع پر اہم تصانیف میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اور اس پر وہ قابلِ مبارک باد ہیں۔

تفسیر اور دیگر علوم میں ایک مشکل یہ ہے کہ ہمارے علماء مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے نظریات اسی مکتبِ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں اور اسے اپنا مسلک قرار دیتے ہیں۔ دین کے معاملے میں

تدبر اور غور کی تاکید خود قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس تدبر سے اکثر مختلف نتائج بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس سے اسلام کے بنیادی ایمان، عقائد اور سماجی اساس پر کوئی غلط اثر مرتب نہ ہو۔ ہمارے یہاں بعض مسالک میں اختلاف نے بہی شدت اختیار کرلیا ہے۔ حدیث کے انکار تک بھی جس سے بہت سے علماء کو اختلاف تھا۔ اور ہے۔ دیوبندی اور بریلوی مکتب فکر اور اہلسنت والجماعت حضرات کی شدت بھی ہم سب جانتے ہیں۔ تفسیری ادب کے جائزہ میں بھی یہ مسئلہ تھا کیونکہ تسلیم عثمانی صاحب کا واسطہ اور تعلق دیوبندی مکتب فکر سے تھا۔ اور بعض تفسیر نگاروں کا بریلوی سے۔ لیکن عثمانی صاحب نے دیانت داری کے ساتھ تجزیہ اور تبصرہ کیا ہے۔ ان کے ایک ممتحن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب تھے جو خود اردو کے پروفیسر (محقق اور نقاد) یونیورسٹی کے صدر شعبہ سے قطع نظر ایک عالم دین کی حیثیت سے ایک غیر متنازعہ شخصیت ہیں۔ غلام مصطفیٰ خان صاحب اس زبانی امتحان کی مجلس کے بھی ایک رکن تھے جو اس مقالہ پر ممتحن حضرات کی رائے کے پیش نظر مقالہ پر ڈگری دینے کے لیے فیصلہ کرنے کے لیے منعقد ہوئی۔ اپنی رپورٹ میں اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے۔

"مقالہ نگار نے اپنے مسلک کو نہیں چھوڑا ہے اور دوسروں
کے مسلک کو نہیں چھیڑا ہے۔"

میں سمجھتا ہوں اس سے بہتر تبصرہ اس مقالہ پر اور کیا ہو سکتا ہے۔ مرحوم عثمانی صاحب کو اس مقالہ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ ان کا ارادہ اس سلسلہ کے بعض اور موضوعات پر کام کرنے کا تھا۔ افسوس کہ ان کی اچانک موت نے اسے ایک خواب ہی رہنے دیا۔

انسان کی جملہ صفات میں اس کی "انسانیت" سے بڑھ کر اور کوئی صفت
نہیں ہو سکتی۔ میں ذاتی واقفیت اور تجربہ کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ ان میں
اعلیٰ درجے کی انسانی صفات موجود تھیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ایک
کمزور شخصیت تھے، وہ زندگی کی تلخیوں سے آشنا تھے۔ اور ان کا مقابلہ کرنے
کی ہمت اور صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ ان کی وفات سے میں ذاتی طور پر بھی
ایک اچھے شاگرد، ایک مخلص دوست اور عزیز سے محروم ہو گیا۔ اگرچہ وہ
دل کے مریض تھے مگر انتقال سے چند روز پہلے ہی وہ مجھ سے ملنے آئے اس وقت
گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلد رخصت ہو جائیں گے۔ مرحوم مولانا [illegible]
اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے اور جنت الفردوس عطا کرے۔

ابواللیث صدیقی

کراچی
۱۲ جولائی ۱۹۹۳ء

حرفِ چند

"اردو میں تفسیری ادب" ڈاکٹر سالم قدوائی صاحب کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر انھیں جامعہ کراچی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی ہے۔ یہ مقالہ نہایت محنت اور قابلیت سے لکھا گیا ہے۔ اس کی کئی خوبیاں ہیں جن پر نظر رکھی گئی ہے۔

۱۔ یہ ایک جامع مقالہ ہے اور موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔

۲۔ یہ مقالہ وقت کے اعلیٰ تحقیقی معیار پر پورا اترتا ہے۔

۳۔ مقالے کے تمام مطالب و مباحث کی تالیف و تدوین سائنٹفک انداز میں کی گئی ہے۔

۴۔ کسی بحث کو مقالے میں جس حد تک مختصر یا طویل ہونا چاہیے تھا اس کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ گویا کہ یہ مقالہ تالیف مطالب اور مباحث میں حسنِ توازن کی بہترین مثال ہے۔

۵۔ اس مقالے کی ایک بڑی خوبی مختلف تراجم، حواشی اور تفاسیر کے بارے میں حسنِ اعتدال ہے۔

۶۔ تفاسیر کے جائزے سے قبل تراجم قرآن مجید اور ایسے مختصر حواشی پر جن کی تفصیل تفسیر کے درجے کو نہیں پہنچتی نہایت عمدگی کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے اور نقد و جرح کی تلافی کی گئی ہے۔

۷۔ اس کے باوجود کہ فاضل محقق دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے دوسرے مکاتبِ فکر مثلاً بریلوی، اہلِ حدیث اور دیگر مذاہب و فرق مثلاً شیعہ، قادیانی، جماعت اسلامی وغیرہ کے تراجم و تفاسیر پر بھی خالص علمی نظر فراخدلانہ انداز میں بحث کی ہے اور ان خصائص کے بیان میں

کسی تعصب سے کام نہیں لیا۔

۸۔ مقالہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کا علمی و تحقیقی معیار، جامعیت و حسنِ تالیف و تدوین پی ایچ ڈی کے عام مقالوں سے بہت مختلف اور نہایت بلند ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مقالہ کسی ریسرچ اسکالر نے محض ڈگری کے حصول کے لیے نہیں لکھا بلکہ موضوع کی علمی اہمیت کے پیشِ نظر خاص علمی ذوق سے تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق کسی اکادمی، ادارۃ المصنفین یا ندوۃ المصنفین کی عظیم الشان لائبریری میں برسہا برس کی محنت شاقہ، نہایت جان سوزی اور بہت جگر کاوی سے لکھا گیا ہے۔

۹۔ یہ مقالہ اردو کے مذہبی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

۱۰۔ اس مقالے میں ان بہت سی خوبیوں کے جمع ہو جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس مقالے کی تحقیق اور تالیف و تدوین میں وقت کے مایہ ناز عظیم محقق اور استاذ الاساتذہ حضرت مخدومی ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مدظلہ کی رہنمائی حاصل رہی تھی۔ حضرت مخدومی کے ذوقِ علم و تحقیق اور خصوصی توجہ نے اسے تحقیق کا شاہکار بنانے میں بہت مدد دی۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس موضوع کے انتخاب میں بھی حضرت مخدومی ڈاکٹر صاحب مدظلہ کے مشورے کو دخل تھا۔

۱۱۔ اس تحقیق پر میں ڈاکٹر انیس عثمانی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

۱۲۔ میں یہ مشورہ دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ

الف:- اشاعت سے قبل اس پر نظرِ ثانی کر لی جائے تاکہ کاتب کی غلطیاں اور سہوِ قلم درست ہو جائیں۔

ب:- نیز یہ کہ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن کے بارے میں ماہنامہ بینات کراچی، ماہنامہ البلاغ کراچی، ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور میں شائع ہونے والے مقالات اور دیوبند سے شائع ہونے والی کتاب تفہیم القرآن کا

تحقیقی و تنقیدی جائزہ، از مولانا خلیل الرحمٰن چترالی [illegible] پر ایک نظر ڈالی جائے تو مجھے امید ہے کہ ان میں بعض مفید اور نئے نکتے ضرور ملیں گے۔ تفہیم القرآن میں بعض فاحش اغلاط اور تعبیرات باطلہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وزارت اوقاف مملکت سعودی عربیہ نے اسے چھاپنا شروع کیا تھا لیکن جب اس کے اغلاط علم میں لائے گئے تو اس کی اشاعت موقوف کر دی گئی اور ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن مع تفسیر عثمانی شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو اب تک کئی لاکھ کی تعداد میں شائع کیا جا چکا ہے۔

ج :- اسی طرح مولوی محمد علی لاہوری (قادیانی) کے ترجمے کے بارے میں بحث پر نظر ثانی ضرور کر لی جائے۔

یہ رائے میں نے ڈاکٹر عثمانی صاحب کو ان کی زندگی میں لکھی تھی اور انہیں دکھا دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس رائے میں بعض مباحث کے بارے میں چند اشکالات کا اضافہ کروں گا۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات ان کے انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ یا دس دن قبل ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں اور یہ مقالہ مرحوم کی یادگار کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ بحث و تنقید کا کوئی دروازہ کھولا جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی اس خدمت علمی و دینی کو قبول فرمائے، ان کے مراتب کو بلند فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

ابو سلمان شاہجہان پوری

تفسیری ادب کا تاریخی پس منظر

لغتاً "تفسیر" کا مادہ ہے فَسْر (ف۔س۔ر) جس کا مفہوم ہے واضح کرنا یا ظاہر کرنا۔ چنانچہ "فسر المغطی" کے معنی ہوئے "ڈھکے ہوئے کو کھول دینا"۔ اسی سے "التفسیر" کے معنی ہوئے "تاویل، کشف، وضاحت، بیان، شرح"۔[1] تفسیر کی جمع تفاسیر ہے۔

اصطلاحاً "تفسیر" سے مراد کسی تحریر کے مطالب کو سامعین کے لئے قریب الفہم کر دینا ہے۔[2] ظاہر ہے کہ اگر کوئی بات مجملاً یا مختصراً بیان کی جائے، تشبیہات و استعارات کو کام میں لایا جائے، تلمیحات اور تاریخی واقعات کو استعمال کیا جائے، بیان و بلاغت کے اصولوں کو برتا جائے تو اس کا سمجھنا ہر شخص کے لئے آسان نہیں ہوگا۔ لہٰذا کسی بات کو سب کے لئے قابلِ فہم بنانے کی غرض سے اس کی مختلف انداز سے توضیح و تشریح کرنی پڑے گی، اس کے ہر پہلو کو واضح طور پر بیان کیا جائے گا۔ اگر بات مختصر طور پر بیان کی گئی ہے تو اس کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔ مجاز اور تشبیہات و استعارات کو کام میں لایا گیا ہے تو اس کے حقیقی معنی بیان کر کے بات کہنے والے کے مافی الضمیر

---

[1] مصباح اللغات صفحہ ۶۳۱، مرتبہ ابو الفضل عبد الحفیظ بلیاوی، مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی، مطبوعہ عبد الحق پریس دہلی، اکتوبر ۱۹۵۸ء۔

[2] تاریخ التفسیر ___ از مولانا عبد الصمد صارم الازہری، صفحہ ۷، مکتبہ معین الادب اردو بازار لاہور، مطبوعہ سلطانی پریس لاہور ۱۹۶۹ء

کو پورے طور پر واضح کیا جائے گا۔ تاکہ بات میں کوئی ابہام یا الجھاؤ باقی نہ رہ جائے۔ اگر تلمیحات کو برتا گیا ہے یا تاریخی واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے تو ضروری ہوگا کہ جن چیزوں کو بطور تلمیح استعمال کیا گیا ہے ان کو واضح طور پر بتا دیا جائے اور جن تاریخی واقعات کے صرف حوالے دیے گئے ہیں ان کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ جس بات کو بتانے کے لیے وہ تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس سے ان تاریخی واقعات کا تعلق واضح ہو جائے اور اس بات کی حقیقت و اہمیت کا بھی پوری طرح اندازہ ہو جائے۔

جہاں تک کہ بیان و بلاغت کا تعلق ہے یہ چیزیں کلام کا زیور ہوتی ہیں اور کلام میں حسن پیدا کرنے اور اثر پیدا کرنے کے لیے ان کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے لیکن ان سے وہی حضرات فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور محظوظ ہو سکتے ہیں جن کو قدرت نے اپنی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ عام سوجھ بوجھ کے انسانوں کے لیے تو یہ چیزیں بسا اوقات معمہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا ان کو سمجھانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان صنائع و بدائع کی سادہ الفاظ میں توضیح و تشریح کر دی جائے اور یہ بھی بتا دیا جائے کہ ان صنائع و بدائع کے استعمال سے کلام میں کیا کیا خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

غرض تشریح و تفسیر کسی بات کی بھی کی جائے وہ ہر شخص کے لیے مفید ہوتی ہے۔ عام انسانوں کو تو اس بات کو سمجھانے کے لیے اس کی ضرورت بھی ہے۔ خواص کے لیے بھی اس میں افادیت و تفہیم کا بہت کچھ عنصر ہوتا ہے۔

جب عام انسانوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کو دوسروں کے ذہن نشین کرانے کی غرض سے اس کی توضیح و تشریح کریں تو قرآن حکیم کے معاملہ میں جو اللہ کا کلام ہے اس کی کیسے ضرورت نہیں ہوگی۔

دنیا کے تمام ذہین فہیم اور سلیم الطبع انسان اس بات پر متفق ہیں کہ

قرآن مجید سے زیادہ جامع کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کا ایجاز حقیقی معنوں میں اعجاز ہے۔ ایک ایسی مختصر کتاب میں پورا نظام زندگی سمو دینا اور دنیوی اور اخروی زندگی کے تمام حقائق کو بیان کر دینا اسی ہستی کا کام ہو سکتا ہے جس کو ہم قادر مطلق کہتے ہیں ــــ اللہ کی اس کتاب میں کتنی طرح کے اسالیب ہیں۔ ایک سے ایک حسین و رنگین ــــ اس میں سادہ نثر اور نثر رنگین کے بھی اعلیٰ نمونے موجود ہیں، مسجع مقفیٰ عبارتیں بھی ہیں۔ لفظی اور معنوی خوبیاں بھی ہیں اور تشبیہات و استعارات بھی ہیں۔ تلمیحات اور تاریخی واقعات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ روزانہ زندگی کے واقعات بھی ہیں اور حیات اخروی کی کیفیات کا بھی ذکر ہے۔ روحانی اور نفسی بھی اور سائنسی حقائق بھی۔ غرض اس میں اتنی خوبیاں ہیں کہ کوئی انسان بھی ان کا احصا اور احاطہ نہیں کر سکتا۔ کسی شاعر کے اس مصرع کا صحیح مصداق یہی کتاب ہے ؎

دامانِ نظر تنگ و گل حسن تو بسیار

اتنی لامحدود خوبیوں سے مالامال تحریر کی توضیح و تشریح کرنا اور تفسیر بیان کرنا بھی کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے غیر محدود علم کی ضرورت ہے۔ اور وہ کسی انسان کو حاصل نہیں۔ تاہم اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے اور سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ جن لوگوں کو اس کی جتنی فہم ہے اس کے مطابق وہ دوسروں کو بھی آگاہی بخشیں۔ چنانچہ عہد رسالت سے یہ کام ہو رہا ہے اور جن لوگوں کو قدرت نے جتنی صلاحیت اور سمجھ دی ہے اس کے مطابق وہ عوام کو سمجھانے کے لیے اس کی وضاحت اور تشریح و تفسیر بیان کرتے رہے ہیں۔ چونکہ اس کے متعدد پہلو اور ان گنت گوشے ہیں اس لیے مفسرین نے اپنے ذوق اور میلان طبع کے بموجب مختلف انداز سے تفسیریں بیان کی ہیں۔ کسی نے زبان و بیان کے نکات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے تاریخی واقعات کی روشنی میں تشریح کی ہے اور کسی نے اوامر و نواہی اور مسائل شرعیہ کو بنیاد بنا کر

سمجھا گیا ہے۔ بعد میں جب بعض اور علوم و فنون بھی مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنے تو ان علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے والوں نے ان کو مرکز و محور بنا کر تمام مسائل کو ان کی نسبت سے جانچا ہے۔ مثلاً بعض حضرات نے علم کلام کو بنیاد بنایا ہے اور بعض نے تصوف کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنس کا دور ہے تو کچھ لوگوں نے اپنی تفسیر وں کا مدار سائنسی انکشافات و ایجادات کو بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تنگ دامنی میں بعض حضرات سے افراط و تفریط سے بھی کام لیا جس کی وجہ سے نزول قرآن کا اصل مقصد پس منظر میں چلا گیا اور لوگ غیر ضروری اور لایعنی بحثوں میں الجھ کر رہ گئے۔

اس بحث و تمحیص میں اکثر حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن کریم کتاب ہدایت ہے اور اس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ حق کے متلاشی انسان اس کو اسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں اور ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے اس سے ہدایت حاصل کر کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوں۔ یہی ہمارا وہ مطلوب و مقصود ہے جس کے لیے ہم دن میں کم از کم پانچ مرتبہ بارگاہ رب العزت میں نہایت عاجزی سے ان الفاظ میں دعا کرتے ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ اور اس کے جواب میں مستجاب الدعوات نے ہمیں یہ نوید سنائی ہے۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ البقرہ۔ ۱-۳۔

اس میں ہدایت کے لیے بنیادی باتیں یہ بتائی گئی ہیں۔ تقویٰ۔ ایمان بالغیب قیام صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ۔ جو کوئی بھی ان بنیادی باتوں کو اپنی زندگی کا محور بنالے گا اور ہر کام ان ہی کی روشنی میں کرے گا۔ وہ صراط مستقیم کو پالیگا

یہ نکات بتانے کے بعد فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نے پورے قرآن میں ان نکات کی وضاحت کر دی ہے اور ہمارے لیے زندگی کا پورا لائحہ عمل مرتب کر دیا ہے۔ اس ضمن میں انبیاء کی داستانیں اور تاریخی واقعات بیان کرکے یہ بتا دیا ہے کہ جن لوگوں نے اس لائحہ عمل کو اپنایا وہی اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کے صحیح مصداق تھے۔ وہی اولیاء اللہ کہے جاتے ہیں اور ان ہی کی جماعت کو حزب اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے اللہ کے بتائے ہوئے اس لائحہ عمل سے روگردانی اختیار کی وہ "مَغْضُوْبِ" اور "ضَالِّیْن" کے زمرہ میں شامل ہیں۔ ان ہی کو "اولیاء الشیطان" کہا گیا ہے اور ان کی جماعت "حزب الشیطان" ہے۔

یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے عظیم ترین ہستی کی یہ عظیم ترین کتاب انسان پر نازل کی گئی۔ لہٰذا بہترین توضیح و تشریح اور تفسیر وہ ہوگی جو اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی جائے اور دیگر مباحث کو ضمنی حیثیت حاصل ہو۔

چونکہ قرآن کریم کے مخاطب اول عرب تھے اس لیے اس کو عربی زبان میں نازل کیا گیا اور قدرتی طور پر اس کی تفسیریں بھی سب سے پہلے عربی زبان ہی میں لکھی گئیں۔ پھر چونکہ مہبط وحی ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تھی اس لیے قرآن کریم کی سب سے پہلی تفسیر بھی آپ ہی کی زبان مبارک سے ہوئی۔ اس مقصد کے لیے آپ نے جو کچھ بیان فرمایا وہ احادیث صحیحہ کے مجموعہ کی شکل میں آج بھی موجود ہے جیسا کہ قرآن کریم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى ۝ یعنی (امور دین میں) آپ اپنی مرضی اور خواہش سے کچھ نہیں بولتے جو کچھ فرماتے ہیں وہ وحی کے ذریعہ آپ کو بتایا جاتا ہے۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم کا متن اور اس کی جو تفسیر آپ ؐ نے بیان
فرمائی دونوں پر وحی کا اطلاق ہوتا ہے۔ دونوں میں امتیاز کرنے کے لیے قرآن
کریم کے متن کو "وحی متلو" اور احادیث کی شکل میں جو تفسیر آپ ؐ نے بیان
فرمائی اس کو "وحی غیر متلو" کہا جاتا ہے۔

گلدستۂ حدیث کا یہ بیان حقیقت کا ترجمان ہے کہ؛
خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال افعال اور تقریر
(سکوت) کو حدیث کہتے ہیں۔ حدیث قرآن کریم کی تفسیر ہے جس کے بغیر قرآن
کی تفہیم ناممکن ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

(النحل ع ۶) ۔ ۴۴ ۔ ۱۴

(ترجمہ) اور آپ پر بھی ہم نے یہ یادداشت نازل کی کہ جو کچھ ان کی
طرف اتارا گیا ہے آپ ؐ اس کو کھول کر لوگوں سے بیان کر دیں۔

احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ارشادات ہیں جس سے قرآن
حکیم پڑھا، سنایا اور سکھایا گیا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے قرآن مجید
کو آپ ؐ کی زبان میں آسان کر دیا تاکہ آپ ؐ لوگوں کو عذاب الٰہی سے مجرمین اور
مومنوں کو خلد بریں کی بشارت دیں۔[1]

عہد رسالت کے بعد خلافت راشدہ کا دور شروع ہوا۔ اس دور میں
صحابہ کرام کی مقدس جماعت موجود تھی جس نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے اکتساب فیض کیا تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے

---

۱ ؎ گلدستۂ احادیث صفحہ ۱۰ از پروفیسر محمد اسلم عثمانی، شائع کردہ شعبۂ تصنیف و تالیف
ترجمہ و اشاعت گورنمنٹ اردو کالج، کراچی ۲۰۰۲ء

بموجب تبلیغ کے کام کو جاری رکھا اور جملہ صحابہ نے کسی نہ کسی حد تک قرآن کی تفسیر بھی بیان فرمائی۔ اس کام کو کسی قدر بڑے پیمانے پر دو صحابہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ نے انجام دیا اور صحابیات میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جاری رکھا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ نے اپنی بیان کردہ تفسیر کو تحریری شکل بھی دی۔ تفسیر ابن عباس کو تو آج بھی بطور حوالہ کثرت سے پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کی تفسیر کے بارے میں محمد ستّہ احادیث میں جیسا کہ التفسیر کے حوالے سے کہا گیا ہے۔

"حضرت ابی بن کعبؓ نے بطور تفسیر ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس مجموعے سے امام ابن جریر طبری نے کثرت سے اخذ کیا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد بن حنبل نے بھی اس میں سے لیا ہے۔"[1]

خلافت راشدہ کے بعد عہد بنی امیہ میں بھی تفسیریں لکھی گئیں لیکن یہ کام دوسرے علوم کی طرح زیادہ بڑے پیمانے پر نہیں ہوا۔ بعض خلفائے بنو امیہ نے جو علمی مذاق رکھتے تھے اپنے دور کے بعض علما و ائمہ سے جن میں سے اکثریت تابعین اور تبع تابعین کی تھی کچھ تفسیریں لکھوائیں۔ مثلاً خلیفہ عبد الملک بن مروان نے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اگر وہ خلافت کی ذمہ داری میں نہ پھنستا تو مدینہ کا سب سے بڑا فقیہ ہوتا، حضرت سعید بن جبیر تابعی سے قرآن کریم کی تفسیر لکھوائی تھی۔ یہ تفسیر شاہی کتب خانے میں محفوظ رہی۔ کچھ عرصہ بعد عطاء بن دینار کے ہاتھ لگ گئی اور ان ہی کے نام سے مشہور ہوئی۔[2]

تابعین میں تفسیریں لکھنے والوں میں امام حسن البصری، ہمام ابن منبہ،

۱۔ محمد ستّہ الاحادیث، الصفحات ۲۸-۲۹

۲۔ فہرست ابن الندیم نمبر ا، بحوالہ تاریخ التفسیر از محمد صادم الاذہری ص ۳۴۔

عکرمہ، قتادہ، ابن جریج اور سفیان ثوری کے نام نہایت اہم ہیں۔[1]
تابعین کی تحریر کردہ تفاسیر کا طرز یہ تھا کہ آیت اور اس کے تحت حدیث اور اقوال صحابہ و تابعین نقل کرتے تھے قصص اور علمی نکات پر زیادہ توجہ نہیں تھی۔[2]

اس کے بعد کے متصل دور میں علوم قرآن، تفسیر قرآن اور علوم تفسیر سے متعلق تصنیف کا کام جاری رہا اور ان موضوعات پر علاحدہ سے تحریراً کتابیں لکھی گئیں۔ اس دور سے تفسیر میں علمی نکات پر بھی بحث ہونے لگی۔[3] ابتدائی دور کی تفسیر قرآن کے موضوع سے متعلق جن کتابوں کے نام ابن الندیم نے الفہرست میں دئے وہ درج ذیل ہیں:[4]

(۱) کتاب ابی جعفر محمد بن علی بن الحسین۔ یہ کتاب باقر سے ابو الجارود زیاد بن منذر رئیس جارودیہ نے روایت کی۔

(۲) کتاب ابن عباس۔ اس کتاب کو مجاہد نے روایت کیا اور مجاہد سے حمید بن قیس نے روایت کیا۔ علاوہ ازیں ورقا نے ابو نجیح سے اور ابو نجیح نے مجاہد سے روایت کی۔

(۳) کتاب التفسیر لابن ثعلب۔ کتاب التفسیر ابی حمزۃ الثمالی۔ اس کا نام ثابت بن دینار اور کنیت دینار ابو صفیہ تھی۔ ابو حمزہ پیروان علی میں سے تھا۔ اس کا شمار نجبائے ثقات میں ہوتا تھا۔ اس نے ابو جعفر کی مصاحبت و رفاقت اختیار کر رکھی تھی۔

۱۔ تاریخ التفسیر ص ۱۱ ۲۔ ایضاً ص ۴۸ ۳۔ ایضاً ص ۴۸

۴۔ الفہرست، ابن الندیم صفحات ۳۳۔ ۳۴، الفہرست (اردو) مصنف محمد اسحاق ندیم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور، طبع اول جون ۱۹۶۹ء [illegible]

۴ کتاب تفسیر محمد بن علی بن حسین ۔ قرآن کے چند اجزاء پر مشتمل ہے۔

۵ کتاب التفسیر از زید بن اسلم بحوالہ عسکری۔

۶ کتاب تفسیر مالک بن انس۔

۷ کتاب تفسیر سدی

۸ کتاب تفسیر اسماعیل بن ابی زیاد۔

۹ کتاب تفسیر داؤد بن ابی ہند۔

---

۱ تہذیب التہذیب جلد ۳ کے حوالے سے الفہرست کے اردو ترجمہ میں ب ذیل درج کیا گیا ہے۔ جارودیہ ــــــ یہ ابو الجارود زیاد بن منذر ہمدانی یا ایک روایت کے مطابق نہدی الثقفی کوفی کا پیرو تھا۔ یہ شخص اس قسم کی حدیثیں وضع کرتا تھا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مخالفت اور ذم کا پہلو نکلتا ہو۔ یہ ۱۵۰ اور ۱۶۰ھ کے درمیانی عرصہ میں فوت ہوا۔

جارودیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ اسماً حضرت علیؓ کی امامت کی تصریح نہیں کی تاہم وصفاً کر دی تھی۔ لہٰذا آپ کے بعد مستحق امامت حضرت علیؓ ہی تھے۔ لوگ چونکہ وصف کو سمجھنے سے قاصر رہے اس لیے مطلوب کو نہ پا سکے اور اپنی مرضی سے ابو بکرؓ کو خلیفہ مقرر کر دیا۔

(الملل والنحل شہرستانی)

ابو الجارود کے بارے میں اس وضاحت کے بعد ہر شخص یہ آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کی تفسیر کس معیار کی ہو گی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس شخص نے جو کتاب حضرت محمد بن علی بن حسینؓ (یعنی امام محمد باقر) کے نام سے پیش کی ہے وہ واقعی ان کی لکھی ہوئی ہے یا اس نے خود لکھ کر اس کو معتبر بنانے کے لیے ان سے منسوب کر دیا۔ پھر یہ معاملہ تنہا ابو الجارود ہی کا نہیں بلکہ اس طویل فہرست میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی نظر آتی ہے۔

۱۰ كتاب تفسير ابی روق۔

۱۱ كتاب تفسير رشید بن داؤد۔

۱۲ كتاب تفسير سعید بن عیینہ۔

۱۳ كتاب تفسير نہشل بروایت ضحاک بن مزاحم۔

۱۴ كتاب تفسير عکرمہ ابن عباس۔

۱۵ كتاب تفسير الحسن بن ابی الحسن البصری

۱۶ كتاب تفسير ابی بکر الاصم ـــــ ان کا شمار متکلمین میں ہوتا ہے

۱۷ كتاب تفسير ابی کریمہ یحیی بن مہلب۔

۱۸ کتاب شیبان بن عبدالرحمن النحوی۔

۱۹ کتاب سعید بن بشیر از قتادہ۔

۲۰ کتاب التفسیر محمد بن ثور از معمر بن قتادہ۔

۲۱ کتاب تفسیر الکلبی محمد بن سائب۔

۲۲ کتاب تفسیر مقاتل بن سلیمان

۲۳ کتاب تفسیر المحتسب الدوری۔

۲۴ کتاب تفسیر الحسین بن واقد ـــ ان کی ایک تصنیف کتاب الناسخ والمنسوخ بھی ہے۔

۲۵ کتاب تفسیر مقاتل بن حیان۔

۲۶ کتاب تفسیر سعید بن جبیر۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۲۷ کتاب تفسیر وکیع بن الجراح۔

۲۸ کتاب تفسیر ابی رجاء محمد بن سیف۔

۲۹ کتاب تفسیر یوسف القطان۔

۳۰ کتاب تفسیر محمد بن ابی بکر المقدمی۔

۳۱ کتاب تفسیر ابی بکر بن ابی شیبہ۔
۳۲ کتاب تفسیر ہشیم بن البشیر۔
۳۳ کتاب تفسیر ابن ابی النعیم الفضیل بن دکین۔
۳۴ کتاب تفسیر ابی سعید الاشج۔
۳۵ کتاب تفسیر الآی التی نزل فی اقوام باعیانہم از ہشام کلبی۔
۳۶ کتاب ابوجعفر الطبری۔
۳۷ کتاب تفسیر ابن ابی داؤد السجستانی۔
۳۸ کتاب تفسیر بکر بن ابی الثلج۔
۳۹ کتاب ابی علی محمد بن عبدالوہاب الجبائی۔
۴۰ کتاب ابوالقاسم البلخی۔
۴۱ کتاب ابی مسلم محمد بن بحر الاصفہانی۔
۴۲ کتاب ابی بکر بن الاخشید (اختصار بھی)۔
۴۳ کتاب ابوجعفر الطبری۔
۴۴ کتاب المدخل الی التفسیر از ابن امام شفری۔
۴۵ کتاب التفسیر لابی بکر الاصم۔

تبع تابعین کا دور تقریباً دوسری صدی ہجری کے اختتام تک ختم ہو گیا۔ تیسری صدی کے آغاز سے ہر شعبۂ زندگی میں عجمیت کا غلبہ ہونا شروع ہوا۔ تفسیر قرآن پر بھی عجمیت کے اثرات پڑنے لگے۔ اس سلسلے میں بعض نئے فنون ایجاد ہوئے۔ جیسے علم اقراء و جمع، علم اسباب نزول، علم اختلاف،

مصاحف، علم ناسخ و منسوخ وغیرہ۔ اسی عہد سے اسرائیلیات اور تاریخی قصص کا بھی ذکر تفسیر میں آنے لگا۔ فتوحات کے ساتھ ساتھ عربوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی گئیں۔ عرب تو خود اہل زبان تھے اس لیے وہ عربی زبان کی خصوصیات اور باریکیوں کو کسی نہ کسی حد تک سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ فطرتاً بھی اختصار پسند تھے۔ لہٰذا وہ قرآن کی تفہیم کو چند لفظوں میں بلکہ بعض اوقات اشاروں میں سمجھ لیتے تھے لیکن دوسری قومیں جن پر عجمی کا اطلاق ہوتا ہے ان دونوں خوبیوں سے محروم تھیں۔ وہ نہ زبان کی باریکیوں کو سمجھتی تھیں اور نہ مختصر تشریح سے مطمئن ہوتی تھیں۔ لہٰذا ان کو سمجھانے کے لیے زیادہ وضاحت کی ضرورت تھی جس کی وجہ سے مفصل تفسیریں بیان کی گئیں۔

عجمیوں کو تفہیم قرآن کے سلسلے میں اس چیز کی ضرورت بھی پیش آئی کہ تفسیر سے پہلے ان کو ان کی اپنی زبان میں متن قرآن کا ترجمہ بھی سمجھایا جائے اس لیے کہ تمام عجمی عربی زبان نہیں جانتے تھے۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا ترجمہ کی ضرورت بڑھتی گئی۔ اور اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ترجمہ کے بغیر تفسیر کا سمجھنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ اسی لیے موجودہ زمانہ میں غیر عرب قوموں میں قرآن فہمی کے لیے ترجمہ اور تفسیر لازم و ملزوم سے ہوگئے ہیں اور اسی غرض سے ہر زبان میں قرآن کے متعدد ترجمے دکھائی دینے لگے ہیں۔

تفسیر قرآن کے سلسلے میں اسرائیلی قصے اور تاریخی واقعات کسی حد تک عہد صحابہ میں بھی بیان ہونے لگے تھے، کیونکہ بعض صحابہ جو دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے یہودی تھے، اپنے ذہنوں میں یہ داستانیں اور قصے لے کر آئے تھے۔ انھوں نے بڑی دیانت داری سے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں یہ قصے عربوں کے سامنے بیان کیے اور سادہ مزاج عربوں نے ان کو صحیح سمجھ کر قبول

کر لیا۔ اور بعض قصے تفسیر والا میں داخل ہو گئے۔ لیکن اس وقت یہ زیادہ نہیں بڑھنے پائی۔ بعد میں عجمیوں کے ہاتھوں یہ باتیں مبالغہ کے تمام حدود پار کرتی ہوئی اتنے آگے نکل گئیں کہ تفسیر کا اصل مقصد پس پشت جا پڑا اور یہی چیزیں اصل تفسیر سمجھی جانے لگیں۔ رفتہ رفتہ اسرائیلیات شانِ نزول ناسخ و منسوخ وغیرہ پر اتنا زور دیا جانے لگا کہ ان باتوں پر قدغن لگانے کے لیے تفسیر کے اصول وضع کرنے پڑے۔ اور اصولِ تفسیر کے نام سے ایک نیا علم معرض وجود میں آگیا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سی کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" اسی موضوع سے متعلق ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے ان امور پر جو تفسیر میں بڑی اہمیت اختیار کر گئے تھے، بحث کر کے ان کی حدیں مقرر کی ہیں۔ انھوں نے اسرائیلیات کو بیان کرنے سے منع کیا ہے۔ شانِ نزول پر بھی خاصی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ہر سورۃ اور آیت کا شانِ نزول تلاش کرنا فعل عبث ہے۔ قرآن حکیم کتاب ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے جس وقت جس حکم کی ضرورت سمجھی نازل فرمایا۔ کہیں کہیں یہ بھی ہوا کہ اس حکم سے ملتا جلتا کوئی واقعہ پیش آگیا جس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ حکم اس واقعہ کی وجہ سے نازل ہوا۔ ایسے بعض اتفاقی واقعات کو بنیاد بنا کر ایک کلیہ قائم کرنا اور ہر حکم کے لیے شانِ نزول تلاش کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

ناسخ و منسوخ کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۵۰۰ تک جا پہنچی تھی شاہ صاحب اس تعداد کو گھٹا کر پانچ تک لے آئے اور بتایا کہ وہ بھی دراصل تدریجی احکام تھے جو ــــــ ضعیف انسان کی فطری کمزوری کی وجہ سے اس کی ایک خصلت و عادت کو چھڑا کر دوسری عادت و خصلت پر لانے کے لیے نازل کیے گئے تھے۔ مثلاً نشے کی عادت کو چھڑانے کے لیے خمر کی حرمت کا حکم تین مرحلوں میں نازل ہوا۔

عربی تفاسیر کی جو فہرست محمد بن اسحاق ندیم کی کتاب "الفہرست" سے پیش کی گئی ہے وہ ۳۷۷ھ تک کی ہے۔ خود ابن الندیم کی صراحت کے بموجب مفسّرین میں مختلف مکاتبِ فکر کے لوگ شامل ہیں۔ اس لیے ان کی تفسیریں بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ ان میں ابن جریر طبری کی تفسیر سب سے زیادہ تفصیلی ہے۔ اس کو شہرت بھی بہت حاصل ہوئی۔

اس کے بعد بھی تفسیریں لکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور صرف عربی میں ہی اتنی تفسیریں لکھی گئیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ تاہم برصغیر سے باہر جن عربی تفاسیر کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) تفسیر طبری
(۲) کشاف
(۳) مفاتیح الغیب
(۴) تفسیر بیضاوی (انوار التنزیل و اسرار التاویل)
(۵) تفسیر محی الدین ابن عربی۔
(۶) تفسیر ابن کثیر
(۷) تفسیر جلالین

(۱) تفسیر ابن جریر طبری کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ابن الندیم کی رائے ہیں:

"اس سے بہتر کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی۔ ایک گروہ نے اس کا اختصار کر لیا ہے جن میں ابوبکر بن اخشید وغیرہ شامل ہیں۔"[۱]

۱۔ الفہرست ص ۹۴۵

لیکن ابن الندیم کی اس رائے سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کے زمانہ تک اس کتاب کو یہی حیثیت رہی ہو لیکن بعد کے ایک ہزار سالہ دور کے لیے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ طبری کی تاریخ کو بھی "ام التواریخ" کا درجہ دیا گیا تھا، مگر اب اس کو ایک دعویٰ بے دلیل سمجھا جاتا ہے۔ یہی بات تفسیر طبری کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

(۲) کشاف یا تفسیر کشاف: اس کے مصنف علامہ ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری خوارزمی (۵۳۸ھ / ۱۱۴۴ء) ہیں۔ وہ معتزلی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے کلامی بحثیں زیادہ کی ہیں اور بہت کچھ فرقہ معتزلہ کے عقیدہ کے مطابق تفسیر بیان کی ہے۔ مولانا عبد الصمد صارم الازہری لکھتے ہیں:

"اس تفسیر میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن بعض نقائص بہت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ جو آیت عقیدہ اعتزال کے خلاف ہے مفسر نے کلام طویل اور تاویلات رکیک سے اس کو اعتزال کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے یہ کہ مفسر نے اولیاء اللہ پر طعن کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اہل سنت کو سخت سست کہا ہے"[1]

(۳) مفاتیح الغیب ــــ یہ امام فخر الدین رازی کی تفسیر ہے اور تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے۔ امام صاحب اس کو اپنی زندگی میں مکمل نہیں کر سکے تھے۔ وہ سورۃ انبیاء تک دس جلدوں میں تفسیر لکھ پائے تھے کہ (۶۰۶ھ / ۱۲۱۰ء) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ شیخ نجم الدین احمد بن محمد القمولی (۷۲۷ھ / ۱۳۲۷ء) نے اس کی تکمیل کی۔

---

[1] تاریخ التفسیر ص ۶۳

مولانا عبدالصمد صارم صاحب اس تفسیر کے متعلق ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

"اس میں ۔۔۔۔۔۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کی بحثیں ہیں۔ عجیب و غریب مفید تفسیر ہے"[1]

لیکن نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی نے اس پر بڑی سخت تنقید کی ہے اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

"یہ تفسیر کے سوا سب کچھ ہے"

اس ریمارک پر مولانا عبدالصمد صارم صاحب نواب صدیق حسن صاحب کی بات کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ تفسیر جس زمانہ میں تصنیف ہوئی اگر تصنیف نہ ہوئی ہوتی تو ہزاروں مسلمان اسلام کو چھوڑ چکے ہوتے"[2]

(۳) تفسیر بیضاوی:۔ اس تفسیر کا اصل نام انوار التنزیل و اسرار التاویل ہے۔ اس کے مصنف قاضی ابو سعید ناصر الدین علی بن عمر بیضاوی ہیں۔ لیکن مصنف کے نام سے زیادہ اس تفسیر کی شہرت ہے۔ قاضی بیضاوی شافعی المذہب تھے۔ وہ ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء میں فوت ہوئے۔ ان کی تفسیر کے بارے میں عبدالصمد صارم رقم طراز ہیں۔

"یہ نہایت عمدہ اور معتبر تفسیر ہے۔ مگر اس میں فضائل سورہ میں بعض احادیث ضعیف و موضوع بھی لائے ہیں۔ علما و فضلا نے کثرت سے اس تفسیر پر تعلیقات اور حواشی لکھے ہیں بعض نے تلخیص کی ہے"[3]

---

[1] تاریخ التفسیر ص ۱۱۲

[2] ایضا ص ۴۴

[3] تاریخ التفسیر ص ۷۰۔۱۰۷

(۵) شیخ محی الدین ابن عربی کے دو تفسیریں ہیں (۱) تفسیر کلاں جو چھ جلدوں میں ہے مگر صرف سورہ کہف تک اور (۲) تفسیر خورد دو جلدوں میں اور مکمل ہے۔ شیخ اکبر تصوف اور وحدۃ الوجود کے بہت بڑے داعی تھے اس لیے ان کی تفسیریں اسی رنگ میں ہیں۔ بعض باتیں جو شرعی نقطۂ نظر سے کھٹکتی ہیں شیخ عبدالوہاب شعرانی کے نزدیک بعد میں شریر لوگوں نے اپنی طرف سے شامل کر کے شیخ اکبر کے نام سے منسوب کر دی ہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی کا یہ خیال درست بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ اکابر کی تصانیف میں تحریف کا عمل بہت بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔

(۶) تفسیر ابن کثیر — یہ تفسیر بھی بے حد مشہور و مقبول ہے۔ اس میں زبان و بیان کے نکات زیادہ بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا عبدالصمد صارم الازہری فرماتے ہیں۔

"حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ / ۱۳۷۲ء) کی تفسیر صحیح اور معتبر ہے۔"[۱]

(۷) تفسیر جلالین — اس تفسیر کو جلال الدین نام کے دو علماء نے مکمل کیا، اس لیے اس کا نام تفسیر جلالین (دو جلال والی) پڑ گیا۔ اس کو شیخ جلال الدین محمد بن احمد محلی (متوفی ۸۶۴ھ / ۱۴۵۹ء) نے لکھنا شروع کیا تھا لیکن وہ اپنی بے وقت رحلت کی وجہ سے مکمل نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے بعد میں اس کو علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء) نے پورا کیا۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بے حد مختصر ہے۔ کہیں تو قرآن کے متن پر ہی دو چار لفظوں کا اضافہ کر کے مطلب کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کہیں کوئی مختصر سی عبارت بڑھا دی گئی ہے۔ لیکن اس اختصار

۱۔ تاریخ التفسیر ص ۱۰۷

گئے باوجود اس کو بے حد شہرت ہوئی اور یہ تفسیر درسی نظامی میں
بالاشتراک داخل رہی۔ طلبہ جو اپنی چھوٹی جماعتوں میں پڑھنا نہیں چاہتے اس تفسیر
کو پسند کرتے ہیں۔ اس تفسیر کے حروف سورہ مزمل تک قرآن مجید کے حروف
کے برابر ہیں۔

اس کے اختصار کی وجہ سے اس پر کثرت سے حواشی اور شرحیں لکھی
گئیں۔ حواشی میں قبس النیرین از شیخ شمس الدین محمد بن علقمی ———
جمالین از شیخ نور الدین ——— الفتوحات الالٰہیہ از شیخ سلیمان اور
زلالین قابل ذکر ہیں اور شروح میں زیادہ شہرت مجمع البحرین و مطلع البدرین
اور کمالین کو حاصل ہے۔

برصغیر میں عربی تفاسیر

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے سلسلے میں مورخین اور مصنفین مختلف الخیال
ہیں۔ بعض حضرات تو یہ تک کہتے ہیں کہ برصغیر میں اسلام عہد رسالت ہی
میں پہنچ گیا تھا۔ بعض صاحبان عہد فاروق اور بعض عہد عثمانی کو اس کا
نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر ان آراء کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی
یہ ماننا ممکن نہیں کہ اسی وقت سے یہاں سلطنت اسلامیہ کا قیام عمل میں
آگیا تھا یا علمی اور تمدنی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ وثوق سے جو بات
کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد سے ہی اس ظلمت کدہ
میں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ اسی وقت سے تبلیغ کا کام شروع ہوا اور
اس کے بعد سے علمی کاموں کا آغاز ہوا۔ لیکن اس زمانہ کے علمی کام اور
تحریری نمونے محفوظ نہیں رہے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس دوران
قرآن کریم کی کوئی تفسیر لکھی گئی یا نہیں۔

برصغیر میں اسلامی دور کی علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کا تفصیلی حال فتح دہلی کے بعد سے معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت ابھی چونکہ فرمانروا اور ان کے اثر سے عوام کا رجحان تصوف، اخلاقیات اور فقہ کی جانب زیادہ تھا، اس لیے تفسیر اور حدیث کی جانب بہت کم توجہ کی گئی۔ فتح دہلی سے تقریباً ڈھائی، تین صدی بعد تک تفسیر قرآن کا کوئی قابل ذکر نمونہ سامنے نہیں آیا۔ اس کے بعد بھی دارالحکومت سے دور، گجرات اور دکن میں اس راہ میں کچھ پیش رفت دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں لکھی جانے والی سب سے پہلی قابل ذکر تفسیر جس کا سراغ ملتا ہے وہ کاشف الحقائق اور قاموس الدقائق ہے اور یہ گجرات کے ایک بزرگ محمد بن احمد (م $\frac{\text{۸۴۰ھ}}{\text{۱۴۳۷ء}}$) کی تصنیف ہے لیکن اس میں بھی مصنف نے تصوف کی رنگ آمیزی کی ہے اور صوفیہ اور اولیاء اللہ کے حوالے دیئے ہیں۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

"...... اولیاء اللہ، علماء اور بزرگوں کے قصے بھی بعض جگہوں پر بیان کیے گئے ہیں...... اس لیے کہ صوفیانہ رنگ کی کوئی تفسیر نظر نہیں آتی۔ اسی نقطۂ نظر کے پیش نظر میں نے اس کی ضرورت سمجھی۔"[1]

چنانچہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر اسی صوفیانہ رنگ میں اس طرح شروع کی گئی۔

"(اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے بجائے) اَحْمَدُ اللّٰہَ کہتے تو اس میں ادائے لفظ کے وقت حضورِ قلب ضروری تھا ورنہ کذب بیانی ہوتی۔ پھر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (یعنی اللہ کی حمد کرتا ہوں کہنے میں صرف اپنی

---

[1] ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، ص ۲۵، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۶ اگست ۱۹۷۳ء۔

حمد کا ذکر ہونا اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" اپنی وغیرہ سب کی حمد پر دلالت ہے" (مفہوم ملخص)[47]

عربی زبان میں لکھی جانے والی دوسری قابلِ ذکر تفسیر "التفسیر الملتقط" ہے جو سید محمد گیسو دراز ۔۔۔۔۔۔۔(م ۸۲۵ھ / ۱۴۲۲ء) سے منسوب ہے۔ حضرت سید محمد گیسو دراز کا صوفیائے ہند میں جو مقام ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ۔۔ اس صورت میں اس تفسیر پر صوفیانہ خیالات کا رنگ چھایا ہوا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ تھوڑا سا نمونہ ملاحظہ ہو:

سورۃ الفجر میں لطائف کے تحت ایک جگہ "وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰہَا فَاَلْہَمَہَا فُجُوْرَہَا وَتَقْوٰہَا ۔ الآیۃ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں: (ترجمہ)

"نفوس عابدین ارض عبادۃ قلوب عارفین ارض معرفت اور ارواح مشتاقین ارض محبت ہیں۔ اسی وجہ سے پہاڑ ہیں۔ کہا جاتا ہے اولیاء اوتاد ارض ہیں جن کے ذریعے اللہ مخلوق سے بلاؤں کو دور کرتا ہے۔۔۔۔"[48]

اس کے بعد عربی زبان میں برصغیر میں جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں چودہ چیدہ چیدہ تفسیریں زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے ان تفاسیر اور ان کے مصنفین کے نام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان
بعض ما یشیر الی اعجاز القرآن — مصنف شیخ علاؤ الدین علی بن احمد المہائمی۔

ولادت ۷۷۶ھ / ۱۳۷۴ء وفات ۸۳۵ھ / ۱۴۳۲ء

---

[47] ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ص ۳۴

[48] ایضاً ص ۳۶

(۲) تفسیر القرآن — مصنفہ شیخ حاجی عبدالوہاب (م ۹۳۴ھ / ۱۵۲۷ء)

(۳) تفسیر محمدی — حسن محمد بن میاں گجیوری ولادت (م ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء)

(۴) منبع عیون المعانی و مطلع شموس المثانی — شیخ مبارک بن خضر ناگوری (م ۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۳ء)

(۵) سواطع الالہام — ابوالفیض فیضی (م ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء)

(۶) انوار الاسرار فی حقائق القرآن — شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی (م ۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۲ء)

(۷) زبدۃ التفاسیر — شیخ علاء الدین بن خاوند محمود کشمیری (م ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء)

(۸) زبدۃ التفاسیر للعلماء المشاہیر — شیخ الاسلام بن قاضی عبدالوہاب گجراتی (المتوفی ۱۱۰۹ھ / ۱۶۹۸ء)

(۹) تواقب التنزیل فی اشارۃ التاویل — ملا علی اصغر بن عبدالصمد قنوجی (متوفی ۱۱۴۰ھ / ۱۷۲۸ء)

(۱۰) قرآن القرآن بالبیان — شیخ کلیم اللہ جہان آبادی ولادت ۱۰۶۰ھ / ۱۶۵۰ء وفات ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۹ء

(۱۱) تفسیر صغیر — امیر عبداللہ محمد بن علی اصغر قنوجی (م ۱۱۴۸ھ / ۱۷۴۳ء)

(۱۲) تفسیر مظہری — قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء)

(۱۳) فتح البیان فی مقاصد القرآن — نواب صدیق حسن خاں قنوجی (م ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء)

(۱۴) تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن — مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء)

یوں تو ان میں سے ہر تفسیر کی کوئی نہ کوئی خوبی ہے لیکن لوگ ابوالفیض فیضی کی تفسیر "سواطع الالہام" کو اس وجہ سے بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ وہ صنعتِ غیر منقوطہ میں لکھی گئی ہے۔ جو لوگ اس طرح کی بازیگریوں سے متاثر ہوتے ہیں وہ تو اس کو فیضی کا بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں قرآن کریم کی عظمت کے کچھ نقوش قائم ہیں۔ وہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں فیضی کے اس طرح کے کرتبوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ چنانچہ ملا عبدالقادر نے اس کے اس فعل کی مذمت کی ہے۔ اگر ہم بفرضِ محال اس کو ملا بدایونی کی مبالغہ آرائی پر بھی محمول کریں تب بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فیضی نے اپنی قوّتِ ذکاوت کا بے محل استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ تفسیر لکھنے کا مقصد قرآنی تعلیم کو لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہوتا ہے نہ کہ اپنی ذہانت و قابلیت کی نمائش کرنا۔

برصغیر میں بہ زبانِ عربی لکھی جانے والی ایک قابلِ ذکر تفسیر "تفسیر مظہری" ہے۔ یہ مرزا جانِ جاناں مظہر کے شاگرد قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی لکھی ہوئی ہے۔ "تفسیر مظہری" دس جلدوں میں ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے الفاظ کی تشریح اور معنی و مطالب کے ساتھ ساتھ مسائل کی تشریح میں حنفیوں کے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے "بیضاوی" تفسیر کی کتابوں میں بڑی مقبول تھی اور اپنے دقیق اسلوب اور علمی نکات کی وجہ سے درس میں شامل تھی۔ مصنف خود شافعی مسلک کے حامل تھے اس لیے تفسیر میں

یعنی شافعی نقطۂ نظر نمایاں رہتا تھا۔ برصغیر کے سنی مسلمان عموماً حنفی المذہب تھے۔ اس لیے طلب کو اس کے مطالعے میں بڑی الجھنیں پیش آتی تھیں اس دقت اور دشواری کو دور کرنے کے لیے قاضی صاحب نے حنفی مسلک کو سامنے رکھ کر یہ تفسیر لکھی۔ لیکن غالباً ضخیم ہونے کی وجہ سے نہ تو کبھی درس میں داخل کی گئی اور نہ طلب نے اس سے زیادہ استفادہ کیا۔ تاہم اپنی جگہ پر یہ ایک اچھی کوشش اور مفید کام ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو برصغیر کے مسلک حنفی کے ماننے والے سنی مسلمانوں کے لیے یہ گرانقدر تحفہ ہے۔

"فتح البیان فی مقاصد القرآن" نواب صدیق حسن قنوجی ثم بھوپالی کی تفسیر ہے۔ وہ خود اپنی اس تفسیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"در باب خود بے مثل اور عدیم النظیر واقع شدہ است....

.... تفسیر قرآن چناں می باید" [1]

لیکن یہ نواب صاحب کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ وہ خود اہل حدیث کے مسلک پر عامل تھے اس لیے ہر چیز کو اسی کی روشنی میں جانچتے اور اپنی ہر تحریر کو دوسروں پر فوقیت دیتے تھے

"فتح البیان فی مقاصد القرآن" میں بعض خوبیاں ضرور ہیں لیکن اسکو بے مثل و عدیم النظیر کہنا مبالغہ سے خالی نہیں۔

برصغیر میں جو تفاسیر عربی زبان میں لکھی گئیں ان میں سب سے آخری قابل ذکر تفسیر "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" ہے۔ یہ تفسیر مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تحریر کی ہے۔ وہ بھی نواب صدیق حسن خاں صاحب کی طرح "اہل حدیث" کے مسلک پر کاربند تھے۔ لیکن انھوں نے تفسیر لکھنے میں ایک منفرد طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی آیتوں کی تفسیر

---

[1] تاریخ التفسیر ص ۶۸

یکساں مفہوم والی آیتوں سے کریں۔ چنانچہ اس کام میں انھیں بڑی محنت کرنی پڑی لیکن ــــــ وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب رہے۔

یہ تو پورے قرآن کی تفسیریں تھیں۔ ان کے علاوہ بہت سی تفسیریں الگ الگ سورتوں کی لکھی گئیں لیکن ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کے نام گننا بھی ممکن نہیں۔

فارسی تفاسیر

جب عالم اسلامی کے ایک بڑے حصہ میں فارسی زبان کا رواج بڑھا تو دینی علوم سے متعلق اس زبان میں بھی کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن چونکہ اس وقت لوگوں کے ذہنوں پر مسائل تصوف کا غلبہ تھا اس لیے زیادہ تر تصانیف اخلاقیات اور تصوف پر ہوئیں۔ فارسی زبان میں صرف چند تفسیریں برصغیر سے باہر لکھی گئیں اور چند برصغیر میں۔ ان میں سے بھی اس وقت صرف چند دستیاب ہیں۔

مآثر عالمگیری مصنف محمد ساقی مستعد خاں کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں "ملا صفی الدین اردبیلی نے شاہزادی زیب النساء کے حکم سے تفسیر کبیر کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جو زیب التفاسیر کے نام سے مشہور ہے"[۱]

قاضی محمد اعلیٰ تھانوی صاحب کشاف اصطلاحات الفنون کے چچا زاد بھائی محمد مکرم خاں فاروقی نے بھی فارسی زبان میں ایک تفسیر لکھی تھی مگر چونکہ اس وقت برصغیر میں پریس قائم نہیں ہوئے تھے اس لیے اس کے طبع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ ایک آدھ قلمی نسخہ تھا وہ غالباً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران تلف ہو گیا۔ مصنف کے اخلاف میں مولانا شیخ محمد محدث تھانوی تلمیذ شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی نے اپنی ایک کتاب "دفع وسواس فی اثر ابن عباس" میں اس تفسیر کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی بہت تعریف کی ہے۔[۲]

---

[۱] مآثر عالمگیری اردو، مصنف محمد ساقی مستعد خاں، ناشر نفیس اکیڈمی [illegible] ۲۲ محمد طفیل [illegible]

[۲] [illegible] کراچی اسلامک کلچر [illegible] شمارہ ۱۹۶۱ء [illegible]

تفسیر فتح العزیز معروف بہ تفسیر عزیزی سے پارہ عم کی فارسی تفسیر ہے اور ماہ ذی الحجہ ۱۳۱۹ھ مطابق مارچ ۱۹۰۲ء میں طبع ہوئی تھی۔ مالک مطبع محمد عبدالاحد خاتمۃ الطبع میں تحریر فرماتے ہیں:

"...... کتاب مستطاب تفسیر عزیزی مؤلفہ راس المحدثین سند المفسرین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث و مفسر دہلوی غفر اللہ لہ تفسیر ہے بہت عجیب و کتابیست بس غریب کہ در بیان لطائف و نکات تفسیرے دروا آورد"

فارسی کی ایک تفسیر کا ذکر مولانا عبدالصمد صارم صاحب نے تاریخ التفسیر میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"غرائب الرحمٰن، مصنفہ مفتی محمد سعید احمد مدراسی (ترجمان فارسی) مطبوعہ ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء"[1]

قرآن کریم کی تفاسیر کا یہ وہ ذخیرہ ہے جو ہمارے اسلاف عربی اور فارسی زبانوں میں تحریر فرما کر ہمارے لیے فراہم کر گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد گیارہ سو سے زیادہ ہے۔ اس ذخیرہ کو سامنے رکھ کر گزشتہ دو تین صدیوں میں ہمارے بعد کے علماء نے اردو زبان میں تفسیریں لکھیں جو اب ایک بڑے ذخیرہ کی شکل اختیار کر گیا ہے اور اس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

---

[1] تاریخ التفسیر ص ۸۵۔

باب دوم

برصغیر پاک و ہند میں تبلیغ اور تعلیم دین کے سلسلہ میں صوفیہ اور علماء کا کردار

پس منظر

اردو زبان کی ابتداء اور اس کے ارتقاء کا مسئلہ ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ زبانوں کے کردار کا مذہب کے رشتہ سے کچھ ذکر کیا جائے۔ لسانی مطالعہ سنسکرت یا پراکرتوں کا ہو یا عربی کا یا لاطینی کا اس کی بناء تفہیم دین ہے۔ مثلاً سنسکرت جو اپنے ویدک دور میں صرف ویدوں کی زبان تھی اور برہمنوں کی زبانی روایت سے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہی تھی اور عام بول چال کی زبانوں یا بولیوں یعنی پراکرت کے بولنے والوں کے لیے "ناقابل فہم ہو گئی تو اس کی تفہیم کے لیے سنسکرت کے قواعد نویسوں کو اس کے صرف و نحو کی طرف توجہ کی ضرورت ہوئی۔ اسلام جب سرزمین عرب سے باہر پھیلا تو یہی ضرورت ایران اور ہندوستان میں ہوئی۔ بلکہ جن ممالک میں مسلمان پہنچے وہاں عربی کی تعلیم و تدریس مقامی زبانوں میں بھی دینی ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ دور جدید میں جب عیسائی مشنریوں نے برصغیر پاک و ہند میں عیسائیت کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو انھوں نے بھی دیسی زبانوں اور بولیوں کا سہارا لیا۔ اور سلسلہ اب تک جاری ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد کے وقت جو مقامی زبانیں اور بولیاں

موجود تھیں۔ ان میں عربی، فارسی اور ترکی کے عناصر کا اضافہ ہوا۔ آنے والوں کی
زبان میں اکثریت فارسی بولنے والوں کی تھی اس لیے آگے چل کر فارسی ہی دفتری
عدالتی اور تہذیبی زبان قرار پائی اور اس کی یہ حیثیت انیسویں صدی تک باقی
رہی تا آنکہ اس کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ عربی دین اور علم کی زبان تھی اور علما
کے لفظ کا اطلاق عموماً عربی زبان کے عالم پر ہوتا تھا اور عربی کے نصاب میں
علوم قرآنی کے علاوہ مسلمانوں کے جملہ علوم معقول و منقول کا درس شامل تھا
لیکن عوام میں اکثریت کی زبان نہ فارسی تھی نہ ہی عربی۔ مسلمانوں نے ہر علاقہ
کی زبان عوام کو صرف ایک نام سے یاد کیا اور وہ لفظ ہندوی اور "ہندی"
ہے۔ یہ بولی خواہ قدیم پنجابی ہو یا دہلوی، گجراتی ہو یا دکنی، ان کی ابتدائی تصانیف
میں بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مقامی الفاظ جو ایک علاقہ کی بولی کو دوسرے
علاقے کی بولی سے مختلف بناتے ہیں وہ بہت محدود ہیں۔ مثلاً اگر دکنی کا
جائزہ لیا جائے تو اس کا ایک لفظ "نکو" بمعنی "نہیں" ایسا ملتا ہے جس کا
سراغ اور کسی بولی میں نہیں ملتا۔ صوفیائے کرام اور بزرگان دین جو ہندوستان
میں مسلمانوں کے ساتھ آئے ان کا تعلق درباروں کے بجائے عوام سے تھا اگر
حکمران کو سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اسلام کی تبلیغ میں زیادہ مقصد نظر نہیں
آتا اور اس کا ایک اولین ثبوت یہ ہے کہ دہلی میں جو کم و بیش آٹھ سو سال
تک مسلمانوں کے دور حکومت میں دارالخلافہ رہی۔ ان کی آبادی ۱۲ فیصد
سے زیادہ نہ تھی۔ محض ایک غلط فہمی تھی کہ بعض حضرات نے اردو کو شاہی لشکر
اور شاہی دربار سے وابستہ کر کے اسے محض درباری یا لشکری زبان بنا دیا ورنہ
یہ تو ایک مدت تک درباروں میں باریاب نہ ہو سکی تھی اور اس کا حلقہ صرف
عوام کی بول چال اور صوفیائے کرام کی مجلسوں تک محدود تھا۔ چنانچہ اردو کا
ابتدائی اور قدیم سرمایہ صوفیائے کرام اور مبلغین کے مختصر جملوں، منظوم اور

نثری رسالوں سے شروع ہوتا ہے اور اس طرح شاعری اور نثر دونوں کی سرپرستی کا سہرا ان ہی بزرگوں کے سر ہے۔

بلاذری کی شہادت کے بموجب مسلمانوں کی سب سے پہلی مہم حضرت فاروق اعظم کے دورِ خلافت میں ۱۵ھ میں تھانہ (احاطۂ بمبئی) بھیجی گئی اور وہاں سے سب لوگ صحیح سلامت واپس آگئے۔ بلاذری کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"ہم سے علی بن محمد بن عبد اللہ بن ابی سیف نے کہا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنہ ۱۵ھ میں عثمان بن ابی العاص الثقفی کو البحرین و عمان کی ولایت پر مقرر کیا۔ وہ خود تو عمان آگئے اور اپنے بھائی الحکم کو البحرین بھیجا۔

عمان پہنچ کر انھوں نے ایک دریائی مہم تانہ (تھانہ) کی طرف بھیجی۔ جب یہ لوگ صحیح سلامت واپس آگئے تو عمر (رضی اللہ عنہ) کو اس کی اطلاع دی انھوں نے لکھا ثقیف کے بھائی تو نے کیڑے کو لکڑی پر چڑھا دیا۔ قسم ہے اگر وہ لوگ ضائع ہو جاتے تو میں تیری قوم سے اتنے ہی آدمی لے لیتا۔

"الحکم نے اپنے بھائی المغیرہ کو خلیج دیبل کی طرف روانہ کیا۔ اور خود بروص (بھڑوچ) پر حملہ کیا۔ دشمن سے مقابلہ ہوا اور اس پر غالب ہو گئے"[1]

دوسری مہم حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) کے دور میں بلوچستان اور سندھ کے مشرقی علاقہ کی طرف بھیجی گئی مگر وہ اس علاقہ کا صرف جائزہ لے کر واپس آگئی۔ اس کے سردار حکیم بن جبلۃ العبدی جب حضرت عثمان غنی رضی کی

---

[1] فتوح البلدان جزو دوم (اردو ترجمہ) شائع کردہ سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ص ۱۲۶۔

حکومت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کے استفسار پر نہایت دلچسپ انداز میں رپورٹ[1] پیش کی۔

"(امیر المومنین) پانی کم، پھل ردی، چور بے باک، لشکر کم ہو تو ضائع ہو جائے گا، بہت ہو تو بھوکوں مرے گا۔"

حضرت عثمانؓ نے یہ سن کر کہا "خبر دے رہے ہو یا سجع کہہ رہے ہو؟" بولے امیر المومنین! خبر دے رہا ہوں۔ یہ سن کر انھوں نے لشکر کشی کا خیال ترک کر دیا[1]۔

پھر ۳۸ھ یا اوائل ۳۹ھ میں حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اجازت لے کر حارث بن مرۃ العبدی نے سرحدِ ہند پر حملہ کیا، فتحیاب ہوئے، کثیر غنیمت ہاتھ آئی۔ صرف لونڈی غلام ہی اتنے تھے کہ ایک دن میں ایک ہزار تقسیم کیے گئے[2]۔

اس کے بعد چوتھی مہم حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ خلافت میں آئی اور ۴۴ھ میں المہلب بن ابی صفرہ نے اس سرحد پر حملہ کیا اور بنہ (بنوں) اور الاہواز تک جا پہنچے۔ یہ دونوں شہر ملتان اور کابل کے درمیان ہیں[3]۔

یہ سب معمولی جھڑپیں یا مہمات تھیں جن کے کوئی دور رس نتائج مرتب نہیں ہوئے۔ مسلمانوں کی اصل یلغار ولید بن عبد الملک کے زمانۂ خلافت میں محمد بن قاسم ثقفی کی زیر قیادت سندھ پر ہوئی جس کے نتیجے میں بلوچستان اور سندھ کا علاقہ ملتان تک مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا اور اس وقت سے برابر اسلامی پرچم کے زیر سایہ چلا آ رہا ہے۔ فتح سندھ کے وقت جو مسلمان

---

۱ فتوح البلدان جلد دوم (اردو ترجمہ) ص ۱۷۷۔

۲ ایضاً ص ۱۷۷۔

۳ ایضاً ص ۱۷۸۔

برصغیر میں آئے وہ سب اسلام کے جذبے سے سرشار تھے۔ علوم شرعیہ پر ان کی
پوری توجہ مرکوز تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اس علاقہ میں علمی سرگرمیاں
شروع ہو گئیں۔ چنانچہ شروع دور میں جو جہاں گرد اور سیاح جیسے بزرگ بن شہریار،
اصطخری، ابن حوقل، المسعودی اور مقدسی بشاری اس علاقے میں آگئے۔ انھوں نے
یہاں کی علمی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں مقدسی بشاری سندھ
میں وارد ہوا۔ اس وقت تک سندھ کا دارالحکومت منصورہ تھا۔ مقدسی
وہاں کے علماء اور کئی درس گاہوں کا بہ صراحت احسن التقاسیم میں ذکر کرتا ہے۔
ظاہر ہے کہ اس صورت میں حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ پر کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہوگا۔
لیکن استداد زمانہ سے وہ سب سرمایہ ضائع ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب
قرامطہ خلیفہ بغداد کی فوج سے شکست کھا کر بلوچستان اور سندھ میں وارد
ہوئے اور یہاں منصورہ اور ملتان کی مسلمان حکومتوں کو نیست و نابود کر چکے
تو اپنے اقتدار کے قیام کے ساتھ انھوں نے اسلامی علوم کے تمام ذخیروں
کو بھی ضائع کر دیا۔ اس کے بعد نہایت طویل عرصہ تک تمام علوم پر ایک جمود کی
کیفیت طاری رہی۔ پھر جب مرکز سلطنت بن کر لاہور آیا تو وہ علوم و فنون کا
مرکز بن گیا۔ وہاں بے شمار علماء و فضلا پیدا ہوئے جنھوں نے دینی علوم پر کافی
لکھا۔ لیکن وہ زیادہ تر عربی اور فارسی میں تھا۔ اس وقت تک دہلی میں بھی اردو
میں تصنیفی کام شروع نہیں ہوا تھا۔ ایسی صورت میں ان علاقوں میں اس کی کیا
توقع کی جا سکتی تھی۔

گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں غزنوی خاندان کے فرماں رواؤں
سبکتگین اور محمود غزنوی کے کئی حملوں کے بعد پنجاب مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔
اور تقریباً ڈیڑھ صدی تک غزنوی خاندان اس علاقہ میں حکمراں رہا۔ جب
غوری خاندان کے علاؤالدین جہاں سوز نے غزنین پر قبضہ کر کے اس کو

نذرِ آتش کر دیا تو خاندانِ غزنویہ کا پایۂ تخت لاہور بن گیا اور یہاں علمی سرگرمیاں جاری رہیں۔ علماء اور شعراء کا یہاں کافی اجتماع تھا۔ ساتھ ہی حکمرانوں کی سرپرستی تھی۔ لیکن چونکہ یہ لوگ نسلاً عجمی تھے اسی لیے ان کی زیادہ توجہ تصوف، اخلاقیات، شعر و شاعری، فلسفہ وغیرہ کی جانب تھی۔ حکومت کے کام چلانے کے لیے فقہ کی طرف بھی رجحان تھا۔ ہیئت سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ہیئت کی گرانقدر تصنیف قانونِ مسعودی غزنویوں ہی کی زیرِ سرپرستی لکھی گئی۔ تصوف کی پہلی کتاب کشف المحجوب بھی اسی دور میں منصۂ شہود پر آئی۔ لیکن یہ سب کام عربی اور فارسی میں ہوا۔ اردو یا ہندی میں اگر کچھ تحریری کام ہوا بھی تو وہ شعر و شاعری کی حد سے آگے نہیں۔ شعراء اس میں بھی مسعود سعد سلمان کے ہندی کلام کا ذکر تو ملتا ہے۔ کلام ناپید ہے۔

خواجہ مسعود سعد سلمان کے بارے میں ہمارے مایہ ناز محقق پروفیسر حافظ محمود شیرانی رقم طراز ہیں:

"لیکن یہ خواجہ مسعود سعد سلمان ہیں جن کے متعلق متقدمین و متاخرین متفق لکھتے ہیں کہ وہ ہندی میں بھی صاحبِ دیوان تھے۔ مجھ کو ان کی ہندی شعرگوئی کے متعلق شبہ تھا کیونکہ جہاں وہ اپنی فارسی و عربی زبان دانی پر اپنے قصائد میں فخر کرتے ہیں، وہاں ہندی کا ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً

مرا بدان تو کہ در پارسی و در تازی
بہ نظم و نثر ندارد چو من کسی استقلال

دوسرے موقع پر گویا ہیں:

کس ار بہ پارسی و تازی امتحان کندے
مرا بیافتے میدان امتحان شدے

لیکن جہاں محمد عوفی کہتا ہے :

" و او را سہ دیوان است ۔ یکے بہ تازی و یکے بپارسی و یکے بہندی ۔"

(لباب الالباب محمد عوفی ص ۲۴۶ جلد دوم)

عرفی کے ساتھ امیر خسرو بھی فرماتے ہیں :

" پیش ازیں از شاہان سخن کسے را سہ دیوان دیو دمگر مرا کہ خسرو

مالک کلام مسعود سعد سلیمان را اگرچہ ہست اماں آں سہ دیوان

در عبارت عربی و فارسی و ہندوی است و پارسی مجرد کسے سخن را قسم

نکردہ جز من کہ دریں کار اقسام و عالم ۔"

(دیباچہ غرۃ الکمال ص ۶۹)

اس لیے ہمیں تسلیم کر نا چاہیے کہ خواجہ ہندی میں شعر کہتے تھے ۔

غزنویوں کا زوال شروع ہوا تو غوری خاندان کو عروج نصیب ہوا ۔ پہلے اس خاندان نے غزنوی فرماں رواؤں کو پنجاب سے بے دخل کیا ۔ پھر شہاب الدین غوری نے ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی اور اجمیر پر قبضہ کر لیا ۔ اس کے بعد بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا ۔ ۱۱۹۴ء میں قنوج پر اور ۱۱۹۶ء میں بہار اور بنگال پر قبضہ ہوا ۔ پھر سندھ ، راجپوتانہ اور مالوے کی فتوحات مکمل ہو گئیں اور ۱۲۳۶ء تک جو التمش کے دورِ حکومت کا آخری سال تھا ۔ تقریباً تمام شمالی ہندوستان مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا ۔ اس وسیع سلطنت کا دارالحکومت دہلی بنا ۔ اسی نسبت سے ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک یہ دور سلطنت دہلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔

اس عرصہ میں علمی سرگرمیاں باقی رہیں مگر علمی زبان کا درجہ عربی کو اور دفتری زبان کا درجہ فارسی کو حاصل رہا ۔ البتہ انگریزی کا تمام تر عربی اور فارسی میں ہوا ۔ البتہ روزمرہ کے کاموں میں مسلمانوں نے مقامی زبان کو اپنانا شروع کر دیا اور اس طرح غیر شعوری طور پر اردو زبان کا ہیولی زیادہ تیزی سے تیار ہونے لگا ۔

یہ مشترک زبان جس کو بعد میں ہندی، ہندوی یا اردو کا نام دیا گیا۔ اسی وقت سے معرضِ وجود میں آنی شروع ہو گئی تھی جب پنجاب میں مسلمانوں کی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کو یہاں کے مقامی باشندوں سے میل جول اور لین دین میں ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی جس کو دونوں فریق سمجھ سکیں۔ اس مشترک زبان کی تشکیل کی داستان ڈاکٹر محمد عزیز کی زبانِ قلم سے سنیے۔ وہ اپنی گراں قدر تالیف "اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ" میں تحریر کرتے ہیں۔

"اس مشترک زبان کی تشکیل میں مسلمان درویشوں اور صوفیوں نے بڑا حصہ لیا۔ وہ مسلمان تاجروں اور سپاہیوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور ان کی روحانی فتوحات کا دائرہ سلاطین کی ملکی فتوحات سے کم وسیع نہ تھا۔"[1]

جیسا کہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

"اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنین اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادۂ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا۔"[2]

جہاں تک تصنیف و تالیف کا تعلق ہے اس میں زمانہ کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا پلڑا بھاری ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ مدت گزر جانے کے بعد خالص دینی علوم کی کتابیں عربی میں لکھی جاتی رہیں۔ باقی علوم کے لیے عام طور پر فارسی زبان کو کام میں لایا جانے لگا۔ پھر دینی علوم میں بھی بیشتر توجہ تفسیر کی طرف ہو گئی۔

---

1. اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ از ڈاکٹر محمد عزیز۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ص ۲۶

2. نقوشِ سلیمانی از مولانا سید سلیمان ندوی۔ مطبع اعظم گڑھ، ص ۳۰

اس لیے کہ انتظام سلطنت اور عدالتی کاموں کے لیے فقہ کی ضرورت پڑتی تھی۔
اس لیے اس کا سیکھنا ضروری تھا اور چونکہ اس کے لیے عربی زبان کو مخصوص کر لیا گیا تھا
اس لیے عربی کے قواعد بھی اسی زبان میں سکھائے جاتے تھے۔ منطق اور فلسفہ کے لیے
بھی عربی زبان کو ترجیح دی جاتی تھی۔ دیگر علوم جن کے لیے فارسی کو مختص کر لیا گیا تھا
ان میں زیادہ زور تاریخ اور تصوف پر تھا۔ اور چونکہ تصوف کا اس اخلاقیات سے
بندھا تھا اس لیے مصنفین کی توجہ اس طرف بھی بہت زیادہ تھی۔ پھر چونکہ دلوں کی
انگیٹھی کو گرم رکھنے کے لیے شاعری کی ضرورت تھی۔ اس لیے فارسی شعراء کی بھی زیادہ
توجہ مسائلِ تصوف بیان کرنے پر مرکوز رہی۔ حضرت امیر خسرو کی مثنویوں میں سے بعض
کا موضوع تاریخی واقعات ہیں۔ جیسے تغلق نامہ۔ اس کے علاوہ عصامی کی طویل مثنوی
فتوح السلاطین بھی فی الحقیقت منظوم تاریخ ہے۔ چونکہ سوائے محمد تغلق کے تقریباً
تمام حکمرانوں کا بھی رجحان تصوف کی جانب تھا۔ لہٰذا فارسی میں بھی زیادہ کام تصوف
اور اس کے متعلقات میں ہوا۔ خالص دینی علوم یعنی تفسیر، علومِ تفسیر، حدیث اور
اصولِ حدیث میں نہ عربی میں کوئی وقیع کام ہو سکا اور نہ فارسی میں۔ سلاطین شرقیہ
کے زمانے میں جونپور میں اس طرف توجہ ہوئی لیکن یہ دور بہت مختصر رہا۔ اس لیے
یہ کام زیادہ نہ پھیل سکا۔

سلطنت دہلی کے بعد مغلیہ دور شروع ہوا تو بعض علماء کی توجہ حدیث و
تفسیر کی جانب ہوئی۔ ان علماء میں سرِ فہرست نام شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ہے۔
پھر اورنگ زیب کے زمانہ میں حکمراں کی ذاتی توجہ سے اس میں زیادہ تیزی پیدا
ہوئی اور متعدد علماء منظرِ عام پر آ گئے لیکن شاہ عبدالرحیم کا نام اور کام زیادہ نمایاں
رہا۔ ان علماء نے مل کر فتاویٰ عالمگیری جیسی ضخیم کتاب مرتب کی۔ پھر اسی مغلیہ
دور میں شاہ عبدالرحیم کے صاحبزادے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور
ان کی اولاد و احفاد نے نہایت منظم طریقے پر دینی علوم کی اشاعت کی۔ شروع میں تو

ذریعہ تعلیم اور تصنیف و تالیف کا کام عربی اور فارسی میں ہوا۔ بعد میں اردو
زبان کو بھی کام میں لایا جانے لگا۔ آجکل برصغیر میں دینی علوم سے متعلق جو کچھ ہو رہا
ہے وہ زیادہ تر خانوادۂ ولی اللٰہی کا فیضان ہے۔

سلطنت دہلی کے زمانے میں شمالی ہندوستان میں اردو زبان میں کوئی تحریری
کام نہیں ہوا۔ صوفیا کے ملفوظات میں چند فقرے ملتے ہیں یا حضرت امیر خسرو کی اپنی
زبان سے منسوب کچھ پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، ڈھکوسلے اور انمل مشہور ہیں۔ ان کے
علاوہ خالق باری کو بھی ان ہی کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ اگرچہ حافظ محمود شیرانی
نے اس کی تردید کی ہے۔[1] تاہم اگر ان سب کو امیر خسرو کا کلام تسلیم بھی کر لیا جائے
تب بھی ان میں سے کسی چیز پر دینی علم کا اطلاق نہیں ہوتا۔

صوفیا چونکہ انسان کے باطن سے سروکار رکھتے ہیں اور تزکیہ نفس ہی
ان کی سرگرمیوں کا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے دروازے کافر و مومن
دونوں کے لیے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں۔ انسانی ہمدردی، خلوص اور محبت
ان کے اصلی جوہر ہیں اور یہی جوہر ان کی روحانی فتوحات کی ضامن ہوتی ہیں۔
ہندوستان میں جو درویش آئے ان کا حلقۂ اثر بھی انہیں جوہروں کی وجہ سے روز
بروز زیادہ وسیع ہوتا گیا۔ ان کا سابقہ چونکہ بیشتر عوام سے تھا اس لیے دلوں کو
ہاتھ میں لینے کے لیے ہم زبانی ضروری تھی۔ چونکہ اپنے خیالات کی تلقین کے لیے وہ ملک
کے جس حصے میں پہنچے وہاں کی زبان اختیار کر لی اور عوام کو ان ہی کی زبان میں تعلیم
دی۔ لیکن چونکہ بعض مذہبی اصطلاحوں کا استعمال ناگزیر تھا۔ اور یہ عربی یا فارسی
میں ہوتی تھیں اس لیے عربی اور فارسی الفاظ بھی ان بولیوں میں قدرتی طور پر شامل
ہو گئے۔

---

[1] "پنجاب میں اردو" از حافظ محمود شیرانی۔ مرتب ڈاکٹر وحید قریشی۔ ناشر کتاب نما
لاہور طبع چہارم ۱۹۷۳ء۔ ص ۱۴۸ تا ۱۶۱۔

اب تک اس مخلوط زبان کے جتنے قدیم فقرے ملے ہیں یا جو قدیم کتابیں دستیاب ہوئی ہیں خواہ وہ کسی زبان میں ہوں یا گجراتی میں۔ سب حضرات صوفیاء کے ملفوظات یا ان ہی کی تصنیفات ہیں۔

صوفیاء کی تعلیم کے موضوع اسلام اور اخلاقیات تھے۔ لہٰذا اردو جہاں ان کے اقوال نے عوام کو نہایت محبت اور عزت کے ساتھ ان ہی دو چیزوں کی دعوت دی اور زندگی بھر ان ہی کی اشاعت میں لگے رہے۔ ویسے تو تمام صوفیہ کا یہی طریقہ اور عمل رہا لیکن بعض حضرات ان میں بہت نمایاں ہیں۔ حضرت داتا صاحب کی تو پوری تعلیمات "کشف المحجوب" کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ فارسی میں ہے لیکن اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تعلیمات جب وہ عوام تک پہنچاتے ہوں گے تو وہ یقیناً اسی مخلوط زبان میں ادا ہوتی ہوں گی۔

"حضرت شیخ بہاؤالدین ذکریا سہروردی ملتانی کے بارے میں سید صلاح الدین عبدالرحمٰن اپنی تالیف "تذکرہ اولیائے کرام" میں لکھتے ہیں:

"فرماتے ہیں کہ بندہ پر واجب ہے کہ سچائی اور اخلاص سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اس کی عبادات و اذکار میں غیر اللہ کی توجہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ احوال کو درست اور اقوال و افعال میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ ضرورت کے سوا کوئی بات کہے اور نہ کوئی کام انجام دے۔ ہر قول و فعل سے پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ سے التجا کرے اور اس سے نیک عمل کی توفیق کی مدد چاہے"[1]

اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام لکھ کر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ابتدائی اردو سے لے کر جگتی تحریک کے زمانے تک کے بہت سے صوفیائے

---

1 - تذکرہ اولیائے کرام ۔ سید صلاح الدین عبدالرحمٰن ۔ ناشر ادبستان لاہور، طبع اوّل دسمبر ۱۹۸۰ء ۔ ص ۱۲۲ ۔

بعض اردو فقرے اور اشعار جمع کر دیے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے شیخ فریدالدین شکر گنج سے ابتدا کی ہے۔ ان کے سلسلے میں بابائے اردو نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب مادر مومناں نے مولانا برہان الدین عرف شیخ جمال الدین ہانسوی کو حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے مولانا برہان الدین کو کافی نوازا۔ مادر مومناں نے مولانا برہان الدین کی صغر سنی کو دیکھتے ہوئے عرض کیا "خوجا بالا ہے"۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ "پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔"

ان دو فقروں کے علاوہ بابائے اردو نے حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج کے کچھ شعر بھی نقل کیے ہیں۔ ان میں ایک شعر یہ ہے:

اسا کری یہی سو ریت جاوں تا کے کبجاوں میت

ایک نظم کا پہلا شعر یہ ہے

تن دھوتے سے دل جو ہوتا پاک پیش رو اصفیا کے ہوتے خوک

اس کے علاوہ اور بھی کئی نظمیں، ایک جھولنا اور ایک دوہرہ بھی باباصاحب کا نقل کیا ہے۔ سب کا زیادہ تر یہی رنگ ہے۔ تاہم وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی نسبت باباصاحب سے صحیح ہے۔

اس کے بعد بابائے اردو نے شیخ حمیدالدین ناگوری کے متعلق لکھا ہے کہ جب انھوں نے فقر و فاقہ سے تنگ آکر اپنے والد سے اپنے لیے فراخی معاش کی دعا کرنے کو کہا تو انھوں نے جواب میں اردو کا یہ فقرہ کہا: "ہاں بابا کچھ کچھ"۔

ایک واقعہ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر اور امیر خسرو کا بیان کیا ہے۔ لکھا ہے کہ جب علاؤالدین نے امیر خسرو کو قلندر صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں بھیجا۔ قلندر صاحب نے امیر خسرو کے گانے سے متاثر ہو کر انھیں اپنا کلام سنایا تو امیر خسرو آبدیدہ ہو گئے۔ اس پر قلندر صاحب نے فرمایا "لڑکا کچھ سمجھ والا ہے"۔

بابائے اردو نے صاحبِ فرہنگ کے حوالے سے اس شعر کو بھی قلندر صاحب سے ہی نسبت دی ہے۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے

پھر شیخ سراج الدین عثمان کے سلسلہ میں خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کا یہ فقرہ نقل کیا ہے "دھم اور پرہ ہولے"۔ اس کے بعد شرف الدین یحییٰ منیری کے ایک دوہرہ نقل کیا ہے۔ بعدہٗ شاہ برہان الدین غریب کے ذکر میں بابا فرید الدین شکر گنج کی زاہدہ و عابدہ بی بی عائشہ کا یہ جملہ درج کیا ہے۔ "اے برہان الدین سادی دہید کو کہیا شیدا ہے"؟ چونکہ بی بی عائشہ کا تعلق پنجاب سے تھا اس لیے اس فقرہ میں پنجابی اثر غالب ہے۔ کھینچ تان کر یہ الفاظ اردو کے کہے جا سکتے ہیں "والے" اور "ہے"۔

سب سے زیادہ وقیع کام بابا محمد بندہ نواز کا ہے۔ وہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ تھے اور دہلی سے گجرات ہوتے ہوئے دکن پہنچے تھے۔ وہاں انھوں نے گلبرگہ میں قیام کیا جو اس وقت بہمنی سلطنت کا صدر مقام تھا۔ وہیں فوت ہوئے اور وہیں مدفون ہیں۔ "معراج العاشقین" اگر واقعی ان کی تصنیف ہے تو اس کو اشاعتِ دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی اردو نثر کی تحریر قرار دیا جانا چاہیے۔ بابائے اردو نے اس کا کچھ نمونہ "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ان کا ایک رسالہ "معراج العاشقین" میں مرتب کر کے شائع کر چکا ہوں۔ اس کا سنہ کتابت ۹۰۷ ہجری (مطابق ۱۵۰۰ء) ہے۔ اس کی زبان کا نمونہ یہ ہے اگرچہ بعض حضرات کو اس کو تسلیم کرنے میں تامل ہے۔

"اے عزیز! اللہ بندہ بنا یہاں پہچان کو جانا۔ میں تو شروع جانا ہے

اول اپنے کو پچھانت بعد از خدا کی پچھانت کرنا۔ انسان کے پانچ تن کوں
پانچ تن۔ ہر ایک تن کو پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔
پہلا تن واجب الوجود مقام اس کا خیال فی نفسی اس کا ابا ہے۔
یعنی واجب کی انکھ سوں غیرت دیکھنا سو جو من کے کان سوں غیرت
سننا سو ہور تن سوں بد بوئیاں لینا سو الغفن کی زبان سوں
بد گوئی ذکر کرنا سو کیا کی شہوت کوں غیر جاگا نہ خرچنا سو۔ پیر
طبیب کامل ہوتا نبض پہچان کر دوا دیتا ہے۔[1]

گویا دکنی اردو کا پہلا ادبی نمونہ ہے۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن فرماتے ہیں:

"حضرت سید گیسو دراز نے اپنی تعلیمات کو عام لوگوں کے سمجھانے
کے لیے بعض رسالے دکنی اردو میں بھی تصنیف کیے۔ ان میں سے ایک
رسالہ "معراج العاشقین" کو مولوی عبد الحق سکریٹری انجمن ترقی اردو نے
۱۳۴۴ھ، ۱۹۲۵ء میں اورنگ آباد سے شائع کیا تھا۔"[2]

غالباً بابا گیسو دراز کے اثر سے ان کے سلسلے کے بعض بزرگوں نے اردو نظم
میں دین کی اشاعت کی۔ بابائے اردو نے اس سلسلہ میں شمس العشاق شاہ
میراں جی، شاہ برہان الدین جانم، شاہ امین الدین اعلیٰ، امین الدین گنج العلم
اور سید میراں حسینی شاہ کے کسی قدر تفصیلی حالات اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔
اس کے بعد شمالی ہند اور گجرات کے بہت سے بزرگوں کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔
ان میں ترتیب وار شیخ احمد کھٹو، حضرت قطب عالم، حضرت شاہ عالم، حضرت

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد (اردو ادب اول) ۔ پنجاب
یونیورسٹی لاہور۔ ص ۹۴
۲۔ تذکرہ اولیائے کرام، ص ۲۸۸۔

سید محمد جونپوری، شیخ بہاء الدین باجن، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری، شیخ علی متقی، شیخ رزق اللہ، شیخ وجیہ الدین احمد علوی، شیخ بہاء الدین برناوی، سید شاہ ہاشم حسینی العلوی کے نام آتے ہیں۔ آخر میں مؤلف کبیرؒ کی بعض خصوصیات بیان کر کے ان کے کچھ دوہے دیئے ہیں[1]

ان سب بزرگوں کے کلام کے نمونوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ہر ایک کی تحریر میں مقامی رنگ نمایاں طور پر نظر آئے گا

تاہم ان سب پر اردو زبان کا اطلاق ہوگا کیونکہ زبان کے بعض بنیادی اجزاء[2] سب کے یہاں مشترک ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک نمونہ امیر خسرو کی دہلوی زبان کا بھی ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اپنی گرانقدر تصنیف "اقبال اور مسلک تصوف" میں تحریر فرماتے ہیں:

"سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ نے جب مولانا حسام الدین ملتانی کو خلافت عطا فرمائی تو شہادت کی انگلی اٹھا کر یہ مصرعہ فرمایا "دنیا ترک کیہ و دنیا ترک کرو"[3]

دکن میں بہمنی سلطنت اور گولکنڈے اور بیجاپور کی حکومتوں کے زمانہ میں دفتری کاموں اور شعر و شاعری میں اردو زبان کو کافی عروج تک اور بڑے پیمانہ پر کام میں لایا جاتا رہا۔ لیکن دینی علوم کی طرف توجہ بہت کم ہوئی اور اگر کچھ کام ہوا بھی تو اس میں تصوف کا رنگ غالب رہا۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید شطاری اپنی تصنیف "قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک" میں بجا طور پر

---

[1] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام (بابائے اردو مولوی عبدالحق)

[2] [illegible] اردو ۔ پاکستان [illegible] ۱۹۶۶ء

[3] اقبال اور مسلک تصوف ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی طبع اول ۱۹۷۷ء ص ۲۳۳

فرماتے ہیں:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے مقابلہ میں دین کے شرعی پہلو پر کم لکھا گیا ہے۔ چنانچہ تصوف کے مقابلہ میں تفسیر و حدیث اور فقہ پر کام کم ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ صوفیاء نے اس کو اپنا موضوع مقدم بنالیا تھا۔ اور وہ عوام کو سمجھانے کے لیے عوامی زبان میں تصوف کے موضوع پر لکھتے تھے۔"[1]

آگے چل کر شطاری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"فقہ پر نثر میں جو رسائل دستیاب ہوتے ہیں ان کا سلسلہ بارھویں صدی ہجری سے ملتا ہے۔ البتہ قرآن کا ترجمہ کرنے اور تحفۃ العجائب تفسیری و مناجیتی قلم بند کرنے کا رجحان دسویں صدی ہجری میں ہو گیا تھا اور علماء کا ایک مختصر گروہ برابر ان میں قرآن کا ترجمہ کرنے اور تفسیر لکھنے میں مصروف رہا۔ اس طرح یہ کام محدود پیمانہ پر ہی سہی لیکن مسلسل ہوتا رہا۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔"[2]

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحقیق کے بموجب قدیم اردو تراجم میں سورہ یوسف کا گجراتی اردو میں ترجمہ سب سے قدیم ہے۔ جس کتاب کی بنا پر انھوں نے یہ انکشاف کیا ہے اس کو اول و آخر سے ناقص قرار دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ اس کا مصنف اور سنہ تصنیف کا پتہ چلانا غیر ممکن ہے۔ پھر یوسف زلیخا کی زبان سے مقابلہ کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ ترجمہ [illegible] معلوم ہوتا ہے اور یہ مگر یوسف زلیخا

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک [illegible] پی۔ ایچ۔ ڈی۔
(دہلی) قدیم اردو نثر [illegible]۔ حمایت نگر [illegible] آباد دکن ستمبر ۱۹۸۲ء، ص ۱۴
۲۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر از ڈاکٹر حمید شطاری، ص ۴۳

۹۰۵ھ/۱۴۹۷ء میں لکھی گئی اس لیے یہ ترجمہ دسویں صدی کے اواخر یا گیارہویں صدی کی اوائل کی تالیف ہے۔

لیکن یہ قیاس درست معلوم نہیں ہوتا۔ بابائے اردو ہی کی تحقیق کی بنا پر اس کو زیادہ سے زیادہ گیارہویں صدی ہجری یا سترہویں صدی کے وسط کی تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ شطاری صاحب کی رائے میں "تفسیر کی نوعیت کچھ خاص نہیں ہے بجز اس کے کہ ترجمہ میں کہیں کہیں الفاظ اضافہ کر دیے گئے ہیں"[1]

شطاری صاحب کا فرمانا درست و بجا ہے۔ انھوں نے خود مثال میں "وَيُقِيمُونَ الصَّلوٰةَ" کا ترجمہ "کھڑی کرتے فرض نماز کو اس کے وقت میں ادا کر کے" لکھا ہے کہ ترجمے میں تفسیر کی خاطر "فرض" اور "اس کے وقت میں" کے الفاظ بڑھا دیے گئے ہیں۔ اس کا لفظی ترجمہ صرف اتنا ہے "اور لوگ نماز قائم کرتے ہیں" چونکہ قائم کرنے میں اشارہ فرض نمازوں کی جانب ہے اور نماز کو وقت پر ادا کرنا بھی ضروری ہے تاکہ ہر شخص وقت کی پابندی کر کے جماعت میں شرکت کر سکے اور اِقَامِ الصَّلوٰۃ کی تکمیل ہو سکے۔ اس لیے صاحبِ ترجمہ نے تفسیری حاشیہ دینے کی بجائے ترجمہ ہی میں ان الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے۔

بہر حال ترجمہ اور تفسیر کے اس ابتدائی نمونے کی دریافت سے یہ بات تو کسی قدر وثوق سے معلوم ہو گئی کہ اردو میں قرآن کریم کی تفسیر لکھے جانے کا آغاز گیارہویں صدی ہجری کے اختتام سے ہوا لیکن اسے اچھا یا [illegible] نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم آگے چل کر ترجمہ اور تفسیر کا جو کام اردو زبان میں ہوا وہ اتنا وسیع ہے کہ اب ترجمے کے معاملے میں تو دنیا کی تمام زبانوں پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے صرف عربی زبان ایسی ہے جو اس کے مقابل

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر حمید شطاری) ص ۴۰۹

لائی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے عربی کا پلہ بھاری رہے لیکن یقین ہے کہ یہ فرق نہایت خفیف ہوگا۔ اردو زبان کو یہ فوقیت اس کی برصغیر کی تمام زبانوں میں سب سے زیادہ مقبولیت کی وجہ سے ہے۔ برصغیر کی دوسری زبانوں کا تعلق محدود علاقوں سے ہے جبکہ اردو زبان ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے ہر طرح کے علمی و ادبی کام کی طرح اردو میں قرآن کریم کے ترجمے کرنے اور تفسیریں لکھنے کا کام بھی دونوں ملکوں میں ہوتا رہا ہے۔ اور اب بھی ہو رہا ہے۔ رہا برصغیر سے باہر ممالک کا معاملہ تو عرب ممالک کو چھوڑ کر دیگر ممالک میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بہت کم ہے اس لیے وہاں کی زبانوں میں یہ کام زیادہ بڑے پیمانہ پر نہیں ہو سکتا کیونکہ معاشیات کا طلب اور رسد کا قانون تو زندگی کے ہر شعبہ میں کار فرما ہے۔

سچ پوچھیے تو علوم اسلامی کی بنیاد قرآن حکیم پر رکھی گئی ہے اور چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ قرآن کی عملی تفسیر تھی نیز احادیث نبوی آپ کے احوال و افعال کا آئینہ ہیں۔ لہٰذا احادیث کو قرآن حکیم کی تفسیر کی حیثیت حاصل ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرآن حکیم اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم جملہ علوم اسلامی کا سرچشمہ ہیں اور دیگر علوم یعنی صرف و نحو، بیان و بدیع، قرأت و تجوید اور لغت و معانی سب ان ہی دونوں سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے اسلام اور اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کی غرض سے ضروری ہوا کہ قرآن کی تفہیم اور احادیث نبوی کے مطالعہ پر سب سے زیادہ زور دیا جائے۔ اور قرآن حکیم کے مفہوم کو براہ راست یا ترجمہ اور تفسیر کے ذریعہ سمجھا جائے اور جن احادیث سے ان کی تفہیم میں مدد ملے ان کی پوری چھان بین کر کے ان کی مدد سے یہ معلوم کیا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کو امت کے سامنے کیسے پیش فرمایا ہے جب یہ بنیاد پختہ ہو جائے

تو پھر دوسرے علوم کی جانب اعتنا کیا جائے اور دیگر علوم کے اصولوں کو ان ہی دو ما قلادل کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے یعنی یہ دیکھا جائے کہ قرآن اور حدیث کا اس سلسلہ میں کیا موقف ہے۔ مثلاً علوم "صرف" کے ایک معمولی سے اصول کو لے لیجیے۔ عربی میں "ماضی مثبت سے ماضی منفی بنانے کے لیے اس کے شروع میں "ما" کا اضافہ کردیا جاتا ہے جیسے "فَعَلَ" سے "مَا فَعَلَ" اور "ضَرَبَ" سے "مَا ضَرَبَ" اور مضارع مثبت کو مضارع منفی میں تبدیل کرنے کے لیے "لا" کو کلام میں لایا جاتا ہے۔ جیسے "يَفْعَلُ" سے "لَا يَفْعَلُ" اور "يَضْرِبُ" سے "لَا يَضْرِبُ"۔ لیکن کہیں کہیں کسی بات پر زور دینے کے لیے ماضی مثبت کو ماضی منفی میں تبدیل کرنے کے لیے "لا" کا بھی استعمال کرلیا جاتا ہے۔ جس کی مثال قرآن حکیم میں موجود ہے۔ "فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى" یہاں دونوں جگہ "ما" کی جگہ "لا" کو کلام میں لایا گیا ہے۔ اسی لیے علم الصرف کا یہ اصول مستحکم ہوگیا کہ بعض موقعوں پر ماضی مثبت کو ماضی منفی میں تبدیل کرنے کے لیے "ما" کی جگہ "لا" کا استعمال جائز ہے۔ یہی حال دوسرے علوم اسلامی کا ہے۔

چونکہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا اور احادیث نبوی بھی عربی زبان ہی میں ہیں اس لیے تمام دینی علوم کی ابتدائی کتابیں پہلے عربی میں لکھی گئیں پھر ضرورت پڑنے پر فارسی اور دوسری زبانیں بھی کام میں لائی جانے لگیں۔ اور چونکہ آج کل بھی کئی اسلامی ملکوں کی قومی زبان عربی اور بعض ملکوں کی قومی زبان فارسی ہے اس لیے اب بھی اسلامی علوم کی کتابیں ان ہی دونوں زبانوں میں لکھی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علوم اسلامی کا سب سے زیادہ سرمایہ عربی اور فارسی زبانوں میں ہے۔ ان کے بعد اردو کا نمبر آتا ہے۔ یعنی عربی و فارسی کو چھوڑ کر دنیا کی تمام زبانوں کے مقابلے میں اردو میں اسلامی علوم کا ذخیرہ سب سے زیادہ ہے۔ بلکہ بعض علوم میں تو اردو کو فارسی پر بھی برتری حاصل ہے۔ مثلاً قرآن حکیم کے جتنے ترجمے

اردو زبان میں ہو گئے ہیں، فارسی تراجم کی تعداد ان کی چوتھائی سے بھی کم ہے۔ جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے چونکہ فارسی زبان میں یہ کام کافی عرصہ پہلے سے ہو رہا ہے اس لیے پچھلی صدی تک اردو کے مقابلہ میں فارسی میں تفسیری ادب زیادہ تھا۔ لیکن چودھویں صدی ہجری یا بیسویں صدی عیسوی میں اردو میں بہت کام ہوا ہے۔ اور دیگر اسلامی علوم کی طرح تفسیر میں بھی اس زبان میں اتنا سرمایہ جمع ہو گیا ہے کہ عربی کے بعد سب سے زیادہ سرمایہ اردو زبان ہی میں ہے۔

ویسے تو جزوی طور پر اردو میں قرآن حکیم کی تفسیریں گیارہویں صدی سے ہی بیان کی جانے لگی تھیں۔ لیکن شاعری کی طرح اردو میں مکمل تفسیریں لکھنے کا سلسلہ بھی محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے عہد سے دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی مشہور تالیف "دکن میں اردو" میں لکھا ہے:

تفسیر سورۃ اِذَا جَاءَ: افسوس ہے کہ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا ڈاکٹر زور صاحب کی صراحت کے بموجب ۱۱۵۰ھ (مطابق ۱۷۳۷ء) کے قبل اس کی تصنیف ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو صراحت فرمائی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بجائے خود ایک کتاب ہے اور اس کا مصنف کوئی دکھنی عالم ہے جس نے قرآن اور حدیث کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جس کو لکھنے کی بھی اچھی مہارت حاصل ہے۔ مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا لیکن یہ رسالہ دکھنی کتابوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ دکھنی مفسروں نے قرآن شریف کی تفسیریں کس شرح و بسط کے ساتھ لکھی تھیں۔"

(تذکرہ اردو مخطوطات نمبر ۲۲۷)

نمونہ عبارات:

"پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کے بھیجنے میں خدائے تعالیٰ کی یہ

حکمت تھی کہ مکارم اخلاق کو تمام کرتا اور خلائق کی ہدایت کرتا۔
جس وقت کہ یہ امور بوجہ احسن تمام ہو گئے تو خدا تعالیٰ نے اپنے
رسول صلعم پر یہ آیت نازل کیا۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ
فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ
كَانَ تَوَّابًا

"جس وقت کہ یہ سورہ نازل ہوا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سن کر
رو دیے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم نے پوچھا کہ اے عباس
تم کس واسطے روتے ہو۔ حضرت عباسؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ
اس کے نازل ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے تئیں دنیا سے سفر
کرنے کا حکم ہوا ہے۔"
"اور جو شخص کہ سورہ کو کہ شخص خواب میں پڑھے تو خدا تعالیٰ اس کو
دشمنوں پر فتح دے گا اور تمام مشکلات اس کے حل ہوویں گے۔ اور
بعضے کہتے ہیں کہ یہ خواب دلالت کرتا ہے موت کے نزدیک ہونے پر۔"[1]

جہاں تک ترجمہ قرآن کا تعلق ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے، شمالی ہند میں
سب سے پہلا اردو ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی نے کیا تھا لیکن
مولانا محمد عبد اللہ چھیراوی نے "البیان التراجم القرآن" (مطبوعہ اردو پریس کلکتہ
۱۳۳۶ھ) نے حضرت مولانا فضل الرحمن مراد آبادی کا ایک قول نقل کیا ہے۔
"جس زمانے میں ہندوستان میں بھاشا زبان جاری تھی اس وقت

---

1 دکن میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی۔ نیج آفتاب۔ پاکستان (لاہور) ۱۹۵۲ء
(مطابق ۱۳۷۲ھ) ص ۲۹۵-۲۹۶

بھاشا میں بھی قرآن شریف کا ترجمہ ہوا تھا۔ مولوی محمد علی صاحب
کانپوری حال مقامی مونگیر مؤلف رسالہ ارشاد رحمانی و فضل
یزدانی تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ
میں لکھتے ہیں کہ ایک روز عصر کے وقت حضرت کو بالکل ارشاد فرمایا کہ مولوی
عبدالقادر صاحب کے ترجمے سے دو سو برس پیشتر بھاشا میں بہت
عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔"[2]

دیگر علوم اسلامی کو دکنی اور اردو زبان کے ذریعہ برصغیر میں پھیلانے کے
سلسلہ میں صوفیائے کرام نے جو کام انجام دیا ہے وہ بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ چنانچہ
تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند کے مقالہ نگار ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا
یہ فرمانا غلط نہیں:

"عربی اور فارسی کی بعض کتابوں کے دکنی نثر میں ترجمے اور شرحیں اور
مختلف رسائل نظم و نثر میں آیات و احادیث کے ترجمے اور تشریحیں
صوفیائے کرام کا ایک ایسا دینی اور لسانی کارنامہ ہے جو تاریخ
ادب اردو میں یاد رکھنے کے قابل ہے۔ صوفیہ نے اردو زبان کو اس کے
بچپن ہی میں اظہار کے لیے ایسے سانچے اور اسلوب مہیا کر دیے جو
اتنی کم عمری میں کسی زبان سے متوقع نہیں ہوتے۔ اس طرح
انھوں نے جہاں عربی اور فارسی نہ جاننے والے مسلمانوں اور غیر
مسلموں کے لیے عربی اور فارسی کتابوں میں موجود دینی، صوفیانہ
اور اخلاقی باتوں تک پہنچنا آسان کر دیا وہاں قرآن و حدیث کو بھی
ترجمہ کے آئینے میں دیکھنے کے قابل بنا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ

---

[1] تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد (اردو ادب اوّل)، ص ۱۵۰

زبان قدیم کو بھی الفاظ و اسالیب اور معانی و مضامین کے لحاظ سے
مالا مال کر دیا۔[1]

آخر میں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اردو زبان کو برصغیر پاک کی دوسری زبانوں پر یہ فوقیت و برتری حاصل ہے کہ وہ عصر جدید میں روح اسلام کے اظہار کا اہم ترین ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس ادعا کی تائید تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کے مقالہ نگار خورشید احمد صاحب کے بیانات سے ہوتی ہے۔ وہ اپنے بصیرت افروز مقالے "دینی ادب دسویں صدی ہجری تک" میں لکھتے ہیں:

"اردو اگر ایک طرف برصغیر پاک و ہند کے لسانی اور ثقافتی تغیر پر مسلمانوں کے فکر اور ان کی تہذیب و تمدن کے عمل اور تعامل کی پیداوار ہے تو دوسری طرف یہ زبان اور اس کا ادب عصر جدید میں روح اسلام کے اظہار کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ عربی کے بعد اسلام کے دینی ادب کا سب سے بڑا خزانہ اسی زبان میں ہے۔ انیسویں صدی کے وسط سے مسلمانان پاکستان و ہند کے افکار و نظریات کا اصل اظہار اردو ہی کے ذریعہ ہوا ہے۔ گو اس زمانہ میں فارسی اور انگریزی کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اول الذکر کو تو بہت آہستہ سرکاری اور ثقافتی دائروں میں متروک ہونے والی زبان کی حیثیت سے اور انگریزی کو نئی ابھرتی ہوئی لسانی قوت کے طور پر لیکن اسلامی فکر کے حقیقی عکاسی اردو ادب ہی میں ہوئی ہے۔"[2]

۱۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد (اردو ادب اول) ص ۱۵۰

۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ دسویں جلد (اردو ادب پنجم) ص ۲۶۱ — ۲۶۲

باب سوم

قرآن حکیم کے اردو تراجم اور ان کے حواشی

شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے دورِ حاضر تک حواشی کا جائزہ

چونکہ قرآن حکیم کے مخاطب اول اہل عرب تھے اس لیے اس کا عربی زبان میں نازل ہونا ایک فطری امر تھا۔ پھر چونکہ عربیوں کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا وہ اپنے سوا سب کو عجمی یا گونگا قرار دیتے تھے۔ وہ اظہار خیال کے لیے نئے نئے انداز اختیار کرتے اور فصاحت و بلاغت اور لفظی اور معنوی خوبیاں پیدا کر دیتے تھے۔ اور اسی میدان میں ان کے مابین مقابلے ہوتے تھے۔ اور جو جتنا فصیح و بلیغ کلام پیش کرتا تھا اس کی اتنی ہی عزت ہوتی تھی۔ بلکہ اس خوبی کی بنا پر خاندانوں کی عزت بڑھ جاتی تھی۔ اس چیز کو اللہ تعالیٰ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ لہٰذا جب اس نے اس قوم کو مخاطب کیا تو اپنے کلام میں ان سب باتوں کو داخل کیا اور نہ صرف فصاحت و بلاغت اور لفظی و معنوی خوبیوں کو اپنے کلام کا طرۂ امتیاز بنایا بلکہ ابلاغ کے لیے وہ وہ طرز اختیار کیے کہ عرب جن کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا دم بخود رہ گئے۔ جو لوگ اس کو خدا کا کلام ماننے کے لیے تیار نہیں تھے وہ بھی اس کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ جب قرآن حکیم کا یہ چیلنج ان کے سامنے آیا۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن

مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ (البقرہ ۲۳ ـ ۲۴) ع ۳

(ترجمہ) اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ۔ اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لاؤ۔ اللہ کے سوا جس جس کی چاہو مدد لے لو۔ اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر (یعنی وہ بت جن کو تم پوجتے ہو) جو مہیا کی گئی ہیں منکرین حق کے لیے۔

اس وقت بھی انھوں نے اور باتیں بھی بنائیں مگر اس کے مقابلہ میں کوئی چیز پیش نہ کر سکے۔

بہر حال قرآن حکیم کی زبان عربی تھی تو مادری زبان تھی لہٰذا ان کو اس کے مطلب و معانی سمجھانے کے لیے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ البتہ بعض تفسیری نکات عہد رسالت ہی سے بتا دیے گئے تھے۔ جب اسلام عرب کی حدود سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیلا تو غیر قوموں نے بھی قرآن اور اسلام کو ان کی اصلی روح کے ساتھ سمجھنے کے لیے پوری لگن اور دلچسپی کے ساتھ عربی زبان سیکھی اور نہ صرف ان علاقوں میں جہاں اسلام پھیلا عربی کو سیکھنا ضروری سمجھا گیا۔ بلکہ بعض انصاف پسند یورپی مورخین کے بقول پانچ سو چھ سو سال تک یورپ کے اکثر ممالک کی علمی زبان عربی رہی۔ اس لیے عرصہ دراز تک کسی کو بھی قرآن حکیم کو براہ راست عربی زبان سے سمجھنے میں چنداں دقت پیش نہیں آئی۔ ایسی صورت میں کسی دوسری زبان میں اس کا

ترجمہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ صرف ایک ترجمہ کا حوالہ ملتا ہے جو سندھ کے قدیم شہر الور کے راجہ کی فرمائش پر ۲۷۰ھ/۸۸۴ء میں مقامی زبان میں کیا گیا۔[1] لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ ترجمہ پورے قرآن کا تھا یا اس کے کسی جزو کا۔ اس کے تین سو سال بعد دوسرا ترجمہ پطرس طرابلسی نے ۵۳۷ھ/۱۱۴۳ء میں لاطینی زبان میں کیا۔[2] اس ترجمے کے سو سال بعد ۶۷۲ھ/۱۲۷۴ء میں ایک ترجمہ بربری زبان میں کیا گیا۔[3]

یہ تین ترجمے قدیم ترین ہیں جن کا ابھی تک سراغ ملا ہے۔ ایک چوتھے ترجمے کے بارے میں جو فارسی زبان میں ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ شیخ سعدی نے کیا تھا لیکن سعدی سے اس کی نسبت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اسی لیے ان کے حالات میں کہیں بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔ لہٰذا اس چوتھے ترجمے کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب ہوا اور مترجم کون تھا۔

چونکہ پندرھویں صدی کے آغاز سے لاطینی زبان یورپ کی علمی زبان بن گئی اس لیے وہاں رفتہ رفتہ سائنسی علوم کی طرح مذہبی علوم بھی تیزی سے لاطینی میں منتقل ہونے لگے۔ چنانچہ قرآن کریم کے بھی متعدد تراجم لاطینی زبان میں ہو گئے۔ ایک ترجمہ ۱۶۳۸ء میں ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈم سے شائع ہوا پھر ۱۶۹۸ء میں دوسرا ترجمہ فادر لیوس مراکشی نے اٹلی کے شہر پیدوا سے شائع کیا۔ اسی صدی اور اس کے بعد والی صدیوں میں فرانسیسی، جرمن، انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی یہ کام بڑی تیزی سے ہونے لگا۔[4] لیکن اس سب کی تفصیل بیان

---

1. قرآن مجید کے اردو تراجم از جمیل نقوی، ص ۳۴
2. ایضاً ص ۳۴
3. ایضاً ص ۳۴
4. قرآن مجید کے اردو تراجم کا مختصر تاریخی القرآن و تراجم القرآن۔ تالیف جمیل نقوی، ناشر ادبیہ، ص ۳۶۰

بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاں تک کہ ترجمۂ عزیزیہ کا تعلق ہے اس سلسلہ میں مختلف آراء پیش کی جاتی ہیں۔ اور بعض محققین تو نہایت مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے اردو تراجم مؤلفہ جمیل نقوی میں ایک روایت نقل کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مولانا محمد عبد اللہ چھپراوی نے "البیان التراجم القرآن" (مطبوعہ اردو پریس کلکتہ) ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب (گنج) مراد آبادی کا ایک قول نقل کیا ہے:

• جس زمانے میں ہندوستان میں بھاشا زبان جاری تھی اس وقت بھاشا میں بھی قرآن شریف کا ترجمہ ہوا تھا۔ مولوی محمد علی صاحب کانپوری حال مقامی مونگیر مؤلف رسالہ ارشاد رحمانی و فضل یزدانی، تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ میں لکھتے ہیں کہ ایک روز عصر کے وقت کمترین کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ مولوی عبد القادر صاحب کے ترجمے سے دو سو برس پیشتر بھاشا میں بہت عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا ہے۔[1]

اسی کتاب یعنی قرآن مجید کے اردو تراجم میں بابائے اردو مولوی عبد الحق کے حوالہ سے یہ بھی مرقوم ہے:

"اردو زبان میں عام طور پر قرآن شریف کا ترجمہ مولانا رفیع الدین کا اور دوسرا شاہ عبد القادر کا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں ترجمے تیرہویں صدی ہجری کے ہیں۔ لیکن اس بات کی بہت کم لوگوں

---

1 قرآن مجید کے اردو تراجم مع مختصر تاریخ القرآن و تراجم القرآن، تالیف جمیل نقوی، ناشر [illegible]، ص ۱۷۱

کو تعجب ہے کہ اس زمانے میں نیز اس سے قبل ہندوستان کے مختلف
مقامات میں متعدد تفسیریں اور ترجمے لکھے گئے۔ ان میں زیادہ تر
تفسیریں یا یوں کہیے کہ برائے نام تفسیریں ہیں۔ درحقیقت قرآن
کے لفظی ترجمے ہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ یا ایک آدھ سطر وضاحت
کے لیے بڑھا دی گئی ہے۔ ...... بالخصوص دسویں صدی ہجری کے
ایک دکنی ترجمہ قرآن مجید کا بھی ذکر کیا ہے۔[1]

لیکن ان میں سے اکثر تراجم یا تفسیریں جو ملتی ہیں جزوی ہیں۔ مکمل ترجمہ ان میں
کوئی نہیں۔

پہلے اقتباس میں مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے حوالے سے بھاکا
زبان کے جس ترجمہ کا ذکر کیا گیا وہ اگر شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے ترجمہ
سے دو سو سال پہلے ہوا تھا تو گیارہویں صدی ہجری کے بالکل اوائل کا ہوگا۔
اس لیے کہ شاہ صاحب کے ترجمہ کی تکمیل ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء میں ہوئی تھی لیکن چونکہ حضرت
مولانا گنج مرادآبادی کے قول سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی یہ ترجمہ
مفقود تھا۔ لہٰذا اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ جن ترجموں
کا بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ذکر کیا ہے وہ ان ہی کے قول کے مطابق تفسیری
ترجمے ہیں۔ لہٰذا ان کو تفسیری ادب میں شامل کرنا زیادہ مناسب ہے۔

لیکن پورے وثوق کے ساتھ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سرزمین
میں سب سے پہلا اور مکمل ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بارھویں
صدی ہجری کے وسط میں فارسی زبان میں کیا تھا جس کے بارے میں حیات ولی
کے مصنف مولانا محمد رحیم بخش دہلوی رقم طراز ہیں:

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم مع مختصر تاریخ القرآن و تراجم القرآن، تالیف جمیل نقوی، ناشر ادب منزل کراچی ص ۱۲۱

"یہ قرآن مجید کا ایک نہایت مختصر ترجمہ ہے جو ایک عجیب و الغریب پیرائے میں لکھا گیا ہے ...... بڑے بڑے معرکۃ الآراء مضامین اور نہایت اہم اور دقیق مطالب چند مختصر اور گنتی کے الفاظ میں اس خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ ادا کیے ہیں۔ انہیں ایسا صاف اور پانی کر دیا ہے جس سے نہ صرف تعجب بلکہ سخت حیرت ہوتی ہے۔"[1]

شاہ صاحب نے تصنیف و تالیف کا کام مکہ معظمہ سے ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۲ء میں واپس آنے کے بعد شروع کیا۔ اس سے پہلے آپ کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ خود آپ کا بیان ہے کہ "فارغ التحصیل ہونے کے بعد میں نے بارہ سال درس و تدریس میں صرف کیے۔ اس کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ علم نبوی کی تحصیل و تکمیل میں ترقی کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی حرمین محترمین کی زیارت کا بھی شوق دامنگیر ہوا چنانچہ میں نے سامان سفر مہیا کیا اور مکہ معظمہ کی جانب روانہ ہو گیا۔"

ان حقائق کے باوجود بعض قصہ گوؤں نے مولویوں کو بدنام کرنے کے لیے یہ داستان وضع کی کہ

"جب دہلی کے مولویوں کو جناب شاہ ولی اللہ صاحب سے رنجش پیدا ہو گئی اور وہ آپ کے خون کے پیاسے ہو گئے تو آپ نے ان کی اس رنج و غصہ کی آگ کو فرو کرنے اور اس رنجش کو دبانے کی غرض سے سفر عرب اختیار کیا۔"[2]

حیات ولی کے مصنف مولانا محمد رحیم بخش دہلوی اس رنجش کا سبب ایک فاضل معاصر کے الفاظ میں یہ بتاتے ہیں:

---

1. حیات ولی، مولانا محمد رحیم بخش دہلوی، ناشر المکتبۃ السلفیہ، لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۵۸
2. حیات ولی اللہ، مولانا محمد رحیم بخش دہلوی، ص ۲۹۹

"ایک فاضل معاصر جناب شاہ صاحب کے سفرِ عرب کا یہ سبب بیان کرتے ہیں کہ جب شاہ صاحب نے فارسی میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور اس کی اشاعت ہوئی تو ایک ہنگامۂ عظیم آپ کے ملاؤں کے گروہ میں برپا ہو گیا۔ اور یہ سمجھ گئے کہ ہماری رہبری کی عمارت ڈھا دی گئی...... اس خیال نے ان کے دل میں ایک آگ بھڑکا دی۔ اور علاوہ کفر کے فتوے دینے کے شاہ ولی اللہ صاحب کی جان کے دشمن ہو گئے...... قصہ مختصر یہ کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے سفرِ عرب اختیار کیا اور میدانِ اسلام کو ویران ہوتا ہوا اور ہاتھ سے ہاتھ ملتے ہوئے چھوڑا۔"[۱]

ظاہر ہے کہ جب سفرِ عرب سے پہلے قرآن شریف کا ترجمہ ہوا ہی نہیں تھا تو اس پوری داستان کی حیثیت افسانہ اور افسولات سے زیادہ کچھ نہیں۔ صحیح حقیقت یہ ہے کہ دیارِ عرب سے واپسی کے بعد مسلمانوں کی اکثریت کو مضامینِ قرآن سے آگاہ کرنے کے لیے شاہ صاحب نے ۱۱۵۰ھ (۳۸-۱۷۳۷ء) میں فارسی زبان میں جو اس وقت عام طور پر سمجھی جاتی تھی قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔[۲] چونکہ یہ ایک نئی بات تھی اسلئے ممکن ہے بعض علماء کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ "اللہ کے کلام کو پوری روح کے ساتھ کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ناممکن ہے اس لیے فارسی کے اس ترجمہ کو پڑھنے والوں کے دلوں میں وہ اثر پیدا نہیں ہوگا جو ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ

---

۱ — حیاتِ ولی از مولانا محمد رحیم بخش دہلوی۔ ص ۲۲۸–۲۳۲

۲ — رودِ کوثر۔ شیخ محمد اکرام (اشاعتِ سوم — ۱۹۵۸ء)
ناشر و طابع فیروز سنز لاہور ص ۵۱۹۔

کہ جب انہیں فارسی میں ترجمہ مل جائے گا تو قرآن کے اصل متن کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ جائے گی۔ لہٰذا اپنے اس خدشہ کو انہوں نے شاہ صاحب کے سامنے پیش کیا ہو مگر جب شاہ صاحب نے اپنا مدعا ان کے گوش گزار کر دیا ہو تو وہ خاموش ہو گئے ہوں۔

بہر حال شاہ ولی اللہ صاحب کے دیگر کارناموں میں سے قرآن شریف کا اس وقت کی مروجہ زبان فارسی میں ترجمہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے اور اس کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نمونہ اس کا یہ ہے۔ سورۂ فاتحہ ★

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بنام خدا بخشندہ مہربان

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ

ستائش خدا راست پروردگار عالمہا ۔ بخشایندہ مہربان ۔ خداوند روز جزا

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

ترا می پرستیم و از تو مدد می طلبیم ۔ بنما ما را راہ راست ۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ

راہ آنانکہ انعام کردہ بر ایشان بجز آنکہ خشم گرفتہ شد بر ایشان و بجز گمراہان۔

شاہ ولی اللہ کا یہ اقدام نہایت مبارک ثابت ہوا اور اس کے بعد قرآن حکیم کے ترجموں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔ لیکن یہ کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں جس میں شاہ صاحب پیدا ہوئے سے پہلے ۔ برصغیر اور

★ قرآن مجید مع الترجمتین والتفسیر لعبد بن عباس قد طبع محمد ہاشم علی فی المطبع الہاشمی ۱۲۸۵ھ ترجمہ فارسی موسوم بفتح الرحمٰن ترجمۃ القرآن از تصنیفات صاحب الوجدان العرفان حضرت الاعلام احمد الشیخ احمد عرف شاہ ولی اللہ والترجمہ اردو مسمیٰ موضح القرآن

فوت ہو گئے۔ اردو زبان نہایت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ بلکہ یہ دور اردو شاعری کا عہد زریں کہلانے کا مستحق تھا۔ اس لیے اس صدی ہی میں قرآن الکریم کے اردو زبان میں بھی ترجمے ہونے شروع ہو گئے۔ اس معاملہ میں بھی اولیت کا شرف ولی اللٰہی خاندان ہی کو حاصل ہے۔ سب سے پہلا بامحاورہ اردو ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب کے فرزند شاہ عبد القادر محدث دہلوی نے ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء میں کیا۔ اسی کے آگے پیچھے شاہ صاحب کے دوسرے فرزند شاہ رفیع الدین نے ایک لفظی ترجمہ کیا۔ یہ دونوں ترجمے آج بھی نہایت مقبول ہیں اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ جیسا کہ مقدمہ میں بتایا جا چکا ہے۔ جمیل نقوی نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے حوالہ سے بتایا ہے کہ انھوں نے بھاشا زبان کا ایک ترجمہ دیکھا تھا جو شاہ عبد القادر کے ترجمہ سے دو سو سال پہلے ہوا تھا۔ اسی طرح بابائے اردو کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے ترجموں سے قبل اردو میں بہت سے ترجمے لکھے گئے تھے لیکن چونکہ یہ ترجمے اب کہیں دکھائی نہیں دیتے اس لیے ان کی نوعیت کی وضاحت ممکن نہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو زبان میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر صاحبان کے تراجم کو تقدم کا فخر حاصل ہے۔

اسی صدی میں ایک اور ترجمہ شاہ عالم ثانی کے حکم سے حکیم شریف خاں نے کیا۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے اوائل میں ایک ترجمہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں کیا گیا۔ اس ترجمہ کا کام کاظم علی جوان، میر بہادر علی حسینی اور مولوی امانت اللہ نے مل کر شروع کیا تھا۔ بعد میں مولوی امانت اللہ کی جگہ حافظ غوث علی کو رکھ لیا گیا تھا۔ اسی کے لگ بھگ مولوی فضل اللہ کو بھی شریک کر لیا گیا۔ زبان کی اصلاح کا کام شروع سے کاظم علی جوان کے سپرد تھا۔ یہ ترجمہ ۹ رمضان المبارک ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء کو جمعرات کے دن مکمل ہوا۔[1]

۱۔ تاریخ شاہ عالم ضمیمہ نوشتہ مترجم ص ۲۵۳

شروع میں اردو زبان میں یہ چار ترجمے ہوئے۔ اس کے بعد جیسے جیسے اردو پھیلتی اور مقبولیت حاصل کرتی گئی، دیگر علوم کی طرح قرآن حکیم کے اردو تراجم کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن انیسویں صدی کے مقابلہ میں بیسویں صدی عیسوی میں یہ کام بہت تیزی سے ہوا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تعداد کے لحاظ سے اردو زبان کو دنیا کی تمام زبانوں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ جمیل نقوی نے اس وقت تک کے اردو تراجم کی تعداد ۲۶۷ بتائی ہے۔[1] پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی نے اپنی تالیف "اسلام مستقبل کا مذہب" میں ایک محقق کے حوالے سے اردو تفسیروں اور ترجموں کی تعداد مکمل ۲۵۷ اور نامکمل ۳۶۶ بتائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک محقق نے ۱۹۶۹ء کے ایک مضمون میں جو معارف پاک و ہند میں چھپی ہوئی اردو تفسیروں اور ترجموں کی تعداد مکمل ۲۵۷ اور نامکمل ۳۶۶ بتائی ہے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔"[2]

اس کثیر تعداد میں سے اکثریت ان علماء کی ہے جن کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا کہنا ہے کہ:

"آسمانی صحیفوں کے ترجمے کی مخالفت تقریباً ہر ملک اور ہر قوم میں کی گئی ہے۔ اور یہ مخالفت ہمیشہ علمائے دین کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے کو علوم دینیہ کا خاص ماہر اور اسرار الٰہی کا وارث خیال کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ باتیں عام ہو جائیں۔ بعض اوقات اس لیے بھی مخالفت کی گئی کہ ترجمے اور تفسیریں اکثر

1۔ قرآن مجید کے اردو تراجم ص ۲۰

2۔ اسلام مستقبل کا مذہب اور دوسرے مقالات، پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی ناشر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی طبع اول ۱۹۵۶ء ص ۹۷

منشاء کے خلاف نہیں تھا۔[1]

چونکہ اہل یورپ پادریوں اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے بارے میں ایسی باتیں کہتے تھے اس لیے ان کی تقلید میں انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اپنے علماء کے متعلق وہی باتیں دہرانی شروع کر دیں۔ لیکن یہ علماء دین پر سراسر اتہام ہے۔ انہوں نے کبھی بھی قرآن کے ترجمے کی مخالفت اس لیے نہیں کی کہ وہ اپنے کو علوم دینیہ کا خاص ماہر اور اسرار الٰہی کا وارث خیال کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ باتیں عام ہو جائیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب اس کام کی ابتدا کیوں کرتے۔ آخر یہ دونوں حضرات خود بھی عالم دین تھے اور اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس نے برصغیر میں علوم دین کی روشنی پھیلائی۔ اور آج بھی اس سرزمین میں علوم شرعیہ کا جو چرچا ہے وہ اسی خانوادے کا فیضان ہے۔ اصل میں اگر کسی عالم نے قرآن کریم کے ترجمے کی مخالفت کی بھی ہوگی تو وہ اس خیال سے کہ کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ویسے ہی مشکل ہے چہ جائیکہ قرآن حکیم کا ترجمہ جو اللہ کا کلام ہے اس کا ترجمہ تو انسان کے لیے ناممکن ہے۔ چنانچہ آج بھی اکثر علماء قرآن کے کسی ترجمہ کو ترجمہ نہیں مانتے بلکہ اس کو ترجمانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ان کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے۔

بہرحال اردو میں قرآن حکیم کے جو تراجم ہو گئے ہیں ان میں بڑی رنگا رنگی اور بے حد تنوع ہے۔ بعض تحت اللفظ ہیں اور بعض بامحاورہ۔ بعض میں سادگی ہے اور بعض میں ادبیت کی چاشنی ہے۔ اکثر نثر میں ہیں لیکن کئی منظوم ترجمے ہو گئے ہیں۔ اور اس معاملے میں اردو زبان کو دوسری تمام زبانوں پر برتری اور

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۸۲ء اورنگ آباد ص ۲۵

فوقیت حاصل ہے۔ ایک ترجمہ ایسا بھی ہوا ہے جو خالص دہلی کی مستورات کی زبان ہے۔
ذیل میں مکمل قرآن مجید کے چند تراجم کا کسی قدر تفصیلی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی وہ ترجمے شامل نہیں ہیں جو جامع تفاسیر کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ جیسے تفہیم القرآن، بیان القرآن، معارف القرآن وغیرہ۔ البتہ اس باب میں صرف ان ترجموں کو لیا گیا ہے جن کے ساتھ مختصر تفسیری حواشی دیے گئے ہیں۔ چونکہ مقالہ کا اصل موضوع "اردو میں تفسیری ادب" ہے اس لیے ان ترجموں کا جو جامع تفاسیر کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ ذکر آئندہ باب میں ہوگا۔ آغاز شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی کے ترجمہ سے کیا جاتا ہے۔

(۱) شاہ رفیع الدین محدث دہلوی

آپ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ زیادہ وقت عبادات اور درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا۔ اس لیے تصنیف و تالیف کی جانب کم توجہ دے سکے۔ چند تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ ان میں ترجمہ قرآن حکیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس وقت اردو زبان کے جو ترجمے موجود ہیں ان میں اس ترجمہ کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ یہ ترجمہ ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۸ء میں کیا گیا تھا اور ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں پہلی بار مطبع اسلام پریس سے شائع ہوا تھا۔ یہ ترجمہ لفظی ہے تاہم قابل فہم ہے اور قرآن حکیم کے متن کے ساتھ کبھی تنہا اور کبھی کسی دوسرے ترجمہ کے ساتھ چھپتا رہتا ہے۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ (الفاتحۃ ۶ تا ۷)

(ترجمہ) دکھا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کی کہ نعمت کی ہے تو نے اوپر

ان کے ۔ سوا ان کے کہ غضب کیا گیا ہے اوپر ان کے اور نہ گمراہوں کی۔[1]

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (سورۃ النبأ ۶ تا ۱۱)

(ترجمہ) کیا نہیں کیا ہم نے زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں، اور پیدا کیا ہم نے جوڑے تم کو اور کیا ہم نے نیند تمہاری کو سبب آرام کا اور کیا ہم نے رات کو پردہ اور کیا ہم نے دن کو وقت معاش۔[2]

(۲) شاہ عبدالقادر محدث دہلوی — ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء تا ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۵ء

حضرت شاہ صاحب بھی حضرت شاہ ولی اللہ کے لائق صاحبزادے تھے۔ عمر میں حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت شاہ رفیع الدین سے چھوٹے تھے۔ جب شاہ ولی اللہ کا انتقال ہوا اس وقت شاہ عبدالقادر صاحب کی عمر صرف ۹ سال تھی۔ لہذا آپ ان سے استفادہ علمی نہ کر سکے بلکہ جو کچھ حاصل کیا وہ اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز سے کیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر میں بڑا نام پیدا کیا۔ علم کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ میں بھی بلند درجہ پر فائز تھے طبیعت کا رجحان گوشہ نشینی کی جانب تھا اس لیے تحصیل علم کے بعد زندگی بھر اکبری مسجد میں قیام رہا اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ تصنیف و تالیف کی جانب زیادہ توجہ نہیں کر سکے۔ تاہم قرآن مجید کا اردو ترجمہ آپ کا

۱۔ عکسی قرآن حکیم مع ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلوی و مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور و کراچی (۱۹۹۲ء) ص ۳

۲۔ عکسی قرآن الحکیم مع ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلوی، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور، کراچی ص ۱۰۲۹

عبارتِ قرآنی کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ با محاورہ ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے اتنا اچھا ہے کہ ہر زمانہ میں متداول و مقبول رہا۔ اور بڑے بڑے مترجمین بطور نمونہ اس کو استعمال کرتے رہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے بعض حصوں کی تفسیر بھی کی ہے، جو موضح القرآن کے نام سے مشہور اور قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ لیکن یہ اتنی مختصر ہے کہ اس کو تفسیری حاشیہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ نمونے کے لیے دو اقتباسات شامل ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ (الفاتحہ ۱-۷)

(ترجمہ) سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا، بہت مہربان اور نہایت رحم والا، مالک انصاف کے دن کا۔ تجھی کو ہم بندگی کریں اور تجھی کو ہم مدد چاہیں۔ چلا ہم کو راہ سیدھی، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا۔ نہ وہ جن پر غصہ ہوا، اور نہ بہکنے والے۔[1]

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝

(الفتح آیت ۱ تا ۳)

(ترجمہ) ہم نے فیصلہ کر دیا تیرے واسطے صریح فیصلہ، تا معاف کرے تجھ کو اللہ جو

۱۔ عکسی قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر موضح القرآن از شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی۔ تاج کمپنی قرآن منزل، لاہور۔ ص ۲

اگلے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے۔ اور پورا کرے تجھ پر اپنا احسان اور چلا دے تجھ کو سیدھی راہ۔ اور مدد کرے تجھ کو اللہ زبردست مدد۔

سورہ فاتحہ پر تفسیری حاشیہ ہے۔ "یہ سورت اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں۔"

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ کے شانِ نزول کے سلسلے میں یہ حاشیہ دیا گیا ہے۔

"ہجرت سے چھٹے برس حضرتؐ نے خواب دیکھا کہ مکہ میں گئے ہیں عمرے کو فراغت سے حلق کرتے ہیں۔ ارادہ کیا عمرے کا۔ اگرچہ قریش سے دشمنی تھی لیکن دستور تھا کہ دشمن کو بھی حج اور عمرے سے مانع نہ ہوتے تھے اور حرم میں بیر نہ لیتے۔ پندرہ سو آدمی کے ساتھ چلے۔ قریش کے لوگ جمع ہوئے۔ شہر سے باہر جا لڑنے کو۔ جب حضرتؐ پہنچے قریب جہاں سے مکہ نظر آیا۔ سواری کی اونٹنی بیٹھ گئی۔ ہرگز نہ اٹھی۔ جب حضرتؐ نے قسم کھائی کہ میں ادب کعبے کا رکھوں گا اگرچہ یہ لوگ چڑھ چڑھ بولیں۔ تب اٹھی۔ حضرتؐ مقابلہ چھوڑ کر حدیبیہ کے میدان میں اترے۔ پیغام دیا کہ اگر چاہو مجھ سے صلح کر لو۔ ایک مدت رہ لو اتنے ہم اوروں کو مسلمان کریں پھر چاہو گے مسلمان ہو جیو اور چاہو گے لڑ لیجیو۔ آخر صلح ہوئی لیکن اس برس عمرہ نہ کرنے دیا۔ اگلے سال قضا کیا۔ اس صلح کے بعد یہ سورت اتری ہے[1]"

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝

(الفتح آیت ۱ تا ۳)

۱۔ عکسی "قرآن مجید" ص ۸۲۵ ۔ ۸۳۶

(۳۰) فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا ترجمہ

یہ ترجمہ جان بارتھوک گلکرسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے میر منشی میر بہادر علی حسینی اور منشی امانت اللہ شیدا نے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد مولوی فضل اللہ منشی بھی اس کام میں شریک ہو گئے۔ پھر جب مولوی امانت اللہ کسی نامعلوم وجہ سے سبکدوش ہوئے تو حافظ محمد غوث کا تقرر ان کی جگہ ہو گیا۔ ان سب نے مل کر یہ ترجمہ ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء میں مکمل کیا۔ اس تمام عرصہ میں مرزا کاظم علی جوان ترجمہ کی زبان درست کرنے پر متعین رہے۔ چونکہ یہ سب حضرات ہی اردو نثر لکھنے پر پوری قدرت رکھتے تھے اس لیے اس زمانے کے لحاظ سے ترجمہ کی زبان نہایت صاف، سادہ، سلیس اور بامحاورہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

الٓمٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(البقرہ آیت ۱ تا ۵)

(ترجمہ) یہ وہ کتاب ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں۔ راہ دکھانے والی ان پرہیزگاروں کی ہے جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور نماز کیا کرتے ہیں۔ اور جو کچھ روزی ہم نے ان کو دی اس میں سے خیرات کرتے ہیں اور جو کچھ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تجھے بھیجی گئی اور اس پر جو تجھ سے آگے نازل کی گئی۔ اور قیامت پر وے ہی یقین لاتے ہیں

وے اپنے پروردگار کے فضل سے سیدھی راہ پر ہیں اور وے
ہی مطلب کو پہنچیں گے۔[1]

(۴) حکیم محمد شریف خاں دہلوی (ف ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء تا ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۵ء)

حکیم صاحب شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں دلّی کے نامور طبیب تھے۔ ان کے والد حکیم محمد اکمل خاں بھی اپنے زمانہ کے نامی گرامی طبیب تھے لیکن حکیم محمد شریف خاں علم و فضل اور شہرت میں باپ سے سبقت لے گئے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں شاہی طبیب رہے۔ انہیں بادشاہ کی طرف سے "اشرف الحکماء" کا خطاب ملا تھا۔ ان کی کئی اعلیٰ پایہ کی تصانیف ہیں۔ شاہ عالم کے حکم سے انہوں نے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا تھا۔ لیکن یہ ترجمہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ اور مخطوطہ کی شکل میں حکیم محمد احمد خاں صاحب کے کتب خانہ میں موجود رہا۔ وہیں بابائے اردو نے اس کو دیکھا۔ اور چونکہ حکیم محمد احمد خاں کے قول کے مطابق حکیم محمد شریف خاں کا سنہ وفات ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء قرار پاتا ہے۔ اس لیے بابائے اردو نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر سے پہلے لکھا گیا ہوگا۔ انہوں نے ترجمہ کو دیکھ کر یہ بھی کہا کہ اس ترجمہ کی زبان شاہ عبدالقادر مرحوم کے ترجمے کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے۔ سورہ فاتحہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

حمد تعریف کے اوّل سے آخر تک موجود ہے۔ لائق ہے واسطے
اللہ کے کہ پالنے والا ہے تمام عالموں کا۔ بخشنے والا وجود کا
آخرت میں، مہربان داخل کرنے بہشت کے ہے۔ مالک

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک
(ڈاکٹر حمید شطاری) ص ۱۹۳

دن قیامت کے کا، تعریف کرنے والا اس دن جو جاہے گا کرے گا۔ خاص تجھی کو بندگی کرتے ہیں ہم اور خاص تجھی سے مدد مانگتے ہیں اور بندگی تیری کے ...... [1]

(۵) شمس العلماء مولوی نذیر احمد ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۶ء تا ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء

نذیر احمد موضع "ریہڑ" ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے مولد و وطن میں حاصل کی۔ پھر ان کے والد مولوی سعادت علی نے دلی لے جا کر اپنے ایک استاد عبد الخالق کی درس گاہ واقع اورنگ آبادی مسجد میں داخل کر دیا۔ ۱۸۴۶ء میں دلی کالج میں داخل ہو گئے۔ اس کالج میں نو برس تعلیم حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت کر لی۔ مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد حیدر آباد دکن سے وظیفہ لے کر دلی چلے آئے سرسید کی تحریک سے وابستہ ہو گئے اور علی گڑھ کالج کی خدمت کی۔ ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ قرآن حکیم کا بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا۔ جمیل نقوی کی تحقیق کے مطابق یہ ترجمہ پہلی بار ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں مع حواشی شائع ہوا تھا۔ بار دوم ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۲ء مطبع انصاری، دہلی میں چھاپا گیا[2]۔ لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب لکھتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد نے ۱۹۰۲ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ مولوی نذیر احمد اردو زبان کے ایک صاحب طرز ادیب ہوئے اس لیے ان کا یہ ترجمہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے نہایت شگفتہ اور بامحاورہ ہے۔ لیکن چونکہ دیگر کتابوں کی طرح ترجمہ قرآن میں محاوروں کی

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر سید حمید شطاری

۲۔ قرآن مجید کے اردو تراجم ص ۹۱

کثرت ہے۔ اسی لیے بقول جمیل نقوی ، علماء نے اس کی زبان کو ترجمہ قرآن زبان کے معیار نفاست سے کمتر ہوا پایا اور اس پر تنقید کی۔[1] اس کے باوجود یہ ترجمہ کافی مقبول ہوا۔ اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

اس ترجمہ کے بارے میں " اوعیتہ القرآن " کے مؤلف اور مقدمہ نگار ڈاکٹر اسلم فرخی کی رائے پیش کر دینا مناسب ہوگا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

" ۱۹۰۲ء میں مولوی نذیر احمد نے قرآن مجید کا سلیس اور بامحاورہ زبان میں ترجمہ کیا۔ ان کے ترجمے سے پہلے شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجمے شائع ہو چکے تھے۔ یہ دونوں تراجم قرآن فہمی کے اعتبار سے عدیم النظیر ہیں۔ لیکن چونکہ ان دونوں بزرگوں کے عہد میں اردو نثر تشکیلی دور سے گزر رہی تھی۔ لہذا ان ترجموں میں زبان و بیان کا پیرایہ مشکل تھا۔ مولوی نذیر احمد کو عربی اور اردو دونوں پر یکساں کمال حاصل تھا۔ پھر یہ کہ ان کے عہد میں اردو نثر میں ہر قسم کے خیالات کو بلا تکلف ادا کرنے کی وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ ان کا ترجمہ حسن بیان توضیح و تشریح اور دلنشیں انداز سے مالا مال نظر آتا ہے۔ اس ترجمے پر انہوں نے غیر معمولی محنت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے اپنی سب کتابیں دوسروں کے لیے لکھی ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ اپنے لیے کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی زبان و بیان کی سلاست اور سادگی کے اعتبار سے مولوی صاحب کا ترجمہ مثالی حیثیت رکھتا ہے۔"[2]

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم ص ۷۹

[2] اوعیتہ القرآن۔ ناشر ڈاکٹر محمد اسلم فرخی۔ منیجنگ ٹرسٹی ڈپٹی نذیر احمد تعلیمی ٹرسٹ کراچی۔ سال اشاعت ۱۹۸۷ء ص ۳۰

کو نے کے لیے قرآن حکیم کی ایک آیت اور اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (الاعراف ۷: آیت ۱۸۰)

(ترجمہ) اور اللہ کے (سب) نام اچھے ہی ہیں تو (لوگو) اس کو اس کے ناموں سے (جس نام سے چاہو) پکارا کرو۔ اور جو لوگ اس کے ناموں میں کفر کرتے ہیں ان کو (ان ہی کے حال پر) چھوڑ دو۔ [illegible] ہے کہ وہ اپنے کیے کا بدلہ پالیں گے۔[1]

اس پر تفسیری حاشیہ دیا ہے۔ "ناموں میں کفر کے بہت پیرائے ہیں۔ اول ان جملہ جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں بھی بکثرت شائع ہے۔ یہ کہ خدا کے سوا کسی اور کو ان صفتوں سے پکارا جائے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں جیسے مشکل کشا، دستگیر، ان داتا، شہنشاہ وغیرہ اور شاید غریب پرور بھی۔"

(۲۶) مولوی فتح محمد جالندھری (ولادت ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء)

ان کا مولد و وطن ٹانڈہ ضلع ہوشیار پور تھا۔ جالندھر میں سکونت اختیار کر لی تھی اس لیے جالندھری مشہور ہوئے۔ تکمیل علوم دینی کے بعد تصنیف و تالیف کی جانب متوجہ ہو گئے۔ علوم شرعیہ پر کئی کتابیں لکھیں لیکن ان کی شہرت مترجم قرآن کی حیثیت سے ہوئی۔ ان کا ترجمہ قرآن مجید بامحاورہ ہونے کے ساتھ ساتھ مستند اور معتبر بھی جانا جاتا ہے۔ اور امت مسلمہ کے تمام فرقوں کے لیے قابل قبول ہے۔ زاہد ملک صاحب اپنی گرانقدر مرتبہ کتاب "مضامین قرآن حکیم" میں اس ترجمہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

۱۔ [illegible] ص ۵۔

"مولانا فتح محمد جالندھری کا ترجمہ "فتح الحمید" کے نام سے مشہور ہے اور سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں امرتسر میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں "نورِ ہدایت" کے نام سے جالندھر سے بھی شائع ہوا۔ پاکستان میں اس کی اشاعت کے حقوق تاج کمپنی کے پاس ہیں جس نے اس ترجمے کو بڑے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔ ممکن ہے زبان اور محاورے کے تغیر کے سبب مولانا فتح محمد جالندھری کے ترجمے میں بعض الفاظ اور ترکیبات موجودہ زمانے میں قدرے نامانوس محسوس ہوں اور اس طرح ترجمے کی روانی متاثر ہوتی نظر آئے۔ لیکن میں نے اس ترجمے کو ترجیح دو وجوہات سے دی ہے۔ پہلی یہ کہ یہ ترجمہ مستند اور معتبر ہے اور دوسری یہ کہ یہ ترجمہ اور اس کے مترجم امتِ مسلمہ کے تمام فرقوں اور طبقوں کے نزدیک ایک غیر متنازعہ شخصیت ہیں۔ مولانا فتح محمد جالندھری ایک شریف النفس انسان تھے۔ وہ ایک سیدھے سادے مسلمان تھے۔ جس طرح کہ ہم سب کو ہونا چاہیے۔ ان پر کوئی خاص چھاپ نہیں لگائی جا سکتی۔"[1]

نمونہ ملاحظہ ہو:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (الفاتحہ ۱ تا ۷)

---

[1] مضامین قرآن مجید — زاہد ملک

(ترجمہ) سب طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ بڑا مہربان نہایت رحم والا۔ انصاف کے دن کا حاکم۔ (اے پروردگار) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہم کو سیدھے رستے چلا۔ ان لوگوں کے رستے جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا ہے۔ نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا ہے۔ اور نہ گمراہوں کے۔[1]

ف ۲ پر تفسیری حاشیہ مندرجہ ذیل ہے۔

(حاشیہ) یہ سورت خدا نے بندوں کی زبان میں نازل فرمائی ہے مقصود اس بات کا سکھانا ہے کہ وہ اس طرح خدا سے دعا کیا کریں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللّٰہ اور سب سے افضل دعا الحمد للّٰہ الخ۔

(۷) مولانا احمد رضا خان بریلوی (۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء تا ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء)

مولانا احمد رضا خان صاحب یوپی کے ایک بڑے شہر بریلی میں پیدا ہوئے۔ قدرت نے ذہن رسا عطا فرمایا تھا۔ لہٰذا تھوڑی عمر میں تکمیلِ علوم کر کے مسند رشد و ہدایت پر فائز ہو گئے۔ تصنیف و تالیف کا ملکہ بھی قدرتی تھا اس لیے مدت العمر قلم چلتا رہا۔ مختلف علوم میں بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ شاعرانہ ذوق بھی نہایت ستھرا تھا لیکن زیادہ توجہ نعت گوئی کی جانب تھی۔ اس لیے بے شمار نعتیں لکھیں جو نہایت مقبول ہوئیں۔ ۱۳۳۰ھ میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" اس کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۳۰ھ

---

1. قرآن الحکیم مع ترجمہ فتح الحمید، تاج کمپنی لمیٹڈ، ص ۲

معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ترجمہ اردو کے اچھے تراجم میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر تو اس کے مطلب کو دوسرے ترجموں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ پہلا مرتبہ یہ ترجمہ مراد آباد مطبع نعیمی۔ اہل سنت سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مکمل یا جزوی طور پر بار بار شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ
الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ
وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى
فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓىِٕكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ

(البقرہ ۲۷۳ - ۵ ، ۲)

(ترجمہ) وہ جو سود کھاتے ہیں قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسے کھڑا ہوتا ہے وہ جسے آسیب نے چھو کر مخبوط بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا بیع بھی تو سود ہی کے مانند ہے۔ اور اللہ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود۔ تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا تو اسے حلال ہے جو پہلے لے چکا اور اس کا کام خدا کے سپرد ہے[1] اور اب جو ایسی حرکت کرے گا تو وہ دوزخی ہے۔ وہ اس میں مدتوں رہیں گے[2]۔

ترجمہ کی جو عبارت واوین میں دی گئی ہے اس پر مفتی احمد یار خان نے تفسیری حاشیہ میں بتایا ہے کہ:

(۱) اگر سود کو حلال جان کر کھا لیا تو کافر ہوا اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہے گا۔ اگر حرام جان کر کیا تو فاسق۔ بہت عرصہ دوزخ میں رہے گا۔

---

(۱) [illegible] خزائن العرفان [illegible]

(۸) شیخ الہند مولانا محمود الحسن (۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء تا ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء)

مولانا محمود الحسن کا جدی وطن دیوبند تھا۔ آپ کے والد بانیٔ دار العلوم دیوبند کے رفیق کار اور دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے مستقل رکن مولانا ذوالفقار علی تھے۔ مولانا محمود الحسن کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ آپ دار العلوم کے سب سے پہلے طالب علم اور بانی دار العلوم مولانا قاسم نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ قاسمی علوم کا عالم اسلام میں سب سے زیادہ فیضان آپ کے ذریعہ پہنچا۔ آپ کے درس سے بے شمار علماء فیضیاب ہوئے۔ آپ کے ارشاد و تلقین تدریس سے لوگوں کو راہِ ہدایت دکھائی۔ آپ نے اپنے جذبۂ جہاد کے ذریعہ ملت مسلمہ کی جو خدمت انجام دی وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گی۔ آپ کی تصانیف کی تعداد اگرچہ کم ہے لیکن جملہ تصانیف قدر و جواہر میں تولنے کے قابل ہیں۔ ان ہی میں آپ کا ترجمہ قرآن کریم ہے۔ یہ ترجمہ مولانا نے لوگوں کے بے حد اصرار پر کیا ہے۔ پہلے تو اکثر مستند تراجم کا مطالعہ کیا، پھر اس مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ تحت اللفظ اور بامحاورہ ترجموں میں عوام کے لیے بامحاورہ ترجمہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں "ہر چند ترجمہ تحت اللفظی میں بعض خاص فائدے ہیں مگر ترجمہ سے جو اصلی فائدہ اور بڑی غرض ہے وہ یہ کہ ہندوستانیوں کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ یہ غرض جس قدر بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہو سکتی ہے تحت لفظی ترجمہ سے کسی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ جو بامحاورہ ترجمہ کے بانی اور امام ہیں انھوں نے بامحاورہ ترجمہ کو اختیار فرمانے کی یہی وجہ بیان کی ہے۔"[1]

---

[1] مقدمہ ترجمہ قرآن مجید۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن۔ دار التصنیف لمیٹڈ شاہراہِ لیاقت۔ صدر کراچی۔ ص ۱

یہ فیصلہ کرنے کے بعد مولانا نے بامحاورہ ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا اور
حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو معیار بنا کر اس کی روشنی میں ترجمہ کیا۔
لیکن حضرت شاہ صاحب کے زمانہ کے جو الفاظ متروک ہو چکے تھے ان کی
جگہ الفاظ مستعمل رکھ لیے اور جہاں حضرت شاہ صاحب نے اختصار و اجمال
سے کام لیا تھا وہاں کسی قدر وضاحت فرما دی۔ اس طرح ترجمہ نہایت عام فہم
ہو گیا۔ اور نہ صرف مولانا کے زمانہ میں پسند کیا گیا بلکہ آج بھی مقبول عام
ہے۔ مولانا محمود الحسن صاحب کا یہ ترجمہ پہلی بار ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں
مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد متعدد ایڈیشن نکلے۔ اس وقت
ہمارے پیش نظر "دار التصنیف لمیٹڈ۔ شاہراہ لیاقت صدر کراچی" کا شائع
کیا ہوا نسخہ ہے، جو بڑے اہتمام اور احتیاط سے شائع کیا گیا ہے۔ نمونہ
ملاحظہ ہو:

الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ
الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ
حَرَّمَ الرِّبٰوا ۝ (البقرہ ۲۷۵)

(ترجمہ) جو لوگ کھاتے ہیں سود، نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح
اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس کھو دیے ہوں جن نے لپٹ
کر۔ یہ حالت ان کی اس واسطے ہو گی کہ انھوں نے کہا کہ سوداگری
بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے سوداگری کو
اور حرام کیا ہے سود کو۔ [1]

۱۔ مولانا محمود: قرآن مجید (مع ترجمہ و تفسیر) مترجم، ناشر دار التصنیف لمیٹڈ
شاہراہ لیاقت۔ صدر کراچی ص ۵۶

ف۔۲۔ اس پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے حسب ذیل تفسیری حاشیہ دیا ہے۔
”یعنی ربوٰ کھانے والے قیامت کو قبروں سے اٹھیں گے جیسے آسیب زدہ
و مجنون، اور یہ حالت اس واسطے ہوگی کہ انھوں نے حلال و حرام
کو یکساں کر دیا ہے، اور صرف اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود
ہوتا ہے دونوں کو حلال کہا، حالانکہ بیع اور ربوٰ میں بڑا فرق ہے
کہ بیع کو حق تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام (فائدہ) بیع
میں جو نفع ہوتا ہے وہ مال کے مقابلہ میں ہوتا ہے جیسے کسی نے
ایک درہم کی قیمت کا کپڑا دو درہم کو فروخت کیا، اور سود وہ ہوتا
ہے جس میں نفع بلا عوض ہوتا ہے۔ جیسے ایک درہم خرید لیا ہے۔ وغیرہ“

(۹) مولانا اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء تا ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء)

قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے مشہور فاروقی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۰۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے اور اپنے والد اور اساتذہ سے اجازت لے کر اسی سال بعہدۂ صدر مدرسی مدرسہ فیض عام کانپور چلے گئے کچھ عرصہ اس میں کام کیا لیکن اراکین مدرسہ سے اختلاف کی وجہ سے مستعفی ہو گئے اس کے بعد ایک نئے قائم شدہ مدرسہ جامع العلوم میں صدر مدرس مقرر کیے گئے۔ اس طرح چودہ سال کانپور میں گزار کر ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں اپنے مرشد حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے حکم سے ملازمت ترک کر کے وطن واپس آگئے اور باقی زندگی خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں قیام فرما کر رشد و ہدایت، اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ ملت مسلمہ کو فیض پہنچاتے رہے۔ آپ مسلمانوں کی پوری تاریخ کے کثیر التصانیف بزرگوں میں سے تھے۔ اپنی تصانیف کے ذریعہ دینی علوم کو گھر گھر پہنچا دیا۔ ۸۰۰ رسالہ

عورتوں، بوڑھوں اور بچوں سب نے فیض حاصل کیا اور اب بھی یہ تبلیغ پاکستان اور ہندوستان میں جاری ہے آپ کا ترجمہ قرآن مجید بھی بہت مقبول ہوا۔ اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ لفظی نہ ہونے کے باوجود نہایت مختصر ہے۔ زبان نہایت صاف، شستہ اور رواں ہے۔ جہاں کہیں جملوں میں رابطہ پیدا کرنے کے لیے کوئی زائد لفظ استعمال کیا ہے اس کو قوسین میں لکھ دیا ہے۔ اس طرح یہ قرآن کی عبارت سے تجاوز ہوتا ہے اور نہ قارئین کو قرآن فہمی میں کوئی دقت پیش آتی ہے۔ عام تلاوت کے لیے "بیان القرآن" سے علیحدہ جو متن شائع کیا جاتا ہے اس کے ساتھ مختصر تفسیری حواشی دے دیے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے کم استعداد لوگوں کو بھی قرآن کریم کے معنی اور مفہوم کو سمجھنے میں کافی سہولت ہو جاتی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے بھی اس ترجمہ کی تعریف کی ہے۔ انہی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے یہ ترجمہ برصغیر میں بے حد مقبول ہوا۔ اور اب تک اس کے لاتعداد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا
وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ
فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۞

(بنی اسرائیل ۳-۴)

(ترجمہ) اے ان لوگوں کی نسل جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ سوار کیا تھا۔ وہ نوح بڑے شکر گزار بندہ تھے۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ بات بطور پیشین گوئی بتلا دی تھی کہ تم سرزمین شام میں دو بار خرابی کرو گے۔ ف ۵ اور بڑا زور چلانے لگو گے ف ۶

(حاشیہ) ف ۵۔ ایک بار شریعت موسوی کی مخالفت۔ دوسری بار شریعت عیسوی کی مخالفت۔

ف ۶۔ یعنی زیادتیاں کروگے۔ پس لَتُفْسِدُنَّ میں حقوق اللہ کے اور لَتَعْلُنَّ میں حقوق العباد کے ضائع کرنے کی طرف اشارہ ہے[1]

(۱۰) مولانا احمد علی لاہوری (متوفی ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء)

مولانا احمد علی لاہوری عالم دین، مفسر قرآن اور عالم باعمل تھے۔ وہ ملت اسلامیہ کے اس دورِ انحطاط میں سلف صالحین کا ایک اچھا نمونہ اور سادگی کا پیکر تھے۔ انہوں نے کافی عرصہ تک مولانا عبید اللہ سندھی کے درسِ قرآن میں شرکت کی اور وہاں سے علم آیات و سور کے باہم ربط و تعلق کا دقیق اور نازک علم سیکھا اور اس علم میں اتنی مہارت حاصل کی کہ کچھ عرصہ بعد فیض پہنچانے لگے۔ ۱۳۴۲ھ میں انجمن خدام الدین کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا احمد علی اس کے امیر مقرر ہوئے۔ ان کے بقول انجمن کا مقصد اشاعت کتاب و سنت رہا ہے اور اشاعت کے کئی شعبے تھے۔

(۱) درسِ عام جو ہر روز صبح کو ہوتا تھا۔

(۲) نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کا درس جو ہر روز [illegible] مغرب ہوتا تھا۔

(۳) فارغ التحصیل علماء کو قرآن حکیم کی تفسیر ایک خاص انداز سے پڑھائی جاتی تھی۔

(۴) دورۂ تفسیر رمضان، شوال اور ذی قعدہ کے تین مہینوں میں ختم کیا جاتا تھا۔

---

[1] علی، قرآن الحکیم (تاج کمپنی) ۱۹۵۳ء - ص ۳۱۷

اس نظام کے تحت مولانا احمد علی عرصہ دراز تک نہایت باقاعدگی سے خلق خدا کو فیض پہنچاتے رہے اور دور دراز سے آکر تشنگان علم آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے اور علوم قرآنی کی بے بہا دولت سمیٹ کر اپنے گھروں کو واپس ہوتے تھے۔

انجمن خدام الدین نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ مولانا احمد علی نے جو اہم مضامین اپنے درسوں میں بیان کیے کتابی شکل میں لکھ کر ان کی اشاعت عام کی جائے۔ انہوں نے کلام پاک کے مضامین کو حسب ذیل طریقے پر مرتب کیا:

(۱) ہر سورۃ کا عنوان

(۲) ہر رکوع کا خلاصہ

(۳) اس خلاصہ کا ماخذ

(۴) ہر سورۃ کی تمام آیات کا ربط

(۵) مناسب موقعوں پر واقعات جزئیہ سے قواعد کلیہ کا استنباط

ترتیب دینے کے بعد مولانا نے یہ مسودہ ہندوستان بھر کے چوٹی کے علماء کے سامنے پیش کیا تاکہ وہ اسے کتاب و سنت کی روشنی میں جانچ کر دیکھیں کہ کوئی چیز خلاف مسلک اسلام تو نہیں۔ ان علماء میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسے جید علماء کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ ان سب علماء نے قرآن حکیم کے مطالب و مضامین کی اس نظم و ترتیب کو بے حد پسند کیا۔ اور نہایت اچھی تقریظیں لکھ کر بھیجیں۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد قرآن کریم کو شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے ترجمے کے ساتھ چھاپنے کا اہتمام کیا گیا۔ اور مولانا احمد علی کے مرتبہ مطالب و مضامین اور فوائد موضح القرآن کو حاشیے میں رکھا گیا۔ کلام مجید کے اس نسخے کی اشاعت اول ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۴ء

ہیں ہوئی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ چھپا۔ اس کی ترتیب یہ رکھی گئی۔

(۱) علما کی آراء ریفا

(۲) فہرست مضامین قرآنیہ

(۳) قصص القرآن

(۴) حقوق العباد

(۵) قرآن کا متن، ترجمہ

حاشیہ موضح القرآن، خود مولانا احمد علی کے حواشی اور پہلے آیات اور آخر میں بقایا حواشی موضح القرآن۔[1]

قرآن کریم کے اس نسخے کو ہر طرح مفید اور قابل فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یقین ہے کہ اس نسخے کو بغور مطالعہ کرنے سے عوام بھی بغیر کسی کی مدد کے قرآن حکیم کی تعلیمات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

چونکہ ترجمہ اور بیشتر حواشی شاہ عبد القادر محدث دہلوی کے دیے گئے ہیں اس لیے ان کے نمونے دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کی جگہ ایک صفحہ پر درج آیات کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک نئی چیز بھی ہے اور بے حد مفید بھی ملاحظہ ہو۔ سورۃ احزاب پارہ وَمَنْ یَّقْنُتْ کی آیات ۳۱ تا ۳۳ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (۳۱) اگر تم نیکی کرو گی تو اس کا اجر بھی تمہیں دگنا ملے گا۔ (۳۲) اے ازواج مطہرات تمہارا درجہ دوسری عورتوں کا سا نہیں ہے۔ اگر کوئی حجاب کے اندر سے بھی بات پوچھے تو ذرا درشتی سے بات کرو تاکہ کسی کے دل میں وسواس شیطانی نہ آنے پائے (۳۳) اطمینان سے گھر میں بیٹھی رہو۔ زمانہ جاہلیت کی طرح بے پردہ باہر مت نکلو اور یاد الٰہی میں معروف

---

۱ ریاض القرآن کی تاریخ، مرتبہ، صفحہ ۳۵ تا ۲۶ (الف) (لیبل) (ڈبل) ص ۱

دیوے۔ (۲۲) قرآن حکیم کی تلاوت گھروں میں بیٹھ کر کیا کرو۔[1]

(۱۱) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء — ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی عصر حاضر کے بلند پایہ مفکر تھے۔

ان کا وطن دہلی تھا اور مولد اورنگ آباد دکن جہاں وہ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ مولانا عبدالسلام نیازی سے فیض حاصل کیا۔ خداداد ذہانت کی بدولت بہت تھوڑی عمر میں مختلف علوم میں تبحر حاصل کر لیا۔ ان کی قابلیت و صلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ۱۵ سال کی عمر میں صحافت کا آغاز کیا۔ مختلف اخبارات سے وابستہ رہے۔ ان میں مدینہ بجنور، تاج جبلپور، مسلم اور الجمعیت دہلی کے نام قابل ذکر ہیں۔ کچھ دن بھوپال میں رہ کر نیاز فتحپوری کے ساتھ بھی کام کیا۔ پھر حیدر آباد دکن سے ترجمان القرآن جاری کیا۔ جس کو کچھ عرصہ بعد علامہ اقبال کے مشورہ سے پنجاب لے آئے اور پنجاب میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۱ء میں لاہور میں جماعت اسلامی کی تشکیل کی اور ۱۹۴۲ء میں اس کا مرکز لاہور سے پٹھان کوٹ منتقل کیا گیا۔ جماعت اسلامی کا اثر بہت جلد ملک کے طول و عرض میں قائم ہو گیا۔ پاکستان بننے کے بعد جماعت اسلامی اور ترجمان القرآن کو پھر لاہور منتقل کرنا پڑا اور یہی مستقل طور پر ان دونوں کا مرکز بن گیا۔ پاکستان بننے کے چند سال بعد جماعت اسلامی نے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کیا جس کی وجہ سے مولانا مودودی کو قید و بند کی صعوبات برداشت کرنا پڑیں۔ یہاں تک کہ

---

[1] اتقان فی علوم القرآن مکمل ایڈیشن ص ۷۸۸

ایک مرتبہ سزائے موت بھی سنا دی گئی لیکن ان کے قدم میں کسی وقت بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ وہ مرتے دم تک نہایت تندہی اور خلوص سے کام کرتے رہے۔ تقریریں بھی کرتے، کتابیں بھی لکھتے اور سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ اتنی محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحت خراب ہو گئی۔ دن بدن حالت گرتی چلی گئی۔ علاج کے لیے امریکہ گئے لیکن ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو وہیں داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کے جسد خاکی کو لا کر اچھرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا مودودی کے خیالات و نظریات سے بہت لوگوں کا اختلاف رہا اور اب بھی ہے لیکن ان کی اعلیٰ صلاحیت و قابلیت اور ان کے خلوص و لگن سے سوائے ہٹ دھرم انسانوں کے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ اسلام کا صحیح تصور رکھتے تھے۔ اور ایک اعلیٰ پایہ کے مصنف، مفکر اور مقرر تھے۔ انکی تحریر و تقریر میں بڑی یکسانیت تھی۔ دونوں میں کوئی الجھاؤ اور ژولیدگی نہیں پائی جاتی۔ جیسا بولتے تھے ویسا ہی لکھتے تھے۔ وہ اپنی تحریر و تقریر سے سامعین اور قارئین کو پوری طرح مطمئن کر دیتے تھے۔ ان کی تصانیف نہایت گراں قدر ہیں۔ لیکن جس چیز سے ان کو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوئی وہ ان کی تفسیر قرآن ہے جو تفہیم القرآن کے نام سے چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اسی تفسیر کے لیے جو ترجمہ تفہیم القرآن میں شائع کیا گیا ہے اس کو مولانا نے ۱۹۶۳ء میں علیحدہ متن قرآن کے ساتھ ایک جلد میں شائع کر دیا۔ اور ساتھ میں مختصر حواشی دیے جو ایسے لوگوں کے لیے نہایت مفید ہے جو تفہیم القرآن کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ اس نسخے میں ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ داہنی صفحہ پہ قرآن کا متن ہے اور بائیں صفحہ پر ترجمہ اور حواشی۔ چونکہ مولانا کی تحریر نہایت سلجھی ہوئی، شگفتہ اور دلنشین ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم کے ترجمہ میں بھی وہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔

اس لیے اس ترجمہ کو پڑھ کر قرآن فہمی کے ساتھ ساتھ انسان کے دل و دماغ پر نہایت اچھا سا اثر بھی قائم ہوتا ہے۔ نمونے کے لیے دو تین آیات قرآنی مع ترجمہ اور حواشی پیش ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ یُرْسَلُ عَلَیْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ۬ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ (الرحمٰن ۳۳ تا ۳۶)

(ترجمہ) اے گروہ جن و انس اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لیے بڑا زور چاہیے۔ اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے (بھاگنے کی کوشش کرو گے تو) تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ اے جن و انس تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کا انکار کرو گے[1]

(حاشیہ) زمین اور آسمان سے مراد ہے کائنات یا بالفاظ دیگر خدا کی خدائی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی گرفت سے بچ نکلنا تمہارے بس میں نہیں ہے جس بازپرس کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے اس کا وقت آنے پر تم خواہ کسی جگہ بھی ہو بہرحال پکڑ لائے جاؤ گے۔ اس سے بچنے کے لیے تمہیں خدا کی خدائی سے بھاگ نکلنا ہو گا۔ اور اس کا بل بوتا تم میں نہیں ہے۔ اگر ایسا گھمنڈ تم اپنے دل میں رکھتے ہو

---

[1] ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ص ۱۳۵۶، ۱۳۵۷

تو اپنا نیو رنگ کر دیکھو لو۔[1]

(۱۲) خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء تا ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء

دہلی کے رہنے والے اور خواجہ میر دردؔ کی اولاد میں تھے۔ اسی لیے ان کو میر دردؔ کی یادگار کہا جاتا ہے۔ ان کا قیام میر دردؔ کی بارہ دری میں تھا لیکن اس بارہ دری کے بارے میں شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں: "خواجہ میر دردؔ کی بارہ دری کسی زمانے میں بارہ دری ہو تو ہو، ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے اس بارہ دری میں چند چھوٹے گھروندے ہی دیکھے۔ ان ہی گھروندوں میں سے ایک میں خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی رہتے تھے۔" بہرحال اسی گھروندے میں ۱۸۶۵ء میں خواجہ ناصر نذیر فراق پیدا ہوئے اور زندگی کی ۶۸ بہاریں دیکھ کر ۱۹۳۳ء میں رہگرائے عالم بقا ہو گئے۔ وہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے۔ انھیں دہلی کی عورتوں کی زبان اور محاورے پر عبور تھا۔ بڑی پیاری زبان لکھتے تھے۔ مخزن کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں تھے۔ جب مخزن بند ہو گیا تو انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ پھر جب شاہد احمد دہلوی نے ۱۹۳۰ء میں ماہنامہ ساقی جاری کیا تو اس کے لیے لکھنے لگے اور دم آخر تک لکھتے رہے۔

انھوں نے خاندان کی کچھ عورتوں کے اصرار پر شہر دہلی کی بیگموں اور شریف زادیوں کی اچھوتی بولی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور اس کا نام عروس القرآن رکھا۔ فراق صاحب نے ترجمہ کرنے کی وجہ خود بتائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۲ھ میں ان کا چھوٹا نواسا ڈھائی سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس روز

---

1 ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی (ادارہ ترجمان القرآن لاہور) ص ۱۳۵۵

خاندان، برادری اور غیر برادری کی بہت سی عورتیں بچے کے پڑھنے کے لیے آتیں۔ تو تین دن کے ایک بچے ہو چکی تھی لیکن اکثر عورتیں رات گئے تک رہتیں انہوں نے فراق صاحب کے صاحبزادے نامور تخلیق نگار کے ذریعہ ان کو بڑی حویلی میں بلا کر بڑے اصرار سے کہا کہ "آپ ہماری زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کر دیں تاکہ ہم بھی احکام خداوندی سے واقف ہو سکیں"۔ بڑی رد و کد کے بعد فراقی صاحب نے آمادگی ظاہر کی۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف تراجم کا مطالعہ کرکے یہ نتیجہ نکالا کہ "واقعی ایک ایسے ترجمہ کی بے حد ضرورت ہے جو عورتوں کے لیے قابل فہم ہو۔ انہوں نے ترجمہ کا کام شروع کیا اور ۸ جمادی الاول ۱۳۴۴ھ مطابق ۲۶ نومبر ۱۹۲۵ء کو جمعرات کے دن یہ ترجمہ مکمل کر دیا۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس ترجمے میں جتنے عربی فارسی کے الفاظ ترک کرکے وہ الفاظ اور محاورے استعمال کیے ہیں جو دلی کی شریف زادیاں بولتی ہیں۔ مثلاً "اللہ" کی جگہ "میاں"، "تبارک السلام" کی جگہ "دھان پان"، "بے باک" کی جگہ "نڈر" وغیرہ۔

غرض یہ ترجمہ اپنی نوعیت کا منفرد ہے، اس لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔[1]

(۱۳) سیماب اکبر آبادی (۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء تا ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء)

ان کا اصلی نام عاشق حسین اور تخلص سیماب ہے۔ وطن و مولد آگرہ تھا۔ وہیں وہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ کسی مقامی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا، لیکن ابھی ایف اے (انٹرمیڈیٹ) میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم ختم کرکے ملازمت کرنی پڑی۔ ۱۸۹۹ء میں داغ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور شعر و شاعری کی جانب انہماک بڑھا۔

۱۔ عروس القرآن، مطبوعہ محبوب المطابع الیکٹرک پریس دہلی، ص ۲ تا ۲۔

وہ تصنیف و تالیف کی جانب بھی بچپن ہی سے رجحان تھا۔ لہٰذا نثر و نظم کی کتابیں بڑے پیمانے پر لکھنے کا آغاز کر دیا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر صد ہا کتابیں لکھیں۔ شاعری میں اگرچہ ان کا میلانِ طبیعت نظم کی جانب تھا۔ لیکن دوسری اصناف میں بھی انھوں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ سعادت بھی عطا فرمائی کہ اردو میں پورے قرآن کا منظوم ترجمہ "وحی منظوم" کے نام سے کیا۔ اس کو ان کے لائق صاحبزادے مظہر صدیقی نے سیماب اکیڈمی کی جانب سے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ زبان نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے اور مفہوم بھی قرآن کریم کے منشاء کے مطابق ہے۔ سورہ فاتحہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

بِسْمِ اللّٰہِ — الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں) — جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ — رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہیں سزاوارِ خدائے (پاک) ساری خوبیاں — (جو ہے) رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ

ہے وہی انصاف کے دن کا مالک (بے گماں)

اِیَّاکَ نَعْبُدُ — وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

اے الٰہی ہم تو کرتے ہیں تیری بندگی — اور رہتے ہیں تجھی سے طالبِ امداد بھی

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ — صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ

یا الٰہی ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا — ان کا رستہ جن پہ انعام و کرم تیرا ہوا

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ — وَلَا الضَّآلِّیْنَ

(ہاں) نہ ان کا جن پہ غضب کی ہے (نگاہ) — اور نہ ان کا راستہ جو بھی ہیں بھٹکے گم کردہ راہ [1]

۱۔ [illegible] ۱۹۸۱ء کراچی ص [illegible]

(۱۴) مجید الدین احمد اختر زبیری لکھنوی

اختر زبیری صاحب کا جدی وطن لکھنؤ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی چلے آئے اور ملیر کینٹ میں رہائش اختیار کر لی۔ شعر گوئی کا آغاز ہندوستان میں ہی ہو گیا تھا۔ اگرچہ شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی لیکن اختر صاحب کا میلان طبع شروع ہی سے تقدس کی جانب تھا۔ انہیں بھی خصوصی توجہ حمد، نعت اور مناقب سلف صالحین کی طرف تھی۔ اسی سلسلہ میں ایک طویل نظم "شہید ستم" حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ شہادت پر لکھی۔ اس نظم کے حصہ حمد کو سورہ رحمٰن کے مفہوم سے مربوط کیا گیا تھا۔ اسی چیز نے اختر صاحب کے ذہن کو اس جانب منتقل کیا کہ پورے قرآن کریم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے۔ ان کے ایک دوست مولانا محمد ادریس نے ان کے اس خیال کی تائید کی۔ یہ واقعہ جنوری ۱۹۴۳ء کا ہے جب اختر صاحب کا عارضی قیام کانپور میں تھا۔ مولانا ادریس صاحب کے اصرار پر انہوں نے اسی شب سے اس نیک کام کا آغاز کر دیا لیکن جلد ہی یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور کراچی پہنچنے کے بعد مارچ ۱۹۴۸ء میں پھر شروع ہوا۔ مگر دیگر مصروفیات کے باعث کام کی رفتار سست رہی۔ اور بالآخر کار ۲۳ فروری ۱۹۶۵ء کو اس کے مکمل ہونے کی نوبت آئی۔ طباعت و اشاعت کا مرحلہ اس کے بھی ۱۲ سال بعد ۱۹۷۷ء میں طے ہوا۔ اس وقت یہ منظوم ترجمہ "سحر البیان" کے نام سے منظر عام پر آیا اور بے حد پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ متعدد علماء نے ترجمہ کی بے حد توصیف و تعریف کی۔ قاری محمد طیب مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"اختر زبیری صاحب نے ترجمہ قرآن کی نظم میں یہی کمال دکھایا ہے۔ وہ جامع اضداد یعنی سہل ممتنع ہے ...... قرآن پاک کی ترجمانی انتہائی تقیید اور پابندی چاہتی ہے کہ الفاظ بھی محدود

او رمحتاط ہوں اور مفہوم بھی ذرہ برابر ادھر اُدھر نہ ہونے پائے۔

......زبیری صاحب نے ان دونوں متضاد چیزوں کو ملانے میں غیر معمولی طباعی اور موزونیت ذکاوت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے منظوم ترجمہ میں پابندی تو یہ ہے کہ ترجمہ تقریباً تحت اللفظ اور شاعرانہ آزادی یہ کہ محاورہ اور کلام کی بندش بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔"

مفتی محمد شفیع مرحوم فرماتے ہیں:

......ان کی قادر الکلامی کی داد دینی پڑتی ہے کہ جس احتیاط کو آپ نے استعمال کیا وہ درحقیقت آپ ہی کا حصہ ہے۔ نظر کردہ مقامات میں کہیں مجھے ایسی صورت نظر نہیں آئی کہ معنوی حیثیت سے ارشادات قرآنی میں کوئی ادنیٰ فرق بھی پڑا ہو۔"

مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سب سے بڑی بات جو مجھے اس ترجمہ میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآنی منشاء کلام اور مضمرات و مکنونات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جو ذوق قرآن فہمی کی بین دلیل ہے۔"

یہ چند آراء پیش کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نمونے کے لیے قاری محمد طیب مرحوم کے تحریر کردہ "تعارف" سے ایک اقتباس دے دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

بیان توحید کے سلسلے میں اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا ترجمہ دیکھیے کہ نظر بظاہر سہل ہے اور بحقیقت ممتنع۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّہَارِ

یقیناً آسمانوں میں اور زمینوں کے بنانے میں، نیا ادھر پر شام و صبح کے آنے جانے میں،

وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ

سفینوں میں جو بہتے رہتے ہیں دریا کے سینے پر برائے نوع انسان سازو برگ منقولہ لیکر

اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا

اور اس پانی سے جس کو آسمان سے رب نے برسایا زمین کو اس نے بخشی جس کے باعث پھر حیات

وَبَثَّ فِیْہَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ (البقرہ ۱۶۴)

اور اس پر اس نے سب اقسام کے حیوان کیے پیدا [۱]

(۱۵) آغا شاعر قزلباش دہلوی (۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء تا ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ء)

ان کا اصل نام مرزا مظفر علی بیگ خاں تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاعری میں داغ دہلوی سے تلمذ تھا۔ استاد سے والہانہ شیفتگی تھی۔ وہ بیک وقت شاعر، نثر مجلہ نگار اور افسانہ نویس تھے۔ انہوں نے افصح الکلام کے نام سے قرآن مجید کے چند سیپاروں کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔

(۱) پارہ سیقول کا منظوم ترجمہ طبع اول دہلی رزاقی مشین پریس سے ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

(۲) اردو ترجمہ منظوم پارہ اوّل۔ لاہور۔ راجپوت پرنٹنگ پریس ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں چھپا (جزوی)

(۳) منظوم اردو ترجمہ، پارہ دوم۔ حیدرآباد دکن۔ رزاقی پریس

---

[۱] منظوم ترجمہ قرآن مجید "سحر البیان" (آغا قزلباش دہلوی)

۱ تاریخ طبع ندارد (جنوری)

قرآن مجید کے ترجموں کے علاوہ بعض منظوم ترجموں کا ذکر نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں کیا ہے۔ بابائے اردو نے قدیم اردو (ص ۱۲۷) میں سورہ رحمٰن کی چند آیتوں کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے۔ جس نسخے سے یہ ترجمہ نقل کیا گیا ہے وہ ناقص الطرفین تھا اس لیے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب اس کے سنہ کا تعین تو نہیں کر سکے البتہ انھوں نے اس کو گیارھویں صدی ہجری کے تراجم میں شامل کیا ہے۔ یہ ترجمہ دکنی اردو میں ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

الرحمٰن ۔ علم القرآن ۔ خلق الانسان علمہ البیان

ترجمہ: اے لوگو! اللہ کو دیکھو ان جن ۔ جس کا اچھا نام رحمٰن

سکھایا ہے قرآن ۔ جن سرجا ہے انسان

الشمس والقمر بحسبان ۔ والنجم والشجر یسجدان

سکھلایا ہم کو سب ہی بیان ۔ چاند سورج سوں حساب پچھان

جھاڑ پیڑ بھی تمہیں سیجان ۔ سجدہ کرتے ہیں اس کو دو تان

والسماء رفعہا ووضع ۔ المیزان الا تطغوا فی المیزان

ترجمہ: اونچا کیا ان اسمان ۔ رکھے ہے گی ان میزان

اپنے دل سوں حق پچھان ۔ کم زیادہ مت کو جان

واقیموا الوزن بالقسط ۔ ولا تخسروا المیزان (الرحمٰن ۶-۹)

ترجمہ: مجھ تول سو پورا تول ۔ جو مول سو پورا مول

ڈنڈی ول بد مجھ بھول ۔ دل نہ کیجو تول العدل

---

۱ قرآن کریم کے اردو تراجم (کتابیات) ص ۳۲

۲ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ص ۱۴۱ اور ص ۶۶

اب تک چند تراجم اور ان پر دیے گئے حواشی پر کسی قدر تفصیل سے اظہار رائے کیا گیا ہے۔ آئندہ چند ترجموں پر مختصر نوٹس دیے جا رہے ہیں، چونکہ اردو میں بہت بڑی تعداد میں ترجمے ہوئے ہیں اس لیے سب پر رائے زنی کرنا مشکل ہے۔ تاہم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ سب ایک معیار کے نہیں ہیں۔ کسی میں متن کے زیادہ قریب رہنے کی کوشش کی گئی ہے اور کسی میں اردو محاورہ کا خیال رکھتے ہوئے کسی قدر صراحت سے کام لیا گیا ہے تاکہ کم پڑھے لکھے لوگوں کو قرآن کا مفہوم سمجھنے میں سہولت رہے۔ مزید جن ترجموں کا مختصر ذکر کیا جا رہا ہے ان میں تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری کے ترجمے شامل ہیں۔

(۱) محمد عبدالسلام عباسی بدایونی — ان کے ترجمہ کا نام "زاد الآخرت" ہے۔ اس نام سے ۱۲۴۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس ترجمہ کا تاریخی نام ہے۔ پہلے ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں — یہ ترجمہ منظوم ہے۔ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ اور دوسری روایت کے بموجب ۱۳ ہزار اشعار ہیں۔[1]

(۲) مولانا عبدالمقتدر بدایونی (م ۱۹۱۵ء) اردو ترجمہ، حاشیہ پر مختصر تفسیر ہے۔ اس کے ساتھ شیخ سعدی سے منسوب ترجمہ اور شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کا ترجمہ شامل ہے۔ یہ ترجمہ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں مطبع الوردی آگرہ

[1] قرآن کریم کے اردو تراجم (کتابیات) مرتبہ ڈاکٹر احمد خان۔ شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد ۱۹۸۷ء — ص ۲۲۱

سے شائع ہوا تھا۔[1]

(۳) مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء تا ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ء) اردو ترجمہ خیر المطابع لکھنؤ میں ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔[2]

(۴) حکیم نور الدین احمدی۔ (۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء تا ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) ترجمہ حامل متن ہے۔ یہ ترجمہ خیر خواہ اسلام پریس میں ۱۹۱۰ء میں چھپا تھا۔ مترجم نہ صرف قادیانی مذہب سے تعلق رکھتے تھے بلکہ بانی فرقہ کے خلیفہ اوّل تھا اس لیے ترجمہ میں قادیانی نقطۂ نظر کا ہونا ضروری ہے۔

(۵) نعیم الدین مراد آبادی (م ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء) خزائن العرفان فی ترجمان القرآن۔ برقی پریس مراد آباد سے ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ حاشیہ پر کنز الایمان فی ترجمان القرآن از مولانا احمد رضا خاں چھپا ہے۔

(۶) خواجہ حسن نظامی (۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸ء - ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ء) ترتیلی ترجمہ قرآن مجید۔ طبع اوّل۔ (اغانیت حسین جھجی) درگاہ نظام الدین اولیاء۔ دہلی ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء۔ ۲ جلدیں۔

________ دوسری مرتبہ ترجمہ ہمراہ قرآن کریم۔ اس میں حسن نظامی کی عام فہم تفسیر شامل نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ ترجمہ کئی بار چھپا۔[3]

1۔ ایضاً ص ۱۵۰: قرآن مجید کے اردو تراجم (جمیل نقوی) ص ۶۳

2۔ ایضاً ص ۱۱۰؛ ایضاً ص ۶۱

3۔ قرآن کریم کے اردو تراجم (مقتدرہ قومی زبان) ص ۷۲، ۷۳

(۷) عبدالماجد دریابادی (۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۱ء تا ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۷ء)

ترجمہ قرآن مجید۔ مفصل تفسیر کے ساتھ کئی مرتبہ شائع ہوا۔ ایک اشاعت میں جو ۱۹۳۰ء میں مولوی شاہ رفیع الدین، مولانا اشرف علی تھانوی اور عبدالماجد دریابادی کے ترجموں اور تفسیری حواشی کے ساتھ مطبع رسالہ پیشوا دہلی سے شائع ہوا۔ اس پر حسن نظامی کا مقدمہ ہے۔[1]

(۸) سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی (ولادت ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء) ترجمہ قرآن مسمی بہ کشف الرحمٰن دہلی۔ چوپڑی بک ڈپو ۱۹۵۷ء۔ کراچی مکتبہ رشیدیہ ۱۹۷۸ء دو جلد (پندرہ پندرہ پاروں کی دو جلدوں میں سلیس اور عام فہم اردو، حاشیہ پر مختصر تفسیری فوائد۔ تیسیر القرآن اور مفصل تفسیری فوائد تسہیل القرآن ۱۹۵۷ء اور ترجمہ کشف الرحمٰن ۱۳۷۵ھ[2]

(۹) مرزا بشیر الدین محمود (ولادت ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء) مرزا غلام احمد قادیانی کے صاحبزادے اور ان کے دوسرے خلیفہ تھے۔ انہوں نے قادیانی نقطۂ نظر سے قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور تفسیری حاشیے لکھائے۔ ترجمہ پہلی بار ۱۹۶۵ء میں اور نقوش پریس لاہور سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ نہایت اہتمام سے آرٹ پیپر پر چھپا ہے اور شروع میں مفتاح القرآن کی طویل فہرست شامل ہے۔[3]

— قرآن مجید کے اردو تراجم ص ۵۵

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم (جمیل نقوی) ص ۵۱ قرآن کریم کے اردو تراجم

۲۔ (مقتدرہ قومی زبان) ص ۳۳ اور ۴۴

۳۔ ایضاً ص ۵۵

(۱۰) اویس محمد ـــ ترجمہ قرآن منظوم جو کراچی سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔

(۱۱) مولانا حنیف ندوی ـــ ندوہ کے فارغ التحصیل تھے۔ لاہور میں قیام تھا۔ متعدد معیاری کتابیں لکھیں۔ ۱۹۷۶ء میں قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ کیا۔ حاشیہ پر تفسیر سراج البیان کا اضافہ کر کے ملک سراج الدین، پبلشر لاہور نے ترجمۃ القرآن الحکیم کے نام سے شائع کیا۔

(۱۲) سلیم الدین شمسی ـــ ترجمہ قرآن مع متن ـــ ہر صفحہ پر دو کالم بنا کر پہلے کالم میں قرآنی متن اور دوسرے پر ترجمہ دیا گیا ہے۔ مختصر حواشی ہیں۔

ـــ ترجمہ قرآن مجید (مع تفسیر و تشریح) مطبوعہ روزنامہ جنگ کراچی۔ ہفتہ وار ایڈیشن میں مسلسل (مولانا احتشام الحق تھانوی کی وفات کے بعد اس سلسلہ کو جاری رکھا ہے۔[1]

کئی ترجمے شیعہ علماء نے بھی کیے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) سید حسن لکھنوی مجتہد ـــ ترجمہ قرآن مجید لکھنؤ۔

(۲) نواب محمد حسین قلی خان ابن نواب مہدی قلی خان ترجمہ قرآن شریف (مع تفسیر) لکھنؤ مطبع اثنا عشری ۱۸۸۲ء

(۳) سید علی مجتہد بن سید دلدار علی ـــ ترجمہ مع تفسیر توضیح مجید فی تنقیح کلام الحمید۔ کلام مجید کا پہلا ترجمہ شیعی نقطۂ نظر سے۔[2]

---

1 ـ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۷۰

2 ـ قرآن مجید کے اردو تراجم (جمیل نقوی) ص ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۶۳

(۴۰) مقبول احمد دہلوی ——— تفسیر مطابق روایات آئمہ اہل بیت کرام مع ترجمہ۔ دہلی، مقبول پریس۔ ۱۹۲۱ء
ہمراہ قرآن کریم۔ یہ ترجمہ نواب حامد علی خاں رامپوری کے ایما پر ۱۳۳۵ھ میں کیا گیا۔ اس کے بعد دہلی اور لاہور سے بھی کئی بار چھپ چکا ہے۔[۱]

اردو تراجم پر مختصر تشریحی حواشی کا جائزہ

قرآن مجید کے جن اردو تراجم کا اس باب میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں بعض وہ ترجمے شامل ہیں جن پر مختصر حواشی دیے گئے ہیں۔ ان مترجمین میں سے کئی ایسے علماء بھی ہیں جنہوں نے متن قرآن کے ساتھ یا علیحدہ مفصل تفسیریں بھی لکھی ہیں۔ لیکن عوام کے لیے صرف تحت اللفظ یا بامحاورہ ترجمہ کر دیا ہے۔ دراصل قرآن کریم کا ایجاز یا اسلوب بیان اس امر کا متقاضی تھا کہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں یا اس زبان میں ان کی استعداد کم ہے ان کو بعض جگہ ربط آیات بتانے کے لیے، بعض موقعوں پر اجمال کو تفصیل میں بدلنے کے لیے، بعض اوقات کسی تشریح طلب امر کی توضیح و تفریح کے لیے اور بعض مقامات پر بعض ادبی نکات کو سمجھانے کے لیے مختصر الفاظ میں حاشیہ پر چند الفاظ یا جملے دے دیے جائیں تاکہ عوام کے لیے قرآن کریم کی بظاہر بے ربطی یا اس کا ایجاز و اختصار یا تلمیحات و استعارات ربط و تسلسل اور وضاحت و صراحت اختیار کر لیں۔ ہمارے علماء و فضلاء اور مترجمین و مفسرین اسی روش پر چلے ہیں اور حضرت شاہ عبدالقادر

۱۔ قرآن کریم کے اردو تراجم (کتابیات) مرتبہ ڈاکٹر احمد خان، ص ۲۵۳، ۲۵۴

محدث دہلوی کے زمانے سے موجودہ دور تک انھوں نے عوام کی سہولت کے لیے ان کی عقل و فہم کے لیے تفسیری حواشی اور تفسیری فوائد دیے ہیں جو عام قارئین قرآن کے لیے یقیناً بے حد مفید اور معلومات افزا ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ حواشی یا فوائد محض عوام کے لیے ہیں اور خواص ان سے کسی طرح کا فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ فائدہ تو یقیناً سب کو ہوگا۔ لیکن چونکہ عوام کو زیادہ گہرائی میں جانے کی نہ اہلیت ہوتی ہے نہ ضرورت۔ اس لیے وہ تو ان مختصر حواشی سے ہی فیضیاب ہو جاتے ہیں۔ مگر خواص کو بعض اوقات نہایت باریک بینی سے کام لینا پڑتا ہے اور ان کے پیش نظر بہت سے پہلو ہوتے ہیں اس لیے ان کو زیادہ تفصیلات درکار ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مفصل تفسیر پڑھیں۔ ان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جامع تفسیریں لکھی گئی ہیں جیسے ترجمان القرآن، بیان القرآن، تفہیم القرآن وغیرہ۔

جہاں تک تفسیری یا تشریحی حواشی کا تعلق ہے اس میں بھی ہمیشہ سے مختلف مترجمین کے درمیان فرق رہا ہے۔ چنانچہ ابتداء مختصر حواشی سے ہوئی۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے جس طرح ترجمہ میں اختصار سے کام لیا ہے اسی طرح حواشی بھی بہت کم تعداد میں اور نہایت مختصر دیے ہیں۔ سورہ فاتحہ پر صرف ایک حاشیہ ہے جو پوری سورت کا تعارف پیش کرتا ہے۔ اس میں بھی گنے چنے چند الفاظ ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(حاشیہ ۱) "یہ سورت اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی ہے کہ اس طرح کہا کریں"۔[1]

---

[1] قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر موضح القرآن ص ۲

جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا حواشی کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور تفصیلات بھی بڑھتی گئیں۔ یہ عمل بعض اوقات تو قارئین کی ضروریات اور رجحانات کو سامنے رکھ کر کیا گیا اور بعض اوقات مترجم نے خود اپنے موعود ذہنی اور عقیدہ کی روشنی میں۔ چنانچہ سورہ فاتحہ پر ہی مولانا اشرف علی تھانوی نے چار حواشی دیے ہیں۔ پہلا حاشیہ تو وہی ہے جو حضرت شاہ عبدالقادر نے دیا تھا صرف الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"یہ سورت رب العالمین نے اپنے بندوں کی زبان سے فرمائی ہے کہ یوں الفاظ میں اپنے خالق اور رازق کے سامنے عرض مدعا کیا کریں۔" گویا:

مانگنے کو بھی ہمیں فرما دیا　　　　مانگنے کا ڈھنگ بھی بتلا دیا

دوسرا حاشیہ لفظ عالمین کی وضاحت کے لیے دیا گیا۔ لوگ اس لفظ کی تشریحات اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کرتے رہے ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس میں عالم آب و گل، عالم برزخ اور عالم آخرت شامل ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ اٹھارہ ہزار عالموں پر مشتمل ہے۔ اور بعض موجودہ سائنسدانوں کے اس ادعا سے متاثر ہو کر ہماری دنیا کی طرح نظام شمسی کے دوسرے سیاروں میں بھی حیات موجود ہے۔ لہٰذا عالمین سے مراد یہی سب دنیائیں ہیں۔ مولانا تھانوی نے اس الجھن کو دور کرنے کے لیے اس کی تشریح اسطرح فرمائی ہے کہ "مخلوق کی الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا ہے۔ مثلاً عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم پرند، عالم حیوانات، عالم جن۔"

تیسرا حاشیہ "اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" کے ترجمہ "جن پر آپ نے انعام فرمایا" پر ہے۔ اس معاملہ میں بھی عوام مختلف الرائے تھے۔ اور اس کو دنیاوی ترقی، دولت و ثروت، سلطنت و حکومت پر محمول کرتے تھے۔

اس کو حضرت مولانا نے دینی انعام قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"انعام سے دینی انعام مراد ہے۔ انعام والے چار گروہ ہیں۔
انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔"

چوتھا حاشیہ سورہ فاتحہ کی آخری آیت کے دو الفاظ "مَغْضُوبِ" اور "ضَالِّینَ" کی وضاحت پر ہے۔ چونکہ ان دونوں الفاظ کے فرق کو عوام بخوبی سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لیے اس کی تشریح و تفریح کرنا ضروری تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں:

"غضب کے مستحق وہ لوگ ہیں جو تحقیقات کے باوجود راہِ ہدایت کو چھوڑ دیں اور گمراہ وہ ہیں جو صراطِ مستقیم کی تحقیقات نہ کرنا چاہیں۔ ان میں مغضوب زیادہ ناراضگی کے مستحق ہیں جو دیدہ و دانستہ حق کی مخالفت میں سرگرم ہیں۔"[1]

اس کے بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خاں کے تراجم آتے ہیں۔ اول الذکر پر مولانا شبیر احمد عثمانی کا، اور موخرالذکر پر مفتی احمد یار خاں کا حاشیہ ہے۔ ان دونوں حضرات کے حاشیے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور تفصیل میں بھی۔ لہٰذا ان کو حواشی اور مفصل تفسیر کی درمیانی شے قرار دینا مناسب ہوگا۔ سورہ فاتحہ پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے سات حواشی دیے ہیں اور مفتی صاحب نے نو۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے پہلے حاشیہ میں رحمٰن و رحیم کی تشریح بیان کی ہے۔ دوسرے میں "الحمد" کی وسعت پر روشنی ڈالی ہے۔ تیسرے میں عالمین کو مجموعہ مخلوقات سے تعبیر کیا ہے اور آخری یعنی ساتویں

---

[1] عکسی قرآن الحکیم مع ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی ص ۲

حاشیے میں سورہ فاتحہ کے متعلق بتایا ہے کہ:

"یہ سورت اللہ تعالیٰ نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ جب ہمارے دربار میں حاضر ہو تو ہم سے یوں سوال کیا کرو۔ اس لیے اس سورت کا ایک نام تعلیم مسئلہ بھی ہے۔ اس سورت کے ختم پر لفظ آمین کہنا مسنون ہے اور یہ لفظ قرآن شریف سے خارج ہے۔ معنی اس لفظ کے یہ ہیں کہ الٰہی ایسا ہی ہو یعنی مقبول بندوں کی پیروی اور نافرمانوں سے علیحدگی میسر ہو۔ اس سورت کے اول نصف میں اللہ تعالیٰ کی ثنا و صفت اور دوسرے حصے میں بندہ کے لیے دعا ہے"۔[1]

مفتی احمد یار خان صاحب نے تفسیری حواشی "نور العرفان" کے نام سے تحریر کیے ہیں۔ پہلے حاشیے میں سورہ فاتحہ کے متعلق چند نکات بیان کیے ہیں۔ جیسے یہ سورت "مکی" ہے۔ اس میں سات آیتیں اور ایک سو چالیس حروف ہیں۔ دوسرے اور تیسرے حاشیے میں "بسم اللہ" کے بارے میں بتایا ہے کہ جو "بسم اللہ" ہر سورہ کے شروع میں ہے وہ پوری آیت ہے اور جو سورۂ "نحل" میں ہے وہ آیت کا جزو ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بتادی ہے کہ "بسم اللہ" ہر سورت کے شروع میں نازل نہیں ہوئی بلکہ صرف ایک جگہ یعنی سورہ نحل کے درمیان میں نازل ہوئی۔ اس کو برکت کے لیے ہر سورہ کے شروع میں مکرر رکھ دیا گیا ہے۔ تیسرے حاشیے میں بتایا ہے کہ "بسم اللہ" کی "ب" استعانت کی ہے۔ اور اس سے پہلے فعل پوشیدہ ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ "شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام کی مدد سے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ

---

[1] بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۔ ص ۲

اللہ کے سوا سے بھی مدد لینا جائز ہے تو اللہ کے رسول اور اس کے نیک بندوں سے بھی جائز ہے کہ وہ بھی "بِسْمِ اللہ" کی طرح اللہ کی ذات پر دلالت اور رہبری کرتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے حضورؐ کو ذکر اللہ فرمایا۔"

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ اسی سورت میں بڑی تاکید کے ساتھ یہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ " اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ " اس کا ترجمہ مفتی صاحب نے یہ کیا ہے۔ "ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں۔" اس آیت سے اس ادعا کی صریحاً تردید ہوتی ہے کہ " اللہ کے سوا سے بھی مدد لینا جائز ہے۔" اسلیے مفتی صاحب نے اس آیت پر دو حاشیے دیے ہیں۔

(۱) " نَعْبُدُ " کے جمع فرمانے سے معلوم ہوا کہ نماز جماعت سے پڑھنی چاہیے۔ اگر ایک کی قبول ہو سب کی قبول ہو۔

(۲) اس سے معلوم ہوا کہ حقیقتاً مدد اللہ تعالیٰ کی جیسے حقیقتاً حمد رب کی ہے خواہ واسطے سے ہو یا بلاواسطہ۔ خیال یہ رہے کہ "عبادت" اور مدد لینے میں فرق یہ ہے کہ مدد تو مجازی طور پر غیر خدا سے بھی حاصل کی جاتی ہے۔"[1]

اس کے مقابلہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے " اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ " کے حاشیہ میں بتایا ہے کہ:

"اس آیت شریف سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے۔ استعانت درحقیقت

---

[1] تفسیر نور العرفان مفتی احمد یار خان مع ترجمہ کنز الایمان ص ۲

حق تعالیٰ ہی کی استعانت ہے۔ اس تاکید کے باوجود جو اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں) سے ظاہر ہو رہی ہے۔ مفتی صاحب اور مولانا شبیر صاحب کا استدلال قابلِ فہم نہیں معلوم ہوتا لیکن چونکہ یہ دونوں حضرات بڑے عالم ہیں اس لیے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

جس طرح استعانت کے معاملے میں ان دونوں بزرگوں نے گنجائش نکالی ہے۔ اسی طرح اس سلسلے میں بھی وہ دونوں متفق ہیں کہ "اَلْمَغْضُوْبِ" سے یہود اور "ضَآلِّیْن" سے نصاریٰ مراد ہے۔[1]

مولانا مودودی نے قرآن کریم کے ترجمے کے ساتھ جو حواشی دیے ہیں ان کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں:

"اس ترجمے کے ساتھ میں نے بہت مختصر حواشی صرف ان مقامات پر دیے ہیں جہاں یہ محسوس ہوا ہے کہ حاشیے کے بغیر بات پوری طرح سمجھ میں نہ آسکے گی۔ کیونکہ یہ ترجمہ دراصل ان لوگوں کے لیے شائع کیا جا رہا ہے جو محض ترجمہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ باقی رہے وہ حضرات جو تفصیل کے ساتھ قرآن مجید کو سمجھنے کے خواہشمند ہوں ان کے لیے میری تفسیر "تفہیم القرآن" کا مطالعہ مفید ہوگا۔"

"عرضِ مترجم" کے تحت یہ وضاحت کرنے کے بعد سورہ فاتحہ کے ترجمہ کے ساتھ مولانا اشرف علی تھانوی کی طرح انھوں نے بھی چار حواشی دیے ہیں پہلے حاشیے میں بتایا ہے کہ یہ سورہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو سکھائی ہے کہ وہ اللہ کے حضور اپنی عرضداشت اس طرح پیش کیا کریں۔ دوسرے

---

[1] قرآن مجید مترجم محشی ص ۲

حاشیہ میں لفظ "رب" کی تشریح کی ہے۔ تیسرے حاشیے میں لفظ عبادت کی تشریح ہے۔ اور چوتھے حاشیے میں یہ بتایا ہے کہ بندوں کی اس عرضداشت کے جواب میں اللہ تعالیٰ ان کو پورا قرآن عطا کرتا ہے۔

رَبّ ، اِلٰہ ، دِین اور عبادت جیسے الفاظ جو قرآن مجید میں متعدد بار استعمال ہوئے ہیں ، نہایت وسیع مفہوم کے حامل ہیں لیکن چونکہ بہت کم لوگوں کو ان کے مفہوم کی وسعت سے آگاہی ہے اس لیے جو اثرات ان الفاظ کے پڑھنے سے قارئین کے دلوں پر ہونے چاہئیں وہ نہیں ہوتے۔ لہٰذا مولانا مودودی عوام کے لیے ان الفاظ کی تشریح و توضیح کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں ان چار اصطلاحوں کی پوری طرح وضاحت کر دی ہے۔ سورہ فاتحہ کے ترجمے کے ساتھ بھی ان کی اہمیت کو جتانے کے لیے "رَبّ" اور "عبادت" پر دو حاشیے دیے ہیں اور ان میں مختصراً ان کے قرآنی مفہوم سے قارئین کو آگاہ کر دیا ہے۔[1]

مولانا فتح محمد جالندھری نے سورہ فاتحہ پر تین حاشیے دیے ہیں۔ پہلے حاشیہ میں بِسْمِ اللّٰہ کے کنہ و حقیقت سے آگاہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ترجمے میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت کے طور پر ہر جگہ بِسْمِ اللّٰہِ کے مفہوم سے پہلے "کہو" کا لفظ لکھنا چاہیے تھا لیکن چونکہ اس میں وہ لطف نہ آتا جو "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" میں ہے اس لیے ہم نے اسے مقدر رہنے دیا۔ دوسرے حاشیہ میں انھوں نے کبھی اس سورت کو پارتکا و رب العزت میں دعا قرار دیا ہے۔ حاشیہ میں

---

[1] ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی سید ابو الاعلیٰ مودودی ص ۱۹۔

یَوْمِ الدِّیْنِ کا ترجمہ انصاف کا دن کر کے بتایا ہے کہ اس سے مراد روزِ قیامت ہے۔[1]

مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوری نے اپنے ترجمہ قرآن میں حواشی تو وہی قائم رہنے دیے جو شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے دیے۔ البتہ "ربط آیات" بتا کر آیات کی ظاہری بے ربطی کو ختم کر دیا ہے۔ اس معاملے میں مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا عبید اللہ سندھی کا تتبع کیا ہے۔ سچ پوچھیے تو عوام کے لیے یہ ایک نہایت مفید اقدام ہے۔ مولانا لاہوری نے آیاتِ قرآنی کو جس خوبصورتی سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے دکھایا ہے اس نے عوام کے لیے قرآن فہمی کو بہت آسان کر دیا ہے۔ ایک معمولی سوجھ بوجھ کا انسان بھی بغیر کسی کی مدد کے اس ترجمہ کے ذریعہ قرآن کریم کے مفہوم کو سمجھتا چلا جاتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں حواشی زیادہ تفصیلی ہیں۔[2]

قادیانی علماء نے قرآن کریم کے جو تراجم پیش کیے ہیں ان میں کئی جگہ انہوں نے مسلک عام سے ہٹ کر ترجمے بھی مختلف دیے ہیں اور حواشی میں بھی اختلاف کیا ہے۔ مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی کے صاحبزادے اور دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے ترجمے میں خاتم النبیین سے یہ مراد لی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعد آنے والے نبیوں کی نبوت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیں گے۔[3] پھر حاشیے میں اس کی ایک نا قابلِ فہم سی تفسیر پیش کی ہے۔ آخر میں "سورۃ الناس" پر جو حواشی دیے ہیں ان میں

---

1. القرآن الحکیم مع ترجمہ فتح الحمید ص ۲
2. ایضاً القرآن الکریم مترجم و محشی ۱۳۵۴ھ ص ۲
3. تفسیر صغیر الخالقہ مرزا بشیر الدین محمود احمد ناشر ادارۃ المصنفین ربوہ ضلع جھنگ ص

نے ایک حاشیہ میں بتایا ہے کہ "مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ" میں جنہ سے مراد غیر ملکی لوگ ہیں اور النَّاس سے ملکی یا مقامی آبادی مراد ہے[1]

غرض شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے لے کر اس وقت تک قرآن کریم کے مترجمین اور حاشیہ نگاروں نے بے حد تنوع سے کام لیا ہے۔ بعض نے تو صرف چند الفاظ کے مفہوم ہی میں کسی قدر اختلاف کیا ہے لیکن بعض نے اپنے عقائد کی روشنی میں تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان حضرات کی علمیت اور نیتوں پر تو شبہ کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے لیکن بعض حضرات کی زیادہ آزادی لانے سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عام قاری جو زیادہ سوجھ بوجھ نہیں رکھتا ان حضرات سے عقیدت کی بنا پر قرآن کے حقیقی مفہوم سے زیادہ دور نہ جا پڑے اور حکم خداوندی کی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو جائے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا

---

[1] تفسیر صغیر از مرزا بشیر الدین محمود احمد، ناشر الشرکۃ الاسلامیہ ربوہ ضلع جھنگ بار دوم ۱۹۶۷ء ص ۸۳۲

باب چہارم

اردو کی مشہور تفاسیر تاریخی جائزہ اور تجزیہ

فارسی تفاسیر

مثلاً

تفسیر بیضاوی، تفسیر حسینی، تفسیر کبیر وغیرہ کے اردو تراجم

ایک وضاحت:

تفسیری ادب کا بہت بڑا ذخیرہ مختلف زبانوں، ملکوں، زمانوں اور مکاتب فکر کی کاوشوں پر مشتمل ہے۔ قدرتی طور پر ہر مفسر نے محض سابقین یا معاصرین کی تقلید یا تنقید نہیں کی ہے بلکہ مختلف زاویوں سے تشریح اور تفسیر کی ہے۔ ان سب پر الگ الگ بحث یا مختلف تفاسیر کا ذکر کی تصدیق اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ اس میں مجموعی طور پر شاہ ولی اللہؒ کی تصنیف "فوز الکبیر" کے لفظ تفسیر اور اسانید کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

لفظِ تفسیر کی تشریح، تفسیر نویسی کا آغاز و ارتقاء

اور اصولِ تفسیر

جیسا کہ باب اول کے شروع میں بتایا گیا ہے "لفظ تفسیر" کا مادہ فسر ہے۔ جس کا مفہوم واضح کرنا یا ظاہر کرنا ہے۔ ادارۃ المعارف الاسلامیہ (عربی) میں شامل مقالہ "تفسیر" کے مصنف استاذ امین الخولی اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ف۔س۔ر اور س۔ف۔ر، دونوں مادوں میں کھولنے اور حجاب ہٹا دینے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ لیکن سفر ظاہری اور باطنی رموز کو کھول کر سامنے لانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ فسر کا استعمال معنوی اور لفظی خوبیوں کو کھول کر بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔"[1]

"تاریخ تفسیر و مفسرین" کے مؤلف غلام احمد حریری "التعارف کتاب" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"لفظ تفسیر کا سہ حرفی مادہ فسر ہے۔ جس کے معنی ہیں ظاہر کرنا، کھول کر بیان کرنا اور بے حجاب کرنا۔ کسی لفظ کی تشریح و توضیح کو تفسیر کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ گویا اس کے مطلوب و

1۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (عربی) ص ۴۷

مقصود کو بے حجاب کر دیا جاتا ہے۔ یہ تفسیر کا لغوی مفہوم ہے۔ جہاں تک تفسیر کے اصطلاحی معنی کا تعلق ہے۔ امام زرکشی نے "البرہان" میں تفسیر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے قرآن کریم کے مطالب و معانی معلوم کیے جاتے ہیں اور اس میں مندرج احکام و مسائل اور اسرار و حکم سے بحث کی جاتی ہے۔"[1]

آگے چل کر "تفسیر کا ارتقاء" کے عنوان کے تحت غلام احمد حریری تاریخ کے مختلف ادوار میں قرآن کریم کی تفسیر کی ضرورت و اہمیت اور ہر دور کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ "عہد رسالت" میں تفسیر کے زیر عنوان وہ لکھتے ہیں:

"قرآن عزیز عربی میں نازل ہوا تھا۔ اس وقت جو لوگ موجود تھے عربی ان کی مادری زبان تھی اس لیے قرآن کریم کے معانی و مطالب معلوم کرنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی تاہم بعض مقامات میں جہاں زیادہ اجمال ہوتا ہے صحابہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند کریم نے جہاں دیگر مناصب جلیلہ پر فائز کیا تھا وہاں ایک منصب عالی قرآن عزیز کے مفسر و ترجمان ہونے کا بھی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ
(النحل ۴۴)

---

[1] - تاریخ تفسیر و مفسرین، تالیف غلام احمد حریری، ناشر ملک سنز پبلیشرز کارخانہ بازار، فیصل آباد پاکستان۔ مطبوعہ ۱۹۷۸ء ص ۱۳

اور ہم نے آپ پہ قرآن نازل کیا تاکہ آپ اسے لوگوں کے لیے واضح کر دیں۔"

چنانچہ تفسیر کا سب سے پہلا بیش قیمت سرمایہ تفسیری روایات ہیں جو مختلف کتب حدیث میں منقول ہیں۔[1]

عہدِ رسالت کے بعد صحابہ کا دور آیا۔ حالات میں تیزی سے تبدیلی ہونی شروع ہوئی جس سے تھوڑا بہت اختلاف تفسیری روایات میں بھی ہوا۔ تاہم صحابہ اپنے سابقہ مسلک سے نہیں ہٹے۔ انھوں نے جو تفسیر بالواسطہ یا بلا واسطہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی وہی بیان کرنے پہ اکتفا کیا۔ بیان کی سادگی باقی رہی۔ کلامی بحثوں یا فرقی اور نحوی نکات میں صحابہ قطعاً نہیں الجھے۔ یہ ضروری ہے کہ تفسیر بیان کرنے میں تمام صحابہ کا درجہ برابر نہیں تھا۔ اتنی بڑی جماعت میں دس حضرات کو اس معاملہ میں امتیاز حاصل تھا۔ ان میں بھی سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت عبد اللہ ابن عباس رض سے منسوب ہیں۔ خلفائے راشدین میں حضرت علی رض کی بیان کردہ روایات زیادہ ہیں۔

تابعین سے تفسیر کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ چونکہ تابعین نے حضرات صحابہ رض سے اکتسابِ فیض کیا تھا اس لیے ان میں بھی بڑے بڑے مفسرین پیدا ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ سر برآوردہ مجاہد، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن بصری، ابو العالیہ، ضحاک اور قتادہ ہیں۔

مکہ مکرمہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس کے سلسلہ میں مجاہد (المتوفی ۱۰۴ھ) نے سب سے زیادہ فیض پہنچایا۔ چنانچہ ان کی بیان کردہ تفسیر پہ اکثر

1۔ تاریخ تفسیر و مفسرین تالیف غلام احمد حریری۔ ص ۱۳ ، ۱۰ ، ۱۹

آئمہ نے اعتماد کیا ہے۔ ان میں سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد اور امام بخاری بطور خاص اہم ہے۔

مدینہ منورہ میں صحابی رسولؐ حضرت ابی بن کعبؓ کے شاگردوں نے بکثرت تفسیری روایت کو محفوظ کر کے آئندہ نسل کو منتقل کیا۔ مفسر تابعین مدینہ میں زید بن اسلم، ابوالعالیہ اور محمد بن کعب القرظی کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ تفسیر کا کوفہ کا مرکز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قائم کیا۔ تابعین میں جن حضرات نے ان سے فیض حاصل کر کے دوسروں کو مستفید فرمایا ان میں علقمہ بن قیس، مسروق، اسود بن یزید اور امام شعبیؒ کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔

بصرہ میں حضرت حسن بصری اور ان کے سلسلے کے مفسرین نے فیض پہنچایا۔ تابعین کے دور میں تفسیر میں اسرائیلیات کا عنصر شامل ہونا شروع ہو گیا جس نے رفتہ رفتہ کافی مقبولیت حاصل کر لی اور قرآن کریم کتاب ہدایت ہونے کے بجائے اسرائیلیات کا مجموعہ معلوم ہونے لگا۔[1]

---

[1] اسرائیلیات سے مراد وہ واقعات ہیں جو بنی اسرائیل نے وقتاً فوقتاً گھڑ کر بعض جلیل القدر نبیوں اور پیغمبروں سے منسوب کر دیے ہیں اور بعد میں وہ بائیبل اور اس کی تفسیروں میں شامل کر لیے گئے۔ آغازِ اسلام کے وقت یہود و نصاریٰ میں یہ واقعات مشہور تھے اور بائیبل اور دیگر مقدس کتابوں میں درج ہونے کی وجہ سے وہ ان پر یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ جب بعض یہودی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیانت داری سے یہ واقعات مسلمانوں کے بھی ذہن نشین کرا دیے۔ بعض مفسرین نے ان کو صحیح سمجھ کر ان میں سے بعض اپنی تفسیروں میں شامل کر لیے۔ جیسے داؤد علیہ السلام کے دربار میں دو فریقوں کے بصورت لا تقضی شرح ہونے کی روایت اور اس سے حضرت داؤد

عہد صحابہ اور تابعین کے دور کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت
تفسیر کی جداگانہ تدوین شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ تفسیری روایات احادیث

بائبل زیریں صراحت *

علیہ السلام کو اس بات پر تنبیہ کہ انہوں نے ننانوے بیویاں ہوتے ہوئے
جنرل اوریاہ کو دھوکے سے قتل کرا کر اس کی حسین بیوی "جب اس کے سوگ کے دن
گزر گئے تو داؤد نے اسے بلوا کر اس کو اپنے محل میں رکھ لیا۔"

(کتاب ۲ سموئیل باب ۱۱ آیات ۲ تا ۲۷)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے قصص القرآن میں اس پر تفصیل سے بحث
کی ہے۔

یہ تو ایک واقعہ ہے، اس طرح کے بے شمار قصے بائبل میں بھرے پڑے ہیں۔
جیسے حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ وغیرہ کے شراب پی کر غیر شرعی حرکتیں کرنے کے قصے،
یا حضرت داؤدؑ ہی کا یہ واقعہ:

"جب داؤد لوٹا کہ اپنے گھرانے کو برکت دے تو داؤد کی
بیٹی میکل داؤد کے استقبال کو نکلی اور کہنے لگی کہ "اسرائیل کا بادشاہ
آج کیسا شاندار معلوم ہوتا تھا جس نے آج کے دن اپنے ملازموں
کی لونڈیوں کے سامنے اپنے کو برہنہ کیا جیسا کوئی باؤلا بے حیائی سے
برہنہ ہو جاتا ہے۔ داؤد نے میکل سے کہا "یہ تو خداوند کے حضور
تھا جس نے تیرے باپ اور اس کے سارے گھرانے کو چھوڑ کر مجھے پسند
کیا تاکہ وہ مجھے خداوند کی قوم اسرائیل کا پیشوا بنائے سو میں
خداوند کے آگے ناچوں گا۔ بلکہ میں اس سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گا
اور اپنی ہی نظر میں نیچ ہوں گا ... اور جن لونڈیوں کا ذکر تو نے کیا ہے

تبویب کے ساتھ محفوظ تھیں۔ آخر دور بنو امیہ اور اوائل دور بنو عباس میں تفسیر کی تدوین شروع ہوئی اور اس نے ایک جداگانہ فن کی صورت اختیار کر لی۔

بسلسلہ زیر بحث صراحت ★★

وہ میری عزت کریں گی۔" ساؤل کی بیٹی میکل مرتے دم تک بے اولاد رہی۔"

(۲۔ سموئیل، باب ۶، آیات ۲۰، ۲۳)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں بائیبل کا بیان ملاحظہ ہو۔

"جب سلیمان بڈھا ہو گیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا جیسا اس کے باپ داؤد کا تھا کیونکہ سلیمان صیدانیوں کی دیوی عستارات اور عمونیوں کے نفرتی ملکوم کی پیروی کرنے لگا اور سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی نہ کی....." (۱۔ سلاطین باب ۱۱ آیات ۴ تا ۸)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس حرکت پر اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا (نعوذ باللہ) اور "خداوند نے سلیمان کو کہا: "چونکہ تجھ سے یہ فعل ہوا اور تو نے میرے عہد اور میرے آئین کو جن کا میں نے تجھے حکم دیا نہیں مانا، اس لیے میں سلطنت کو ضرور تجھ سے چھین کر تیرے خادم کو دوں گا۔ تو بھی تیرے باپ داؤد کی خاطر میں تیرے ایام میں یہ نہیں کروں گا۔ بلکہ اسے تیرے بیٹے کے ہاتھ سے چھینوں گا......" (۱۔ سلاطین ۱۱: ۱۱ ۔ ۱۲)

اس روایت میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو خداوند نے حضرت داؤد کو اجازت اوریاہ کی بیوی کو ناجائز طریقہ پر اپنے محل میں رکھ لینے کی وجہ سے خداوند ناراض ہو گیا تھا (اپنا) بیٹا یہ کہ حضرت سلیمان کو ان کے جرم کی سزا نہیں دی۔ دوسرے یہ کہ حضرت سلیمان کے جرم کی سزا ان کے بے قصور بیٹے کو دی گئی کیا اسی کو عدل خداوندی کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہودی کتاب ۱۔ سلاطین انبیاء کرام وغیرہ بابل کی اسیری کے بعد لکھی گئی ہے۔ حضرت سلیمان کے بادشاہ بننے پر یہود نے ان کے انتقال کے بعد اقتدار پر قبضہ کر کے ان کو بدنام کرنے کے لیے یہ جھوٹی روایت گھڑی اور بائیبل میں شامل کر دی۔

اب قرآن کی ترتیب کے مطابق ہر آیت اور ہر سورۃ کی تفسیر مرتب کی جانے لگی۔ تاہم اس دور کے تفاسیر میں ابھی سنداً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین سے منقول ہیں۔ اس دور کے مفسرین میں کئی نام نہایت اہم ہیں لیکن سب سے زیادہ شہرت تفسیر ابن جریر الطبری کو حاصل ہوئی۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ ابن جریر نے صرف تفسیری اقوال نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی توجیہ کرتے ہوئے بعض کو راجح اور بعض کو مرجوح قرار دیا ہے۔ اسی کی بنیاد پر علامہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر ابن جریر کو سب سے زیادہ قابل اعتماد بتایا ہے۔

عصر تدوین تک فن تفسیر جن مراحل سے گزرا ان سب میں تفسیر بالماثور کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد جو دور شروع ہوا اور جس کا پھیلاؤ عباسی دور سے عصر حاضر تک ہے بعض بیرونی اثرات کے تحت اور سابق سے بڑی حد تک مختلف ہو گیا ہے۔ اس میں عقل و نقل کا امتزاج دکھائی دیتا ہے جو استعداد زمانہ سے وسعت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس طویل دور میں مختلف النوع عناصر شامل ہوئے۔ مثلاً صرف و نحو کی بحثیں اور عربی زبان کی بنیادی خصوصیات پر اظہار خیال۔ فقہی مسائل کا استنباط، فلسفیانہ موشگافیاں اور کلامی بحثیں۔ ناسخ و منسوخ کا مسئلہ۔ اسباب نزول اور موجودہ دور میں آیات قرآنی سے سائنسی مسائل کا استخراج۔ جو مفسر جس علم اور جس مسلک و مسئلے سے دلچسپی رکھتا تھا اس نے اپنی تفسیر کو اسی کے رنگ میں رنگ دیا۔ غرض کتاب ہدایت میں اتنی موشگافیاں کیں کہ اس کا اصل مقصد یعنی ہدایت کا عنصر تقریباً نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

نحوی علماء نے جو تفسیریں لکھیں ان میں نحوی مسائل کی بھرمار ہے۔ اس طرح کی تفسیریں لکھنے والے مفسرین میں زجاج، واحدی اور ابوحیان کے اسماء گرامی

اہم ہیں۔

علوم عقلیہ سے دلچسپی رکھنے والے علماء نے اپنی تفسیروں کو علماء و حکماء کے اقوال کے مجموعے بنا دیا ہے۔ امام فخر الدین رازی کی تفسیر جو تفسیر کبیر کے نام سے موسوم کی جاتی ہے، اس طرح کی تفاسیر میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

جن لوگوں نے بدعات کا جواز قرآن کریم میں تلاش کرنا چاہا انہوں نے بدعات کی تائید و حمایت پر مشتمل اقوال سے اپنی تفسیر کی کتابوں کو زینت دی۔ اس نوع کی تفسیروں میں جار اللہ زمخشری کی کتاب "کشاف" سب سے زیادہ شہرت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ رمانی، جبائی اور شیعہ اثنا عشریہ کے مفسرین طبرسی اور ملا محسن نے اسی طرح کی تفسیریں لکھی ہیں۔

فقہا نے اپنی تفسیروں کو بیشتر فقہی مسائل کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس معاملہ میں جصاص اور قرطبی پیش پیش ہیں۔

مؤرخین نے اپنی تفسیروں میں تاریخی واقعات اور اسرائیلی خرافات کی اتنی بھرمار کی ہے کہ اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد واحد تاریخی واقعات اور اسرائیلیات کو ذہن نشین کرانا اور فروغ دینا تھا۔ اس طرح کے مفسرین کے سرخیل امام ابن جریر طبری ہیں جو بیک وقت مؤرخ بھی تھے اور مفسر قرآن بھی۔

صوفیہ نے قرآن کریم کی تفسیر صوفیانہ رنگ میں کی اور آیات قرآنی سے ایسے اشارات ڈھونڈ نکالے ہیں جن سے ان کے مسلک اور وجدان کی دریافت کی تائید ہوتی ہے۔ محی الدین ابن عربی چونکہ وحدت الوجود کے مسلک کے علمبردار تھے لہٰذا انہوں نے پورے قرآن کو وحدت الوجود کے نظریہ کی تفسیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ ابو عبد الرحمٰن السلمی نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

موجودہ دور چونکہ سائنسی دور کہلاتا ہے لہٰذا دور حاضر کے بعض نام نہاد

مفسرین نے قرآن کریم کو اپنی تفسیروں کے ذریعے سائنس کی کتاب بنا کر پیش کیا
ہے اور موجودہ دور کی تمام ایجادات مثلاً ریل، ہوائی جہاز، راکٹ، جوہری
توانائی وغیرہ کو قرآن کریم میں ڈھونڈ نکالا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایجادات
قدیم مفسرین کے زمانے میں منصۂ شہود پر نہیں آئی تھیں اس لیے وہ اپنی سمجھ اور
تجربے کے مطابق غلط تفسیریں کرتے رہے۔ اگر یہ ایجادات اس زمانے میں ہو چکی
ہوتیں تو وہ بھی وہی کچھ لکھتے جو ہم آج لکھ رہے ہیں۔ اس رنگ کی تفاسیر میں علامہ
شروانی کی الانعام یافتہ کتاب "اسرار کشف قرآن" بہت اہم ہے۔ قرآن کتاب ہدایت ہے
جس کے نازل کرنے والے نے واضح طور پر فرما دیا ہے۔

الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرہ ۱ تا ۳)

اس طرح سے تفسیریں کرنے کے اس انداز سے پیش کیا گیا کہ اصل مقصد
نظروں سے اوجھل ہو گیا اور قرآن کریم بعض اوقات سائنس کی کتاب معلوم
ہونے لگا۔ مفسرین کی اس روش کو دیکھ کر بعض علماء نے تفسیر کے کچھ اصول
وضوابط مقرر کیے اور اس طرح اصول تفسیر کے نام سے ایک مستقل فن وجود
میں آگیا۔ اس فن پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں دو کتابوں نے بڑی مقبولیت
وشہرت حاصل کی۔ ایک علامہ جلال الدین سیوطی کی "الاتقان" اور دوسری
شاہ ولی اللہ صاحب کی "فوز الکبیر"۔ الاتقان میں چونکہ متعدد قرآنی علوم
شامل ہیں اس لیے ایک ضخیم کتاب بن گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں فوز الکبیر صرف
اصول تفسیر سے متعلق ہے اس لیے نہایت مختصر ہے۔ لیکن اس اختصار کے
باوجود اس فن پر جامع کتاب ہے۔

"فوز الکبیر" میں تفسیر کے اصولوں کو سمجھانے کے لیے بعض بنیادی امور

پہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں سب سے پہلی چیز ان علوم پنجگانہ کا بیان ہے جنہیں قرآن مجید میں بطور نص کے بیان فرمایا گیا ہے۔ "علوم پنجگانہ سے مراد (۱) علم الاحکام (۲) علم مخاصمہ (۳) علم تذکیر بآلاء اللہ (۴) علم تذکیر بایام اللہ (۵) علم تذکیر بموت ہے۔

ان علوم پنجگانہ کی کسی قدر وضاحت ذیل میں درج ہے۔

(۱) علم الاحکام — اس علم میں واجب، مندوب، مباح، مکروہ اور حرام امور شامل ہیں۔ ان امور کا تعلق عبادات، معاملات، تدبیر منزل اور سیاست مدن سب سے ہے۔ ان کی تفصیل بیان کرنے اور تشریح کرنے والے کو فقیہ کہا جاتا ہے۔

(۲) علم مخاصمہ — اس علم سے معتقدین یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین سے بحث اور مخاصمہ ہے۔ ان کی تشریح کرنے والے متکلمین کہلاتے ہیں۔

(۳) علم تذکیر بآلاء اللہ — اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نشانیوں کا علم ہے۔ اس میں زمین و آسمان کی تخلیق، ان امور کی ذریعہ الہام کی تعلیم جن کا انسان محتاج اور ضرورت مند ہے اور اللہ تعالیٰ کے صفات کاملہ کا ذکر شامل ہے۔

(۴) علم تذکیر بایام اللہ — اس علم میں ان تمام واقعات کا بیان شامل ہے جو اطاعت شعار بندوں کے انعام و اکرام اور نافرمان بندوں کی سزا و عقوبت کے سلسلہ میں پیش آئے۔

(۵) علم تذکیر بموت — یہ علم، موت اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات یعنی حشر و نشر اور دوزخ اور جنت سے متعلق ہے۔ ان واقعات کو بیان کرکے عبرت دلانے والا شخص واعظ کہلاتا ہے۔"[1]

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، مع التفسیر، ماثر قرآن کل مقالا [illegible]

علوم پنجگانہ کا یہ مختصر سا خاکہ بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب کے بڑے پتے کی بات یہ بتائی ہے کہ ان علوم کو بیان کرنے کے لیے قرآن میں قدیم عربوں کا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ متاخرین عرب کا انداز بیان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اختصار کے ساتھ احکام بیان کر دیے گئے ہیں اور قواعد کی غیر ضروری اصولوں سے بحث کر کے بیان کو طول نہیں دیا گیا۔ اسی طرح آیات مخاصمہ میں بھی مشہور مسلمات اور خطابیات کے اسلوب سے کام لیا گیا ہے۔ منطقی استدلال اور فلسفیانہ موشگافیوں کو کہیں نہیں برتا گیا۔ یہ نکات بیان کرنے سے شاہ صاحب کا مقصد یہ واضح کر دینا ہے کہ مفسرین کو قرآن کریم کی تفسیر میں وہی سادگی اختیار کرنی چاہیے جو قرآن کریم میں اختیار کی گئی ہے۔ نہ اسباب نزول میں بلا ضرورت قصہ کہانیوں کا سہارا لینا چاہیے۔ نہ آیات مخاصمہ میں منطق اور فلسفیانہ بحثوں میں پڑنا چاہیے اور نہ اسرائیلیات کو کام میں لانا چاہیے۔ قرآن صرف لوگوں کے نفسوں کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی اصلاح کے لیے نازل ہوا ہے۔ لہٰذا مختلف قسم کی آیات کے اسباب نزول بھی مختلف ہیں۔ مثلاً

آیات مخاصمہ کے نزول کا سبب لوگوں کے عقائد باطلہ ہیں۔

آیات احکام کے نزول کا سبب لوگوں کے فاسد اعمال اور ان کے درمیان مظالم کا رواج عام ہے۔

آیات تذکیر کے نزول کا سبب یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی طرف سے بے توجہی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے انعامات، تعذیبی سانحات یا موت اور بعد موت کے حالات کی طرف سے لاپروائی برتتے تھے۔

ان نکات کے پیش نظر مفسرین کے لیے ضروری ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے قصوں کی جزئیات اور تفصیلات بیان نہ کریں۔ اس لیے کہ ان کا مطالب

قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ بعض ایسی آیات ہیں جن میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ موجود ہے خواہ وہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پیش آیا ہو یا آپ سے پہلے۔ ان آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں ان کے متعلقہ واقعات بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان آیات کے سننے والے پر جو انتظار کی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اس کے بغیر دور نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ ان علوم کی شرح اس انداز سے کی جائے کہ جو دور اور ضمنی حکایات بیان کرنے کی ضرورت نہ رہے۔[۱]

جیسا کہ سطور بالا میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے آیات مخاصمات کے نزول کا سبب لوگوں کے عقائد باطلہ کو قرار دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ان عقائد باطلہ کے حامل چار فرقے ہیں۔ مشرکین، منافقین، یہود اور نصاریٰ۔ پھر ان سے مخاصمہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) ایک تو صرف ان کے باطل عقائد کو بیان کیا گیا ہے، پھر ان کی برائیاں واضح کی گئی ہیں اور ان کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۲) دوسرے ان کے شبہات کو بیان کیا گیا ہے اور منطقی اور خطابی دلیلوں سے ان کو رد کیا گیا ہے۔

مخاصمہ کی ان دو قسموں میں سے پہلی قسم کے ذیل میں سب سے پہلے مشرکین کے عقائد باطلہ پر حسب ذیل عنوانات کے تحت تفصیلی بحث کی ہے۔

شعائر ملت ابراہیمی۔ دین ابراہیم کے بنیادی عقائد اور مشرکین، شرک، تشبیہ، تحریف، عقیدۂ رسالت و قیامت اور مشرکین، رسول کی بعثت، شرک کا جواب، تشبیہ کا جواب، تحریف کا جواب، حشر و نشر کو محال

---

[۱] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ص ۱۳، ۱۴

کچھ کا جواب۔ رسالت کے متعلق شبہات کا جواب۔ حواریوں کی تکرار۔ دوسرے
نمبر پر یہودیوں کی حالت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اور ان کے عقائد پر درج
ذیل عنوانات کے تحت بحث کی گئی ہے۔ تورات میں تحریف۔ تحریف معنوی
کا انداز۔ قرآن کی وضاحت۔ کتمان آیات۔ قتل انبیاء کی حقیقت۔ سبابیہ کی
حقیقت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ کی رسالت میں ان کے شبہات اور ان کی حقیقت۔
وصیت کے فرائض اور ان کی حدود۔ شریعتوں میں اختلاف اور ان کی
حقیقت۔ یہودی علماء کا نمونہ۔ تیسرے نمبر پر عیسائیوں کو لیا ہے۔ اور ان کے
عقائد کی تفصیل مندرجہ ذیل عقائد کے تحت بتائی گئی ہے۔
عیسائی اور ان کے عقائد۔ پہلے اشکال کا جواب۔ دوسرے اشکال کا
جواب۔ قرآن کا فیصلہ۔ عیسائیوں کا نمونہ۔ ایک دوسری گمراہی اور اس کا
ازالہ۔ ایک اور غلط فہمی اور اس کا ازالہ۔
سب سے آخر میں منافقین کے گروہ کو لیا ہے اور حسب ذیل عنوانات
کے تحت ان کے عقائد کی تفصیلات بتائی ہیں۔
منافقین کا گروہ اور ان کے عقائد۔ منافقین کا پہلا گروہ۔ منافقین
کا دوسرا گروہ۔ منافقین کے شبہات اور ان کے اسباب۔ منافقین کے کچھ
اور ساتھی۔ نفاق کی قسمیں۔ منافقوں کا نمونہ۔ منافقین کا ایک اور نمونہ۔
اس کے بعد علوم پنجگانہ کے بقیہ مباحث کے تحت تذکیر بآلاء اللہ،
تذکیر بایام اللہ اور تذکیر بموت پر نہایت مختصر الفاظ میں بحث کی ہے
اور بتایا کہ چونکہ قرآن مجید تمام لوگوں کی تہذیب اور اصلاح نفوس کے لیے
نازل ہوا ہے۔ اس میں عربی و عجمی یا شہری و دیہاتی کسی کا کوئی امتیاز نہیں
لہٰذا حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی یاد دہانی کے سلسلہ
میں صرف ان ہی امور کا تذکرہ کیا جائے جن سے عوام الناس کی اکثریت واقف

ہو۔ چنانچہ آلاءِ اللہ کے سلسلہ میں بحث و جستجو کو قرآن میں صرف انہی حدو
اندر محدود رکھا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بارے میں ایسے
انداز سے گفتگو کی گئی ہے جسے معمولی قسم کی فطری فہم اور وجدانیات سے سمجھ
لیا جائے۔ اور اس سلسلہ میں علم کلام کی مہارت اور حکمتِ الٰہیہ کے مطالعہ
کی عادت کی ضرورت پیش نہ آئے۔

یہ اصول بتانے کے بعد شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ جہاں تک
وجود باری تعالیٰ کا تعلق ہے اس سے کسی بھی اعتدال پسند ملک کے باشند
کبھی انکاری نہیں رہے البتہ صفات باری تعالیٰ کے سلسلہ میں بہت سی قومیں
گمراہی میں مبتلا رہی ہیں اور اب بھی ہیں۔ ان میں سے جن صفات کو انسان آ
سے سمجھ سکتا ہے ان کے بارے میں قرآن کریم نے عام فہم انداز میں سمجھا کر
دوسرے کو ان صفات میں شریک کرنے کی گمراہی سے بچنے کی ہدایت کی
اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسی کوئی چیز بھی موجودات میں نہیں ہے۔
لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ اس لیے اس کی ذات اور صفات کو کسی شخص کے
لیے دیکھنا یا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی تھوڑی بہت معرفت اس کی نشانیوں
سے ہو سکتی ہے اور یہ نشانیاں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ اس لیے تمام الٰہی
میں بھی قرآن نے صرف ان چند نشانیوں کا حوالہ دیا ہے جن کا مشاہدہ عام
آدمی کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔ جیسے زمین اور آسمان کی وسعتوں کا۔ بادلوں سے
پانی کے برسنے کا۔ نہروں اور دریاؤں کے زمین پر جاری ہونے کا۔
اور پانی سے طرح طرح کے پھلوں، پھولوں اور غلوں کے پیدا ہونے کا۔

تذکیر بایام اللہ کے سلسلہ میں بھی صرف ان قوموں، اشخاص ا
تاریخی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے قرآن کے مخاطب اول یعنی عربوں
واقفیت تھی۔ جیسے حضرت آدم کی تخلیق، حضرت ابراہیم اور انبیاء بنی ا

کے مشہور واقعات، ابلیس کی سرکشی، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود کی گمراہیوں کے تذکرے۔ لیکن پورے پورے قصے بیان نہیں کیے گئے تاکہ سننے والے ان سے متاثر ہونے کی بجائے داستانوں کی دلچسپیوں میں گم ہو کر نہ رہ جائیں۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"ان قصص و حکایات کے بیان کا مقصد قصہ گوئی یا لوگوں کو اصل قصہ سے آگاہ کرنا نہیں ہے بلکہ ان قصوں کے ذکر کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی جائے کہ شرک اور نافرمانی کا کتنا دردناک انجام ہوتا ہے اور ان لوگوں پر کس طرح عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے اور اہل ایمان اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص اور اطاعت گزار بندوں کی ہمیشہ نصرت اور حمایت کرتا ہے۔"

علم تذکیر بموت میں قرآن کریم موت اور موت کے بعد کے واقعات بیان کرتا ہے۔ جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی تکلیفوں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن چونکہ انسان اپنی حیات دنیوی میں ان کی شدت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے قرآن دنیاوی چیزوں کی مثالیں دے کر اس کو سمجھاتا ہے۔ علامات قیامت میں نزول مسیح، دجال اور یاجوج ماجوج کا تصور اسا ذکر کر دیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ احکام قرآنی کے بنیادی نکات بتاتے ہیں۔ اول یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دین ابراہیم کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس لیے اسلام میں ابراہیمی شریعت کو باقی رکھا گیا البتہ تعمیم کی جگہ تخصیص کر دی گئی اور بعض میں اضافہ کر دیا گیا۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اہل عرب کو ہدایت دی جائے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اسلامی شریعت کی بنیاد

عرابوں کے رسوم و رواج پر رکھی جائے۔ اور تمام گمراہیوں کو دور کرنے اور اصلاح احوال کرنے کے لیے قرآن کو راہ نما بنایا جائے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں ارکان و احکام اسلام کو مجمل بیان کیا گیا ہے۔ آنحضرت نے ان کی تفصیلات بتائیں۔ مثلاً قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اور نہایت تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی روشنی میں مساجد کی تعمیر، نماز باجماعت اور اوقات نماز کے احکام مرتب کیے۔ اور زکوٰۃ کے مسائل کی تفصیلات بیان فرمائیں۔ قرآن کی مختلف سورتوں میں مختلف امور کے لیے الگ الگ احکام آئے ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں روزے اور حج کے۔ سورۃ بقرہ، سورۃ انفال اور بعض اور مقامات پر جہاد کا حکم، حدود کا ذکر، سورۃ مائدہ اور سورۃ نور میں ہے۔ میراث کا ذکر سورۃ نساء میں اور نکاح اور طلاق کے مسائل سورۃ بقرہ اور سورۃ نساء اور سورۃ طلاق میں آئے۔

ان مسائل و احکام کے علاوہ وہ سوالات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وقتاً فوقتاً کیے گئے اور قرآن کریم نے ان کے حل ارشاد فرمائے۔ مثلاً یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ (البقرہ ۱۸۹) (اے نبی لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں) یا یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (البقرہ ۲۱۵) (لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں) یا یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّھْرِ الْحَرَامِ (البقرہ ۲۱۷) (لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے) اس کے علاوہ ایسے واقعات بھی ہیں جن سے مومنوں کے ایثار و قربانی اور منافقین کی خود غرضی اور بخل کا پتہ چلتا ہے۔ اس طرح کے حالات بھی پیش آئے جب مسلمانوں کو زجر و تنبیہ کی گئی یا تعریفاً و اشارتاً کچھ کہا گیا۔ بعض مواقع پر امر یا نہی کی ضرورت لاحق ہوئی اور اس سلسلے میں آیات نازل ہوئیں۔ نیز

غزوات النبیؐ، مسجد ضرار اور معراج کے بارے میں بھی قرآن حکیم میں حوالے جا بجا اور مذکور ہیں موجود ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک باب میں فہم قرآن میں پیش آنے والی دشواریوں کے اسباب سے بحث کر کے ان کے حل بتائے ہیں۔ پھر قرآن مجید کے غریب الفاظ کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ ان کی بہترین شرح وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ابن ابی طلحہؓ سے نقل کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم مسئلہ ناسخ و منسوخ کا ہے۔ مفسرین نے اس سلسلہ کو بہت بڑھا دیا تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے ان کو گھٹا کر صرف پانچ آیتوں تک محدود کر دیا ہے۔ اس سے بہت سی الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس حد بندی سے یہ مسئلہ بہت آسان ہو گیا۔

ناسخ و منسوخ آیات کی تعیین کے سلسلہ میں جو الجھن پیش آئی شاہ ولی اللہ صاحب اس کا سبب متقدمین و متاخرین کی اصطلاحات کے اختلافات کو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک متقدمین نے نسخ کے لفظ کو جن مختلف مواقع پر استعمال کیا ہے اگر ان سب اختلافات کو سامنے رکھا جائے تو منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ متاخرین نے نسخ کے لفظ کو جس معنی میں استعمال کیا ہے اس اعتبار سے منسوخ آیات کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے منسوخ شدہ آیات کو بیان کرنے میں ابن عربی کا اتباع کیا ہے اور ان کی تعداد کو گھٹا کر بہت کم کر دیا ہے۔ شاہ صاحب اس میں مزید کمی کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک پانچ سے زیادہ آیات کا منسوخ ہونا ثابت نہیں ہے۔"

فہم قرآن اور تفسیر میں دوسری دشواری شاہ صاحب کے نزدیک اسباب نزول کی معرفت ہے۔ یعنی صحیح طریقہ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ کون سی آیت کب

اور کس موقع پر نازل ہوئی۔ اسی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے شاہ صاحب
مفسرین کو ان کی ذمہ داری سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"مفسر کے لیے صرف دو چیزوں کا علم ضروری ہے۔ ایک تو وہ
واقعات جن کی طرف آیات میں اشارہ کیا گیا ہو کیونکہ ان
آیات کا صحیح مفہوم سمجھنا بغیر ان واقعات کے علم کے ناممکن ہے۔
دوسرے وہ واقعات جن کی وجہ سے کسی عام حکم میں کسی طرح کی
تخصیص ہوئی ہو یا جو آیات کے مفہوم میں تبدیلی کر دیتے ہوں
اور انہیں ظاہری مفہوم کی طرف سے کسی دوسری طرف موڑ دیتے
ہوں۔ کیونکہ ان واقعات کے علم کے بغیر بھی آیات کا صحیح مفہوم
اور مقصد متعین کرنا ناممکن ہے۔ ان دونوں قسم کے واقعات کے
علاوہ بقیہ تمام چیزیں مفسر کے لیے غیر ضروری ہیں۔"

جن چیزوں کو شاہ صاحب نے مفسرین کے لیے غیر ضروری بتایا ہے ان کی
دو بہت اہم ہیں۔ اول اسرائیلیات دوم مشرکین و یہود کے عقائد اور عادات
و رسومات۔ اسرائیلیات میں انبیاء علیہم السلام کے وہ قصے اور واقعات
شامل ہیں جو اہل کتاب سے منقول ہیں اور عموماً مشتبہ اور غیر یقینی ہیں۔
ان کے بارے میں شاہ صاحب نے بخاری کی یہ روایت بیان کی ہے کہ نہ تو
ہم ان کی تصدیق کریں اور نہ تکذیب کریں۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمیں
اہل کتاب کے بیان کیے ہوئے قصوں کی طرف توجہ ہی نہ دینا چاہیے۔
عادات و رسوم جاہلیت کے بارے میں یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین تو
ان واقعات کو اس لیے بیان کرتے تھے کہ وہ قرآن کی آیتوں میں بیان
کیے جانے والے حقائق اور کلیات کی اچھی تصویر پیش کرتے تھے ان کا مقصد قصہ
بیان کرنا نہیں ہوتا تھا۔ بعد کے مفسرین کے لیے ان واقعات کی وہ حیثیت

نہیں رہی۔ اس لیے اگر ان کے بیان کرنے پر ذیا۔ توجہ صرف کی گئی تو مقصود اعلیٰ آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا اور ذہن قصہ کہانی میں الجھ کر رہ جائے گا۔ اس لیے ان واقعات کی جزئیات و تفصیلات بیان کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

ان امور سے آگاہ کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب مفسر کو حسب ذیل دو باتوں کا مشورہ دیتے ہیں۔

(۱) ایسے غزوات اور واقعات جن کی طرف آیات میں اشارہ موجود ہو اور ان آیات کے مفہوم سمجھنے کا انحصار ان واقعات کے علم پر ہو اختصار بیان کر دے۔

(۲) اگر آیات میں کوئی قید یا شرط ہو یا کسی خاص نکتہ پر زور دیا گیا ہو جس کا سمجھنا شانِ نزول کے علم پر موقوف ہو تو ان آیات کی تفسیر لکھتے وقت شانِ نزول بھی بیان کر دے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے بعض ان احکام، اشارات اور واقعات کی توجیہ کی مثالیں پیش کی ہیں جو عام آدمی کی فہم سے ماوراء ہیں۔ لہٰذا مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان توجیہات پر عبور رکھتا ہو اور موقع مناسب پر انہیں پیش کر سکے۔ مثلاً ذیل کی آیت میں :

يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا (مریم ۲۷ تا ۲۸)

اشارہ حضرت مریم علیہا السلام کی طرف ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد اہلِ فلسطین نے ان کو اس خطاب سے مخاطب کیا تھا۔ اب اگر مفسر یہ وضاحت نہ کرے کہ جس "ہارون" کا اس آیت میں ذکر ہے وہ حضرت

موسیٰؑ کے بھائی حضرت ہارون نہیں ہیں بلکہ یہ حضرت مریم کے ہم عصر کوئی دوسرے ہارون ہیں تو ایک عام آدمی اس الجھن میں پڑ جائے گا کہ حضرت مریم جو حضرت عیسیٰؑ کی والدہ تھیں حضرت ہارون کی بہن کیسے ہو گئیں جب کہ حضرت ہارون ان سے تقریباً ساڑھے بارہ سو سال پہلے گزر چکے تھے۔

اسی سلسلہ میں شاہ صاحب نے بعض اور مباحث دیے ہیں جن کا تعلق قواعدِ زبان سے ہے مثلاً حذف، ابدال، انتشارِ ضمیر، انتشارِ آیات وغیرہ۔ ان سب کی وضاحت انہوں نے متعلقہ آیات کی مدد سے کی ہے۔ پھر آیات محکمات اور متشابہات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ قرآن کا نہایت اہم بالشان مسئلہ ہے کیونکہ سورہ آل عمران میں دونوں قسم کی آیات کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ (آل عمران ۷)

(ترجمہ: اے نبیؐ وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں۔ اور دوسری متشابہات جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کے معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔)

> "محکم آیات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے مفہوم کے متعلق عربی زبان کے ماہر شخص کو کسی قسم کا تردد یا تذبذب نہ ہو اور ان کا صاف و صریح مفہوم کے سوا کوئی دوسرا مفہوم ہو ہی نہ سکے —— زبان دانی اور مہارت کا معیار البتہ قدیم اہل عرب ہیں۔ اس زمانہ کے وہ نکتہ سنج نہیں جو اپنی بے محل موشگافیوں اور قیاس آرائیوں کی بدولت محکم کو متشابہ اور صاف واضح آیات کو گنجلک اور مبہم بنا دیتے ہیں۔ اور سامنے کی باتیں بھی بعید از فہم معلوم ہونے لگتی ہے۔"

> "متشابہ آیات سے وہ آیات مراد ہیں جن کے بیک وقت دو معنی مراد لیے جا سکتے ہوں اور بظاہر کوئی ایسا قرینہ موجود نہ ہو جس سے کسی ایک معنی کے حق میں فیصلہ کیا جا سکتا ہو۔ اس کے احتمالات کی وجوہ مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک ہی ضمیر بیک وقت دو مختلف اسموں سے متعلق ہو سکتی ہے۔ کسی آیت میں کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہو جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں معانی کی حیثیت مساوی ہو۔ کسی جملہ میں کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہو جس کا دو مختلف کلمات پر عطف ہو سکتا ہو۔ وغیرہ"

متشابہات ہی کے ذیل میں کنایہ، تعریض، مجاز عقلی اور حروف مقطعات بھی آجاتے ہیں۔ جیسے الٓمٓ ۔ الٓرٰ ۔ طٰہٰ ۔ طٰسٓمٓ ۔ حٰمٓ ۔ یٰسٓ وغیرہ

یوں تو قرآن کریم ہر اعتبار سے ہی ایک معجزہ ہے تاہم اپنی فصاحت و بلاغت اور لفظی اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے تو اس کو دنیا کا عظیم ترین معجزہ قرار دینا پڑتا ہے۔ جس قوم میں یہ کتاب نازل ہوئی اس کو اپنی زبان دانی پر اس قدر ناز تھا کہ وہ اپنے سوا اقوام عالم کو عجمی یعنی گونگا کہتی تھی۔ اس

قوم کے ایک ایک فرد کو اس کتاب نے چیلنج دیا کہ اگر تم میں کچھ صلاحیت ہے تو اس کلام کے مقابلہ میں صرف ایک آیت ہی کہہ کر لے آؤ۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ تم ہرگز اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکو گے۔ واقعی کسی نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا اور نہ کسی نے اس کے جواب میں لکھنے کی جرأت کی۔ قرآن کا یہ دعویٰ اور چیلنج آج تک قائم ہے۔

قرآن کریم کی ایک خوبی اس کے مختلف اسالیب بیان بھی ہیں۔ دنیا کی کوئی کتاب بھی اٹھا کر دیکھ لیجیے اتنے مختلف اسالیب کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ کون سا انداز بیان ہے جو اس میں اختیار نہیں کیا گیا کہیں عامیانہ انداز ہے کہیں شاعرانہ اور کہیں خطیبانہ، کہیں نثر عاری کے نمونے ہیں کہیں مسجع و مقفیٰ عبارتیں ہیں۔ کہیں سلیس الفاظ ہے کہیں دقیق، کہیں سادہ ہے کہیں رنگین۔ غرض جو نمونے اس میں پیش ہوئے ہیں وہ اس بات کی بین دلیل ہیں کہ یہ کسی فانی مخلوق کا کلام نہیں ہے بلکہ کسی قادر مطلق ہستی کی تجلیات کا نمونہ ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جس ہستی کا یہ کلام ہے اس نے اپنا کمال فن دکھانے کے لیے یہ نمونے پیش نہیں کیے بلکہ ان کا غرور توڑنے کے لیے جن پر ان کو سب سے زیادہ ناز تھا۔ اور اسی کو اسی چیز سے لاجواب کر دیا ہے جس پر اس کو سب سے زیادہ ناز تھا۔

بہرحال ایک مفسر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قرآن کی ان خوبیوں سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتا ہو تاکہ وہ قارئین میں قرآن فہمی کا صحیح ذوق پیدا کر سکے۔

"اَلْفَوْزُ الْکَبِیْر" سے تفسیر کے یہ اصول بیان کر دینے کے بعد حسب ذیل مقاصد ہیں۔

(۱) مفسر کی کیا کیا ذمہ داریاں ہیں اور ان ذمہ داریوں سے

عہدہ برآ ہونے کے لیے اس میں کتنی وسیع النظری سے کام لینا پڑتا ہے اور کن کن باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

(۱۲) چونکہ اردو زبان میں تقریباً تمام تفسیریں "الفوز الکبیر" کی تصنیف کے بعد لکھی گئی ہیں اس لیے تدریجی طور پر اردو تفاسیر کے لکھنے والوں نے کس حد تک ان اصولوں کو جو اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں اپنے سامنے رکھا۔

(۱۳) اردو تفاسیر کا جائزہ لیتے وقت آپ یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مفسرین نے اپنی ذمہ داریوں کو کس حد تک پورا کیا ہے۔ اور کون سی تفسیر زیادہ مفید ہے اور کون سی کم۔

اردو میں تفسیر نویسی کا آغاز اور اردو تفاسیر کا

انفرادی جائزہ

جیسا کہ مقدمہ میں لکھا جا چکا ہے، برصغیر میں دورِ مغلیہ سے پہلے فقہ اور تصوف کی جانب علماء کی توجہ زیادہ رہی اور خالص علومِ شرعیہ یا خصوصاً تفسیر اور حدیث سے بہت کم اعتنا کیا گیا یہی وجہ ہے کہ عربی اور فارسی میں تفسیریں بہت بعد میں لکھی جانی شروع ہوئیں۔ سب سے پہلے اس طرف توجہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی ہوئی۔ پھر شاہ عبدالرحیم نے کچھ کام کیا لیکن باقاعدہ اس کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں ہوا۔ انہوں نے بڑے پیمانہ پر قرآن، تفسیر اور حدیث اور ان سے متعلق علوم کی تدریس کی اور ان موضوعات پر تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ انہوں نے تفسیر کے اصول

بھی نہایت وضاحت سے بیان کئے۔ لیکن ان کی جملہ تصانیف عربی اور فارسی میں ہیں۔ تاہم ان کے صاحبزادگان اور متبعین نے ان علوم کو اردو میں بھی پیش کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور اردو زبان کا دامن پھیلتا چلا گیا۔ خوش قسمتی سے قرآن شریف کے اردو تراجم اور تفاسیر اس کثرت سے ہوئیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ زبان اس معاملہ میں عربی کے سوا دنیا کی تمام زبانوں سے گوئے سبقت لے گئی۔ اور اب بھی اس میں جس تیزی سے اضافے ہو رہے ہیں اس کی مثال دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔ تفسیریں براہ راست اردو میں لکھی بھی جا رہی ہیں اور دوسری زبانوں خاص کر عربی سے ترجمے بھی ہو رہے ہیں۔ یہ تفسیریں جزوی بھی ہیں اور پورے قرآن کی بھی۔ تاہم ان سب کا جائزہ لینے کے لیے ان کی دو قسمیں کی جاتی مناسب دکھائی دیتی ہیں (۱) براہ راست اردو میں لکھی جانے والی تفاسیر (۲) ترجمے۔

براہ راست اردو میں لکھی جانے والی تفاسیر

اردو میں تفسیر نویسی کا آغاز کب ہوا۔ اس کا پتہ چلانا تو مشکل ہے البتہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحقیق کے بموجب سب سے قدیم نمونہ سورۂ یوسف کی تفسیر ہے جو پرانی گجراتی اردو میں ہے۔ مگر چونکہ جو نسخہ بابائے اردو کو ملا وہ ناقص الطرفین تھا اس لیے اس کے زمانہ کا تعین مشکل ہے۔ تاہم بعض قیاسات کی بنیاد پر اس کو گیارہویں صدی کے نصف آخر کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد تفسیر قرآن مجید از سورۂ مریم تا آخر آتا ہے مگر اس میں بھی نہ مصنف کا نام دیا گیا ہے اور نہ سنہ تصنیف۔ تاہم زبان و بیان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ بارہویں صدی ہجری کا ابتدائی حصہ ہے۔

اردو میں تفسیر نویسی کا صحیح معنوں میں ارتقاء اس وقت سے ہوا جب اورنگ زیب نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کو ختم کر کے اورنگ آباد میں قیام کیا اور اس شہر نے کچھ عرصہ کے لیے سلطنتِ مغلیہ کے دارالحکومت کی سی شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد شمالی ہند اور دکن کے باشندوں کے اختلاط سے اردو زبان میں ایک گونہ نکھار پیدا ہوا۔ اور وہی چیز جو بقول قائم چاند پوری تھا:

"اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی" منجھ منجھا کر اردو کے قالب میں ڈھل گئی۔ اصناف شاعری میں بلحاظ بہ اعتبار زبان حسن و دلکشی پیدا ہو گئی۔ اور نثر میں بھی لطف و شگفتگی و صفائی دینے لگی۔ اسی صورت میں تفسیر نویسی میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی۔ پھر جب اورنگ زیب کی وفات کے بعد دارالحکومت دوبارہ دہلی منتقل ہوا تو زبان میں مزید شستگی پیدا ہوتی گئی۔ اور آخر ش اس نے اردو معلی کی شکل اختیار کر لی۔ اسی دور سے دور میں جو تفسیریں لکھی گئیں ان کے مصنفین کے نام اور ان کی تصنیف کے سنین بھی عام طور سے معلوم نہیں۔ یہاں ترتیب وار اس زمانہ کی تفسیروں کے نام درج کیے جاتے ہیں:

(۱) تفسیر سورہ ہود و سورہ الحجر (۲) تفسیر قرآن مصنفہ شاہ محمد وم حسینی (۳) تفسیر سورہ بنی اسرائیل و کہف (۴) تفسیر مراد اللہ ارشاد مراد اللہ انصاری سنبھلی ۱۱۸۵ھ (۵) تفسیر مرتضوی از شاہ غلام مرتضیٰ جنونی ۱۱۹۳ھ۔

شاہ رفیع الدین دہلوی کے زمانہ سے قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر کا ایک دوسرا دور شروع ہوا جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک ممتد ہے۔ اس دور میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اثر سے اردو نثر نگاری کا رواج عام ہو گیا جس کی وجہ سے اس زمانہ میں کافی تعداد میں تفسیریں لکھی گئیں۔ ان میں سے

بعض تفاسیر کے نام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تفسیر موضح القرآن، از شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (۲) تفسیر قرآنی موسوم حقانی، از سید شاہ حقانی نبیرہ سید شاہ برکت اللہ ۱۲۰۶ھ (۳) تفسیر قرآن، از حکیم محمد شریف خاں دہلوی (۴) تفسیر سورۂ فاتحہ، از حضرت سید احمد شہید (۵) تفسیر مجددی المعروف بہ رؤفی، از شاہ رؤف احمد ۱۲۴۹ھ (۶) تفسیر پارہ عم (۷) تفسیر قرآن مجید جو پارہ عم کی تفسیر ہے۔ (۸) تفسیر تنزیل یا فوائد البدیعیہ از سید بابا قادری حیدرآبادی (۹) تفسیر اذا جاء از امین الدین (۱۰) کتاب الحمد یا تفسیر تفریح، از مولوی میر شجاع الدین (۱۱) باب الاخرۃ (منظوم تفسیر قرآن) قاضی عبدالسلام بدایونی ۱۲۴۴ھ (۱۲) تفسیر سورۂ یوسف، از حکیم محمد اشرف کا ندھلہ ۱۲۶۳ھ۔

بیسویں صدی عیسوی میں دیگر علوم و فنون کی طرح قرآن کی تفسیریں بھی بہت بڑی تعداد میں اور نہایت شرح و بسط سے لکھی گئیں۔ چونکہ اس صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا ذہنی طور پر اثر بہت بڑھا ہوا تھا اس لیے شاہ صاحب نے فوز الکبیر میں جو اصول تفسیر بتائے ان کا خاص طور پر خیال رکھا گیا اور انہوں نے ہی جو خطوط قائم کر دیے تھے انہیں پر کام ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ دورِ جدید میں جو ذہنی تبدیلی ہوئی ہے اور جس طرح کی سوچ نے جنم لیا ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفسرین کو بھی اسی کے مطابق انداز بیان اور طرز استدلال کو اختیار کرنا پڑا۔ مثلاً اگر پہلے فلسفیانہ اور منطقیانہ طرز اختیار کیا جاتا تھا تو اب سائنس کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر کئی مفسرین نے سائنسی طرز اختیار کیا ہے۔ اور قرآن میں جو سائنسی مسائل ضمناً آ گئے ہیں جدید ذہن کو مطمئن و متاثر کرنے کیلیے

ان مسائل کو سائنسی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً

اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا
ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ

(الرعد ۔ آیۃ ۲)

(ترجمہ) وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں، پھر وہ اپنے تخت پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند کیا۔

اس کی تفسیر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اس طرح فرمائی ہے۔

"بہ الفاظ دیگر آسمانوں کو غیر محسوس اور غیر مرئی سہاروں پر قائم کیا۔ بظاہر کوئی چیز فضائے بسیط میں ایسی نہیں ہے جو ان بے حد و بے حساب اجرام فلکی کو تھامے ہوئے ہو۔ مگر ایک غیر محسوس طاقت ہے (یعنی کشش باہمی) جو ہر ایک کو اس کے مقام اور مدار پر روکے ہوئے ہے اور ان عظیم الشان اجرام کو زمین پر یا ایک دوسرے پر گرنے نہیں دیتی۔"

لیکن بعض جدت پسند یا انتہا پسند حضرات نے اس انداز کو اتنا بڑھایا ہے کہ بعض آیات کو زبردستی سائنسی مسائل پر منطبق کرنے کی کوشش کی اور قرآن کریم سے موجودہ دور کی بعض ایجادات کی پیشگوئی کرا دی۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا
مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ
اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ؕ

(الرحمٰن ۔ ۳۳)

ترجمہ:۔ اے گروہ جن و انس اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں

سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ تم نہیں بھاگ سکتے
اس کے لیے بڑی قوت کی ضرورت ہے۔

اس بیان کی تفسیر ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔ "اس بات میں کوئی شک
نہیں رہ جاتا کہ یہ آیت اس امکان کو ظاہر کرتی ہے کہ ایک دن انسان وہ
مقصد حاصل کر لے گا جس کو آج ہم (غالباً غیر موزوں طریقہ پر) "خلا کی
تسخیر" کا نام دیتے ہیں۔"

سچ پوچھیے تو یہ آیت اس امکان کی نفی کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے تو انتہا کر دی ہے کہ اس آخری اور جامع کتاب
کی پوری تفسیر ہی اس انداز سے کر ڈالی کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر ایک
تفسیف العلوم ہونے لگی ہے۔ جیسے سائنٹیفک روشن خیال (؟) مرتب کی
تحقیقات اس سے ظاہر ہے۔

بعض حضرات کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ جب شمس و قمر، ارض و سماوات
اور لیل و نہار کے مسخر ہونے کے اشارے قرآن کریم میں موجود ہیں یا پھر تسخیر
کائنات کی مخالفت کیسے کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ حضرات ان آیات کے معنوں
پر غور کریں تو پتہ چل جائے گا کہ ہر جگہ تسخیر کا فاعل اللہ تعالیٰ نے خود کو
قرار دیا ہے اور کسی ایک مقام پر بھی انسان کو حکم نہیں دیا گیا کہ وہ کائنات
کو یا شمس و قمر کو تسخیر کرے۔ چنانچہ قرآن میں ۱۶ جگہ "سخّر" کا لفظ استعمال
ہوا ہے جس کے معنی ہیں اس نے مسخر کر دیا، اس نے تابع کر دیا۔ اس نے
بس میں کر دیا، اور "اس نے" سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ۳ مقام پر
سخّرنا کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں ہم نے مسخر کر دیا۔ ہم نے تابع کر دیا۔
ایک جگہ لفظ "سخّرنٰھا" وارد ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں ہم نے اسکو
مسخر کر دیا۔ ہم نے اس کو تابع کر دیا۔ ذیل میں چند آیات درج کی جاتی ہیں۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (الرعد آیت ۲)

ترجمہ:- وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں، پھر وہ اپنے تخت پر جلوہ فرما ہوا، اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ وَکُنَّا فٰعِلِیْنَ

(الترجمہ:-) (الانبیاء آیت ۷۹)

(ترجمہ) داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے۔ اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے۔

واضح رہے کہ اس آیت کریمہ میں "کُنَّا فٰعِلِیْنَ" کہہ کر اللہ نے انسان کو اس غلط فہمی سے بچا لیا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے"۔

کَذٰلِکَ سَخَّرْنٰھَا لَکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (الحج آیت ۳۶)

(ترجمہ) ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ کائنات تو بڑی چیز ہے، انسان تو جانوروں کو بھی قابو میں نہیں کر سکتا۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے فضل و کرم سے انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ تاکہ وہ ان سے اپنی حیات دنیوی میں مختلف کام لے سکے۔ جہاں تک انسان کے عجز کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے آیت میں اسی سے اپنے اس عجز کا اعتراف کرا دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ (الزخرف آیۃ ۱۲ تا ۱۳)

(ترجمہ) اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے

بات کو زیادہ طول نہ دے کر یہ بتا دینا کافی ہے کہ جن لوگوں نے فلکیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس وقت ہی کائنات کی وسعت اتنی ہے کہ ہزاروں سال تک جدوجہد کرنے کے بعد بھی آج تک انسان کو اس کا علم نہیں ہو سکا۔ پھر یہ کائنات ایک حالت میں قائم بھی نہیں ہے۔ بلکہ بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ انسان کائنات کی وسعتوں کا علم کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کو تسخیر کرنے کا تو سوال ہی کیا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے آدم کو خلافتِ ارضی عطا فرمائی تھی۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ کرہ ارض پر اس کا بندہ بن کر رہے اور کائنات کی تسخیر کے چکر میں نہ پڑے۔ اس ذات واحد نے جو چیز جس کام کے لیے بنائی ہے اسے وہ کام لے۔

بہرحال ان باتوں سے صرف نظر کر کے بیسویں صدی میں لکھی جانیوالی تفاسیر کی فہرست دی جاتی ہے۔ وَهُوَ هٰذَا

(١) تفسیر فتح المنان معروف بہ تفسیر حقانی (١٣٠٥ھ - ١٣٢٨ھ) (محمد عبد الحق دہلوی)

(٢) تفسیر بیان القرآن (١٣٢٣ھ - ١٣٣٥ھ) (مولانا اشرف علی تھانوی)

(٣) تفسیر قادری (١٣١٩ھ) (کشف القلوب) مولانا محمد الحسینی)

(٤) احسن التفاسیر (١٣٣٥ھ) (مولانا سید احمد حسن)

(٥) معارف القرآن (مفتی محمد شفیع دیوبندی)

(٦) تفہیم القرآن (مولانا ابو الاعلیٰ مودودی)

(٧) فیوض القرآن ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی

(٨) القرآن الحکیم مع ترجمہ و تفسیر (مولانا عبد الماجد دریا بادی)

(٩) تفسیر جواہر القرآن (مولانا غلام اللہ خاں)

(١٠) خزائن العرفان فی تفسیر القرآن (مولانا سید محمد نعیم الدین)

(١١) تدبر قرآن (مولانا امین احسن اصلاحی)

عربی تفاسیر کے اردو ترجمے

(١) تفسیر ابن جریر (پہلا پارہ) بیت الحکمت دیوبند۔

(٢) تفسیر عزیزی موسوم بہ تفسیر فتح العزیز۔ سورہ بقرہ حصہ اول ایچ۔ ایم سعید کمپنی۔

(٣) انوار الرحمن ترجمہ و تفسیر آل عمران مترجمہ عبد الصمد۔ ادارہ علمیہ۔

(۴) لسان التفاسیر اردو ترجمہ تفسیر فتح العزیز (فاتحہ و بقرہ کا) مترجم مولانا محمد علی چاند پوری، مطبع فاخری، دہلی۔

(۵) ترجمہ تفسیر ابن عباس۔ ترجمہ تنویر المقباس فی تفسیر ابن عباس مرتبہ علامہ مجد الدین شیرازی کا۔ مترجم مفتی محمد نعمان، البربانی شاگرد مولانا عبد الحی فرنگی محلی۔ امیر الدین گلشن ہند۔ آگرہ۔

(۶) ترجمہ تفسیر احمدی (تالیف شیخ احمد عرف ملا جیون الجھنوی المتوفی ۱۱۳۰ھ) ترجمہ الحکیم سید امیر حسن خاں سنبھل۔

(۷) ترجمہ تفسیر ابن عربی (شیخ اکبر محی الدین ابن عربی) ترجمہ از امیر حسن خاں سنبھل۔

(۸) ترجمہ تفسیر بیضاوی (انوار التنزیل۔ قاضی ناصر الدین ابو الخیر عبد اللہ بن عمر البیضاوی۔ متوفی ۶۸۵ھ) قاسمی پریس دیوبند۔

(۹) ترجمہ تفسیر جلالین (تالیف علامہ جلال الدین بن محمد بن احمد محلیؒ اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ) مترجم محمد الجواد سنبھلی۔ اعجاز محمد پریس آگرہ ۱۹۰۵ء۔

(۱۰) ترجمہ تفسیر جلالین (جلد اول) از قلم محمد مہدی ۱۸۵۹ء / ۱۲۷۵ھ

(۱۱) تفسیر کمالین شرح اردو جلالین (از مولانا محمد نعیم دیوبندی استاذ تفسیر قرآن)

(۱۲) تفسیر فی ظلال القرآن (پارہ الٓمٓ) از سید قطب شہید (ترجمہ مولانا سید حامد الرحمٰن)

(۱۳) تفسیر مظہری (قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی) تشریحی ترجمے ضروری اضافات (از مولانا سید عبد الدائم الجلالی)

(۱۴) تفسیر ابن کثیر۔

(۵) ریاض دلکشا۔ (تفسیر سورہ یوسف)

ابتدائی دور کی اردو تفاسیر

ابتدائی دور کی اردو تفسیروں کی مندرجہ ذیل چند خصوصیات ہیں۔ یہ

(۱) تفسیریں مکمل نہیں بلکہ جزوی ہیں اور عموماً ایک ایک دو دو سورتوں کی مختصر تشریح کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۲) یہ تفسیریں، ترجمہ سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ مترجمین نے وضاحت کے لیے ترجموں میں چند الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے۔

(۳) ہر تفسیر کسی مخصوص علاقہ کی مقامی بولی میں کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وہاں کے عوام کے لیے لکھی گئی تھی۔ ویسے بھی یہ ایک فطری امر ہے کہ عوام تک جو بات پہنچائی ہوتی ہے اس کا بہترین ذریعۂ ابلاغ ان کی اپنی روزمرہ کی زبان ہوتی ہے۔ علماء اور خواص تو قرآنی تعلیم کو براہ راست قرآن کے متن اور عربی تفاسیر سے اخذ کر سکتے ہیں لیکن عوام کے لیے یہ بات ممکن نہیں ہوتی لہٰذا مبلغین نے ان کو سمجھانے کے لیے ضروری خیال کیا کہ خود ان کی زبان اور ان کے محاورہ میں اپنی بات ان تک پہنچائیں۔ چنانچہ تحریر اور تقریر جو ابلاغ کے دو طریقے ہیں ان دونوں میں انہوں نے اسی اصول کو برتا اور دیگر امور کی طرح قرآنی تعلیم بھی عوام کو ان کی اپنی زبان اور عام فہم انداز میں پیش کی۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی سورہ یوسف کی تفسیر ہے جو
کے مخطوطات کی تلاش کے دوران یہ تفسیر ہمیں بابائے اردو مولوی عبدالحق
کے ہاتھ آئی تھی اور انہوں نے اس کو تحقیق کی دنیا میں روشناس کرا
بعد بارہویں صدی کے آخر تک دریافت ہونے والی تفسیروں میں
زمانی کے اعتبار سے حسب ذیل تفاسیر آتی ہیں۔

(۱) تفسیر سورہ ہود اور سورہ الحجر
(۲) تفسیر حسینی
(۳) تفسیر سورہ بنی اسرائیل و سورہ کہف
(۴) تفسیر مرادی از شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی
(۵) تفسیر مرتضوی از شاہ غلام مرتضیٰ جنوں ۱۱۹۳ھ

تفسیر سورہ یوسف

سورہ یوسف کے ترجمے اور تفسیر کا وہ واحد نسخہ جس کے ذریعے
حکایت چلا، ناقص الطرفین ہے۔ اسی لیے اس کے مصنف اور سنِ تصنیف
بارے میں کچھ کہنا تقریباً ناممکن ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے
علامات و قرائن سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ دسویں صدی ہجری کے آخر
صدی کے اوائل کی تصنیف ہے۔ اور چونکہ ان کے اس قیاس کی تردید
کے لیے کوئی معقول دلیل موجود نہیں ہے اس لیے ان کے اس دعوے
کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ دسویں صدی کا آخری ربع اکبر بادشاہ
حکومت ہے اور گیارہویں صدی کا پہلا ربع دورِ اکبری اور دورِ جہانگیری
ہے۔ جس کے پیشِ نظر یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ یہ تفسیر دورِ اکبری کے
یا عہدِ جہانگیری کے اوائل میں منصۂ شہود پر آئی۔ اس نسخے کے

صفحے غائب ہونے کی وجہ سے اس کے مصنف یا مؤلف کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

بابائے اردو اس ترجمہ و تفسیر کی زبان گجراتی اردو بتاتے ہیں۔ اور اس کے لیے وہ گجراتی زبان کے ان الفاظ کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جو اس نسخے میں استعمال ہوئے ہیں جیسے:

اِنے (اور)، تمی (تم نے، میں)، ہوں (میں)، ڈوسی (بڑھیا)،
ٹیک (تھوڑا)[1] اور بیر (عورت)

ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر یا جہانگیر کے زمانہ میں اردو تہذیبی اور سرکاری زبان تھی۔ جبکہ اردو نثر کو اور موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے بہت کم کام میں لایا جاتا تھا۔ ہمارے علمائے تبلیغ دین کے کاموں سے غافل نہیں تھے۔ اور وہ مرکزِ حکومت سے دور رہ کر گجرات جیسے علاقہ میں وہاں کی عوامی زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر سے عوام الناس کو واقفیت دلا رہے تھے۔ اگرچہ اس وقت یہ کام اپنے ابتدائی مرحلے سے گزر رہا تھا تاہم اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔

تفسیر کی زبان سادہ اور عام فہم ہے البتہ ترجمہ میں کہیں کہیں مترجمین سے اختلاف دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کہ اس سورہ کے آخری حصہ میں بتایا گیا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو جو عزیز مصر یا اس کی نیابت کے منصب پر فائز تھے، اپنے بھائیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام آپ کے فراق میں روتے روتے نابینا ہو گئے ہیں، تو آپ نے کسی کو اپنی قمیص دے کر فلسطین بھیجا کہ وہ اس کو لے جا کر ان کے منہ پر ڈال دے۔ ان کے اس حکم پر عمل

---

[1] ان تمام الفاظ کو خاص گجراتی قرار دینا درست نہیں بلکہ اکثر دیہاتوں میں ملتے ہیں۔ ٹیک بمعنی تھوڑا، دہلی کے اکثر علاقوں میں عام ہے۔

کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس آگئی۔ اس واقعہ کو سورہ یوسف میں جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ الفاظ اور جو ترجمہ اس وقت کیا گیا تھا دونوں ذیل میں درج ہیں:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِىْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِىْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِىْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۱۲ : ۹۳)

ترجمہ:۔ یوسف نے کہا، لے جاؤ میری پیرہنی اِنے (اور) باپ کے منہ پر چھوڑ دو تو دیکھنے جو دیں گے اپنے پیچھے سے (تمام) آپس کے کم کوں لیو انے (اور) میرے نزدیک آؤ۔

مولانا فتح محمد جالندھری نے اس کا ترجمہ آجکل کی زبان میں اس طرح کیا ہے:

ترجمہ:۔ یہ میرا کرتا لے جاؤ اور اسے والد صاحب کے منہ پر ڈال دو۔ وہ بینا ہو جائیں گے۔ اور اپنے تمام اہل و عیال میرے پاس لے آؤ۔

گجراتی اردو کے ان چند الفاظ سے قطع نظر جن کا ذکر اوپر ہوا ہے چند ترکیب الفاظ کا ترجمہ بھی مولانا فتح محمد کے ترجمہ سے مختلف ہے۔ چنانچہ "قمیصی ھذا" کا ترجمہ اس تفسیر میں "میری پیرہنی" کیا گیا ہے۔ جبکہ مولانا فتح محمد نے "یہ میرا کرتا" سے اس مفہوم کو ادا کیا ہے۔

"فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِىْ" کا ترجمہ اس تفسیر میں "اور (ان) باپ کے منہ پر چھوڑ دو" کیا گیا ہے۔ جبکہ مولانا فتح محمد کا کیا ہوا ترجمہ یہ ہے "اور اسے والد صاحب کے منہ پر ڈال دو"

جس لفظ کا ترجمہ اس تفسیر میں "چھوڑ دو" کیا گیا ہے اس کے مفہوم کو مولانا فتح محمد نے "ڈال دو" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ یہ ترجمہ موجودہ محاورہ کے مطابق

بھی ہے اور فاعل کے مرادی معنوں کو بھی صحیح طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس کے
علاوہ "ابی" کا ترجمہ "میرے باپ" ہونا چاہیے۔ لیکن زیر نظر تفسیر میں اس کا
ترجمہ صرف "باپ" کیا گیا ہے۔ اور علامہ شیخ محمد نے "والد صاحب" کیا ہے۔
جس سے "میرے باپ" کا مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔

بہر حال اس فرق کو اس لیے نظر انداز کرنا پڑتا ہے کہ اب سے تقریباً
ساڑھے تین سو سال پہلے زبانِ اردو اپنے ارتقائی مراحل سے گزر رہی تھی اور
بعد میں بننے والے اردو زبان کے مراکز سے بہت پہلے اور گجرات جیسے دور افتادہ
علاقے میں اس نے اس وقت تک یہی شکل اختیار کی تھی۔ سچ پوچھیے تو اس دور
کے لحاظ سے یہ بہت صاف ستھری اور منجھی ہوئی زبان معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر
سید حمید شطاری نے صحیح لکھا ہے کہ:

"گیارھویں صدی کے ختم تک جملوں کی نحوی ترکیب منظم و مرتب
نہیں ہو سکی تھی اس لیے جس طرح بن پڑتا مفہوم ادا کر دیا جاتا تھا"[1]

تفسیر لکھتے وقت چونکہ مفسر کی ——— زبان میں روانی اور شستگی کا
ہونا قدرتی امر ہے۔ چنانچہ زیر نظر تفسیر سورۂ یوسف میں تفسیر کی زبان ترجمہ کی زبان
سے زیادہ سادہ اور سلیس ہے۔ ملاحظہ ہو:

"مجھے کہانی کے عہد دیا اسے کہ یاد دے ما تم ہمارے گزرتا ہے
انے (اور) لوتے سے آکھتا ہے۔ انے (اور) تسبی (تسبیح) کرتا ہے۔
انے (اور) ملوقوں (زخم زدہ) کو بوجھتا ہے۔ انے (اور) ور مشغول
کو کھان (کھانا) دیتا ہے۔ انے (اور) جے (جو) کچھو (کچھ)
آس پاس آوتا ہے سو محتاجوں کو بانٹ دیتا ہے۔ انے (اور) اس

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ۔ مقالہ پی ایچ ڈی جامعہ آگرہ دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۵۵

نہیں کھاتا۔ انے (اور) کہ جنھیں اس تھیں کوئی تخمیرہ نہیں ہوا
انیں بچھیں جب اسے منتقال بیکس سقیات کیا کہ اسے یاتاں
بچھوڑیں کی منے مگر پیغامبر ولا منے ہو میں یا پیغامبر ونا کے
پیشگروں (اولاد) منے ہوویں انے (اور) دوجیا یہ پوچھیا
کہ یوسف کی تنبیح بجاکسی منے کون کرتا ہے۔ انے (اور) اس پاس
کی پاس نہیں کچھ آدتا ہے۔ پچھلے انہوں نے کہا کہ عزیز کی چیسر
(عورت) جیپا کر نے بھیجیں ولیکن وسے قبول نہیں کرتا۔ انے
(اور) وسے پانچ پیراں دو جیاں کرلی ہیں۔ وسے بھی کھیچیاں ہیں
انہوں کا بھی کچھ قبول نہیں کرتا۔ انے (اور) انہوں کا بول بھی
نہیں سنتا ہے[1]

دکنی اردو کی ایک خصوصیت جو شعرا نے گولکنڈا اور بیجاپور کے یہاں اکثر دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ فعل ماضی مطلق ہیں "الف" سے پہلے "ی" کا استعمال اس طرح کیا جاتا تھا کہ یہ دونوں حروف ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مل جاتے تھے کہ "ی" کی آواز زیادہ نمایاں نہیں ہوتی تھی[2]۔ تقسیم ملک کے وقت تک یو۔ پی کے دیہاتوں میں اس کا استعمال عام تھا۔ لیکن صرف بولی کی حد تک۔ دکن میں ادبی تحریروں میں یہ چیز عام طور پر دکھائی دیتی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں بھی ایسے کئی نمونے دکھائی دیتے ہیں جیسے پہلی سطر میں "کہا" کی جگہ "کہیا" استعمال ہوا ہے۔ دوسری سطر میں پوچھا کی بجائے "پوچیا" ہے۔ مگر یہاں فعل حال مطلق کی یہ شکل دی گئی ہے جس کا

---

1 قرآن مجید کے اردو تراجم کا تنقیدی مطالعہ ص ۵۷،۱۵۵

2 حاشیہ بحوالہ دریائے لطافت انشاء اللہ خاں۔

مثالیں اور کہیں نہیں ملتی۔ چھٹی سطر میں بجائے "پوچھا گئے" "پوچھیا" استعمال ہوا ہے۔

اس تفسیر کی ایک اور خوبی بھی قابلِ ذکر ہے۔ آج کل فعل متعدی جیسا کہ ماضی مطلق کے ساتھ علامت "نے" کا لگانا لازمی ہے۔ لیکن نہ صرف دکنی وغیرہ کی اردو میں بلکہ شمالی ہند میں متقدمین کے دوسرے دور کے بڑے بڑے شعراء کے ہاں بھی اکثر مقامات پر یہ بات اکثر نظر آتی ہے کہ انھوں نے اس علامت کو حذف کر دیا۔ چنانچہ شہنشاہِ متغزلین میر تقی میر، مثنوی سحر البیان کے مصنف میر حسن اور میر محمد باقر حزیں کے کلام میں بھی اس کے نمونے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

میر صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

نقاش دیکھ تو میں کیا نقش یار کھینچا
اس شوخ کم نما کا صورت انتظار کھینچا

اس شعر میں میر حسن نے "کہا میں نے" کی جگہ "کہا میں" سے کام چلایا ہے اور علامت فاعل "نے" ترک کر دی ہے۔

حزیں کہتے ہیں۔

جس دن سے میں سنا ہے کہ آخر ہوئی بہار
اس دن سے چھوٹنے کی مجھے کچھ ہوس نہیں

اس جگہ "میں نے سنا ہے" کی جگہ "میں سنا ہے" استعمال ہوا ہے۔
اس صورت حال کے پیش نظر کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس ترجمہ اور تفسیر میں علامت فاعل "نے" کا استعمال ایسے موقعوں پر بالالتزام کیا گیا ہے اور درست کیا گیا ہے۔ مثلاً ترجمہ میں ہے۔ "یوسف نے کہا" لے جاؤ میری پیرہن۔ اسی طرح تفسیر میں ملاحظہ ہو ــــ بھیجے سبا کی کے عہدیداروں نے کہا"

کر دے وائمہ نماز گزارتا ہے۔ آگے چل کر اسی اقتباس میں یہ جملہ بھی ملاحظہ ہو جسے انھوں نے کہا "اگر عزیز کی بیوی (عورت) اچھا کرتے بھیجتی۔

بہرحال یہ تو زبان کے وہ اصول ہیں جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ جس زمانہ میں عربی اور فارسی کا رواج عام تھا لیکن ان زبانوں میں بھی تفسیریں بہت کم لکھی جاری تھیں اس وقت اردو جس زبان میں جو عام بول چال کی زبان تھی۔ ہمارے بعض علماء نے قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی ضرورت محسوس کی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس وقت اردو نثر کا رواج بہت کم تھا اور تحریری طور پر تو علمی اور ادبی کاموں میں اس کے نمونے تقریباً مفقود ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ سرکار، دربار میں ہر جگہ فارسی زبان کا سکہ چل رہا تھا لیکن عوام تک دینی و اخلاقی مسائل پہنچانے کے لیے علماء اردو نثر استعمال کرنے پر مجبور تھے اس دور میں فارسی محاوروں اور تراکیب کو اردو میں استعمال کیا گیا۔

تفسیر پارہ ہود یا تفسیر پارہ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ

(تفسیر سورۂ ھود اور سورۂ الحجر)

دراصل یہ ترجمہ اور تفسیر ہے پارہ "وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ" کا مگر چونکہ مصنف نے تفسیر یا ترجمہ کے تعلق سے اس پر کوئی عنوان نہیں دیا اس لیے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے قیاس کی بنیاد پر اس کو تفسیر پارہ ہود قرار دے دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرما دیا ہے کہ:

"اس میں سورہ ہود سے لے کر سورہ الحجر کے کچھ حصہ کی تفسیر شامل ہے"

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہاشمی صاحب نے عنوان میں تو سورہ ہود کی بجائے پارہ ہود لکھ دیا ہے اور مندرجہ بالا فقرہ میں سورہ ہود ہی تحریر فرمایا ہے

اس تضاد کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے زیر نظر تفسیر کو اس سورۃ کی تفسیر قرار دیا ہے۔

جہاں تک سورہ ہود کا تعلق ہے وہ گیارہویں پارے یعنی یَعْتَذِرُوْنَ کے آخری رکوع سے شروع ہو کر بارہویں پارے یعنی وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ کے تقریباً تین چوتھائی تک چلی گئی ہے اور وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ جس کی یہ تفسیر ہے تیرہواں پارہ ہے۔ لہٰذا سورہ ہود کا اس میں کوئی جز بھی شامل نہیں ہے۔ پھر چونکہ سورۃ الحجر کی ایک سطر اس پارہ میں شامل ہے اس لیے مفسر نے یہیں ترجمہ اور تفسیر کو ختم کر دیا ہے۔ پوری سورہ کی تفسیر اس میں شامل نہ دیکھ کر ہاشمی صاحب نے نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔ غرض اس طرح کے تسامحات ہاشمی صاحب سے ہو گئے ہیں جن سے قدرتی طور پر قارئین کو غلط فہمی ہو سکتی ہے اس لیے یہاں ان باتوں کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

تیرہویں پارے میں سورۃ یوسف کا تقریباً آخری نصف حصہ، پوری سورہ رعد، پوری سورہ ابراہیم اور ایک آیت سورۃ الحجر کی شامل ہے اس لیے یہ کہنا صحیح ہو سکتا کہ زیر نظر تفسیر سورہ یوسف نصف آخر، سورہ ہود تمام، پوری سورہ ابراہیم اور سورہ الحجر ایک آیت کے لفظ کا (کسی وقت یا اکثر اوقات) کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔

زیر نظر تفسیر میں مترجم و مفسر نے جس طرح ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی ہے اس کا نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ اور تفسیر ہے وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ .... اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ تک ملاحظہ ہو۔

"وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اور پاک کرتا ہوں میں نفس کیتیں میرے یعنی میں کہتا ہوں کہ نفس میرا میل اور آرزوؤں سے پاک ہے۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ تحقیق نفس میرا البتہ فرماں بردار ہے۔

بِالسُّوْءِ سات (ساتھ) بدی کے۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ۔ مگر جس چیز کے تئیں کہ رحم کرے پروردگار میرا یعنی بخشے اور نفس کی قربان برواری سے امن میں رکھے۔ "اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" تحقیق پروردگار میرا بخشنہارا ہے گناہ کرنے والے کے تئیں یعنی جو گناہ کہ ظاہر میں نہ آوے اور اس کا خیال دل میں آیا۔ پروردگار اس گناہ کو بخشتا ہے۔ رحیم مہربان ہے کہ بندے کے تئیں گناہ سے باز رکھتا ہے۔ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ جس وقت کے ایلچی بادشاہ کا بادشاہ کے روبرو آیا یوسف علیہ السلام کے احوال تمام کہا۔ پس بادشاہ کے تئیں یوسف علیہ السلام کو دیکھنے کے آرزو اور زیادہ ہو گئے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فتح الحمید از مولانا فتح محمد جالندھری سے اس حصہ کا ترجمہ نقل کر دیا جائے تاکہ ایک طرف پرانے اور نئے ترجمہ کا فرق معلوم ہو سکے۔ دوسری جانب یہ پتہ چل سکے کہ زیر نظر تفسیر میں کتنا ترجمہ ہے اور کتنی عبارت تفسیر کی ہے۔

(ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری):۔ اور میں اپنے تئیں پاک صاف نہیں کہتا کیونکہ نفس (امارہ انسان کو) برائی ہی سکھاتا رہتا ہے مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے۔ بیشک میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لاؤ میں اسے اپنا مصاحب خاص بناؤں گا۔

اس مخطوطہ کی خاص صفت یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں سرخ روشنائی سے لکھی گئی ہیں اور معنی اور تفسیر کو سیاہی سے لکھا گیا ہے۔

عام طور پر لفظی ترجمہ کیا گیا ہے لیکن کہیں کہیں الفاظ کی تشریح و توضیح کر دی

بھی بعض مقامات پر واقعات کو خاصی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ کہیں
ایسا بھی ہوا ہے کہ ترجمہ موجودہ محاورے کے مطابق نہیں ہے جس کی وجہ سے صحیح
مفہوم سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی وضاحت وصراحت
نہ کی جائے۔ مثلاً وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے "اور میں پاک
کرتا ہوں نفس کے تئیں اپنے" اس کے آگے تفسیری جملہ نہ ہوتا تو مفہوم سمجھ کا
کچھ ہو جاتا۔ اس لیے کہ اس کا صحیح مطلب ہے "میں اپنے نفس کو یا اپنی ذات کو
بالکل پاک نہیں کہتا" جیسا کہ مولانا فتح محمد جالندھری کے ترجمہ سے ظاہر ہوتا
ہے۔ جو لوگ اردو زبان کا صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ بخوبی اس فرق کو محسوس کر سکتے
ہیں جو "میں پاک کرتا ہوں نفس کے تئیں اپنے" اور "میں پاک کہتا ہوں اپنا
نفس کے تئیں اپنے" بہر حال مترجم و مفسر نے یہ اچھا کیا کہ اس الجھن کو تفسیری
جملے کے ذریعہ دور کر دیا ہے۔

آگے چل کر اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ میں "امارہ" کا ترجمہ فرمان بردار کیا
ہے۔ حالانکہ اس کے معنی ہیں "برائی کا حکم دینے والا" ظاہر ہے کہ فرمان بردار
یا بدکار کے مفہوم میں اچھائی کا اشارہ ملتا ہے۔ ایسا فرمان بردار تو بعد کو
برائی پیدا کر سکتا ہے جیسا کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ سے واضح
ہوتا ہے کہ "نفس برائی ہی سکھاتا رہتا ہے"۔

اسی سلسلہ میں اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ اس ٹکڑے کا مطلب مولانا
مودودی نے قریب بتایا ہے "بیشک میرا رب غفور و رحیم ہے" اور مولانا فتح محمد
جالندھری لکھتے ہیں "بے شک میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے" ان دونوں
کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش میں اتنی وسعت ہے کہ وہ
اگر چاہے تو ہر طرح کے گناہ بخش دے خواہ وہ گناہ انسان کے دل میں آیا ہو اور
سرزد نہ ہوا ہو یا انسان اس گناہ کا مرتکب نہ ہوا ہو۔ اور اللہ کی مغفرت اتنی

اللہ رحیم و کریم کی شان یہی ہے کہ وہ چاہے تو بڑے سے بڑا گناہ کو بخش دے لیکن اس پہلو پر نظر نہ رکھتے ہوئے اس تفسیر کے لکھنے والے نے جو معلوم کس بنیاد پر ترجمہ کے ساتھ اس تفسیری جملہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ "بخشنے کا الزام گناہ کا کفارہ گنیں یعنی جو گناہ کہ ظاہر میں نہ آوے اور اس کا خیال دل میں آیا ہو وہ گناہ اس گناہ کو بخشتا ہے" عقیدہ سے قطع نظر اس آیت میں کوئی قرینہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو۔ بہرحال اس کو تفسیر بالرائے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اسی طرح درج ذیل آیت کے ترجمہ اور تفسیر میں دو مرحلے سے اختلاف کیا گیا ہے۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ
بَصِیْرًا ۚ وَاْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۹۳﴾ (۱۲ : ۹۳)

مولانا فتح محمد صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ میرا کرتہ لے جاؤ اور اسے والد صاحب کے منہ پر ڈال دو وہ بینا ہو جائیں گے اور اپنے تمام اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔"
مولانا مودودی نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ "جاؤ میرا یہ قمیض لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو ان کی بینائی پلٹ آئے گی۔ اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔"

ان دونوں کے مقابلے میں صاحب تفسیر نے اس کا ترجمہ اور تفسیر یوں کیا ہے "جاؤ تم میرا یہ پیراہن میرا جبہ لے جاؤ اور وہ پیراہن ابراہیم علیہ السلام کا تھا کہ جبرئیل کنوئیں میں یوسف کے قمیص پہنا گئے تھے اور وحی بھیجی تھی کہ اس پیراہن کو بھیجیں یعقوب کے پاس کنعان میں، بھیجو ابیس ولد الوحم اور اس پیراہن کے قمیض علی وجہ ابی اور منہ باپ کے میرے یات بصیرا آئیں گے بینا ہو کے آنکھوں کے لیے آنکھیاں اور ان کے روشن ہو دیں گے۔ اور آؤ تم میرے پاس

بات لوگوں تمہارے تمام ہو۔

غرض تفسیر کی زبان تو پرانی ہے ہی، ترجمہ اور تفسیر بھی مجہول دکھائی دیتے ہیں۔

تفسیر حسینی

فارسی زبان میں قرآن کریم کی ایک مشہور تفسیر ہے جس کے مصنف ملا حسین واعظ کاشفی ہیں۔ ان کے نام کی مناسبت سے اس کا نام تفسیر حسینی ہوگیا ہے۔ اتفاق سے اردو میں بھی اسی نام کی تفسیر کا ایک مخطوط دریافت ہوا ہے جو غالباً کسی فارسی تفسیر کا ترجمہ ہے لیکن اس تفسیر کے مصنف کا نام دریافت نہیں ہو سکا۔ اس وقت یہی تفسیر پیش نظر ہے۔

بابائے اردو مولوی عبد الحق نے "قدیم اردو" میں قرآن مجید کے ترجموں کے سلسلہ میں اردو تفسیر حسینی کے مخطوط کا ذکر کرتے ہوئے ملا حسین واعظ کی تفسیر حسینی سے اس کا مقابلہ کیے بغیر جو بناتے تھیاس اس کو اسی فارسی تفسیر حسینی کا ترجمہ قرار دے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"تفسیر حسینی کا ترجمہ بھی کسی صاحب نے پرانی دکنی میں کیا ہے۔ یہ تفسیر نہایت مقبول ہے اور اس کے متعدد ترجمے دکنی زبان میں ہوئے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت پارہ عم کی تفسیر کا ترجمہ موجود ہے۔ اس کی زبان پرانی ہے۔ آخر میں کاتب نے دن، وقت، تاریخ (روز جمعہ، وقت عصر، ماہ جمادی الآخر) تو لکھی ہے، سنہ نہیں لکھا۔ چند آیتوں کا ترجمہ بیان لکھا جاتا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ تفسیری جملے بھی ہیں۔"

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے بابائے اردو نے اس مخطوط کا نام تفسیر حسینی

دیکھ کر صرف قیاس کی بنیاد پر اس کو فارسی کی مشہور و معروف تفسیر حسینی
ترجمہ بتا دیا ہے۔ لیکن دونوں کا موازنہ و مقابلہ کرنے سے پتہ چلتا ہے
ان میں کافی فرق ہے اس لیے بابائے اردو کے قیاس کو درست نہیں کہا جا
جہاں تک نام کے اشتراک کا تعلق ہے اس سلسلہ میں دو توجیہات کی جا سکتی
ایک یہ کہ جس طرح "لفظ حسین" فارسی تفسیر کے مصنف کے نام کا ایک جزء ہے
نسبت سے انہوں نے اپنی تفسیر کا نام تفسیر حسینی رکھا ہے۔ اس طرح ممکن ہے
مخطوطے کے مصنف کے نام کا جزء یا پورا نام ———— حسین یا حسینی ہو
انہوں نے بھی اپنی تفسیر کو اپنے نام یا نام کے اس جزء سے نسبت دے کر اس تفسیر
کے نام سے موسوم کیا ہو۔ دوسری توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ اسی نام کی کسی دو
فارسی تفسیر کا ترجمہ ہو۔

بہر حال بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے یہ تو بتا دیا ہے کہ
تفسیر حسینی کے کاتب نے اس کے لکھے جانے کا دن اور تاریخ تو دے دی
اس کی کتابت کس سنہ میں ہوئی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح مصنف
نام بھی نہیں بتایا گیا۔ لہٰذا بابائے اردو بھی ان امور پر روشنی ڈالنے سے قاصر
ساتھ ہی وہ یہ بھی نہیں بتا سکے کہ یہ تفسیر پورے قرآن کی ہے یا اس کے کسی حصہ
تاہم ان کے اس جملے سے کہ "میرے سامنے اس وقت پارہ عم کی تفسیر کا ترجمہ
ہے" مترشح ہوتا ہے کہ پارہ عم کے علاوہ بھی قرآن کریم کے اور اجزاء کا تر
زیر نظر تفسیر حسینی میں ہوگا۔ نمونے کے طور پر جو حصہ بابائے اردو نے پیش کیا
وہ سورۃ النبا کی ۱۲ آیتوں کا یعنی عَمَّ یَتَسَاءَلُونَ سے وَبَنَیْنَا فَوْقَکُمْ
سَبْعًا شِدَادًا تک کا ہے۔ ملاحظہ ہو:

(عَمَّ یَتَسَاءَلُونَ) کس چیز نے پوچھتے ہیں اور (وہ) کافراں
یعنی بعث نے پوچھتے ہیں آپس میں:

"اے یا رسول کون ہوا سو ستاں کون (عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ) بزرگ
خبر تے (الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ) ایسی خبر کہ لوگاں اس میں
اختلاف کر رہے ہیں (كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ) یوں نہیں یوں سمجھنا
ہے کہ انکار کرے تو عنقریب سمجھیں گے اور لوگوں پر ڈالے کا وعدہ ہے
(ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ) پھر ایسا نہیں یوں سمجھنا ہے ترت میں کر
سمجھیں اور تو دو بار لیا یا ایسے تاکید کے واسطے۔ ہور "فعلہ" سوں
لیا تا کھیا کر دیتا ہے یوں کہ دوسرا دعوہ بہت سخت ہے اور لیجئے
بولے پیالا (بچھونا) سو بچھونا (جان) کا پڑتے وقت دوسرا سو لگوا دا
(گہوارہ) جو بچھوا دار (بچھوں) کا ہے یو ذکر کا مراد ہے کہ خود یاں
باتاں کوں دیکھتے ہیں او خدا کے عجائب صنعت تے لوا دو لوگوں
سمجھانے کے واسطے اس کی کمال قدرت پر دلیل ظاہر ہیں۔ اس سے بعث
کے درست ہونے پر (وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا) بولتا اللہ تعالیٰ آیا
نہیں کیے ہیں ہم (پہاڑوں) کو میخاں زمین کیاں۔ یوں نہ
ہونے تو ہلتی (وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا) ہور کیا نہیں پیدا کیے
ہیں تمناں جوڑی جوڑی مرد عورت (وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا)
ہور کیا نہیں پیدا کیے ہیں تمہارے سونے کوں تو ڑنا دیکھنے تے
ہور چلنے سے تمنا راحت۔ ہور آسودہ ہونے کے واسطے (وَجَعَلْنَا
الَّيْلَ لِبَاسًا) ہور کیا نہیں پیدا کیے ہیں رات کو جتینا (پہننا)
اوڑھان (اوڑھنا) یعنی ہے اپنے اندھارے سوں چھپ کر پڑا اوڑھا لگا
ہے اپنے انگ کوں (وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا) اور کیا نہیں کیے
ہیں دنیں (دن) کو زندگانی (معاش) بدل (واسطے) تا طلب
کریں تمہیں زندگانی سے تم جو نگ کھانا پینا کپڑا۔ (وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ

سَبْعًا شِدَادًا (اور کیا نہیں بنا گئے ہیں تمارے اوپر
سات آسماناں گٹ (محکم) اور نہیں اوپر انیاں جو تیاں اُن کی جھت
زمانے جاتے سوں۔

جیسا کہ سطور بالا میں بتایا جا چکا ہے کہ بابائے اردو نے اصلی تفسیر حسینی
(فارسی) کو دیکھے بغیر زیر نظر دکنی تفسیر حسینی کو اس کا ترجمہ قرار دے دیا ہے۔
حالانکہ اول الذکر موخر الذکر سے بہت سی باتوں میں مختلف ہے۔ دونوں میں
آیتوں کی ترتیب و تقسیم مختلف ہے۔ الفاظ معانی اور تراکیب کے اعتبار سے
دونوں میں فرق ہے۔ فارسی تفسیر میں بعض حصوں کی تفسیر تفصیل سے کی گئی
ہے جو دکنی تفسیر میں دکھائی نہیں دیتی۔ چنانچہ فارسی تفسیر میں زیر نظر سورۃ النبا
کی تفسیر اس طرح شروع کی گئی ہے۔

"چوں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت آشکارا کرد
و قرآن بر خلق خواندن بعد از قیامت بیم فرمود کفار در نبوت
آنحضرت و نزول قرآن و وقوع بعث اختلاف کردند و از ان
یک دیگر را می پرسیدند یا از پیغمبر و مومنان پرسش می نمودند
چنانچہ حق تعالیٰ فرمود عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ۔"

دکنی تفسیر میں اس عبارت کا ترجمہ نہیں ہے۔ اسی طرح اور بہت سے مقامات
پر بھی دونوں میں بین فرق دکھائی دیتا ہے۔ یہ باتیں اس امر پر پوری طرح
دلالت کرتی ہیں کہ دکنی تفسیر حسینی، فارسی تفسیر حسینی کا ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ
تفسیر کسی دکنی عالم نے خود لکھی ہے اور ترجمہ اور تفسیر میں خاصا اچھا انداز اختیار
کیا ہے۔

زیر نظر تفسیر میں آیات قرآنی کا ترجمہ پرانی دکنی میں کیا گیا ہے اور ترجمے
کے ساتھ ساتھ تفسیری جملے دیے گئے ہیں۔ مترجم نے ترجمہ میں بہت احتیاط برتی

ہے اور اکثر مقامات پر نہایت موزوں الفاظ استعمال کیے ہیں مثلاً عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

کس چیز تے پوچھتے ہیں او کافراں یعنی کلی کافراں یعنی بعث تے پوچھتے ہیں آپس میں اے پیارے رسولؐ کوں ہور مسلماناں کوں۔

اس جملہ میں دو حروف ربط استعمال ہوئے ہیں "تے" اور "کوں" اردو محاورے کے مطابق دونوں کے معنی "سے" ہوں گے۔ لیکن جہاں "تے" استعمال ہوا ہے وہاں اگر "کوں" استعمال کر دیا جاتا تو صحیح مفہوم ادا نہ ہوتا۔ اس لیے کہ "تے"، "سے" کے یا "بارے میں" کے معنی بھی نکل آتے جو یہاں مقصود ہیں۔ "کوں" کے استعمال سے یہ مقصد پورا نہ ہوتا۔

اس تفسیر کی زبان اور اس کے اندازِ بیان سے ڈاکٹر سید حمید شطاری نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ زیرِ نظر تفسیرِ حسینی اواخر گیارھویں یا اوائل بارھویں صدی ہجری میں لکھی گئی ہوگی۔[1]

تفسیر سورہ بنی اسرائیل و کہف

اس نام کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔ اس کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دراصل پارہ سبحن الذی کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ چونکہ اس پارے میں پوری سورہ بنی اسرائیل اور سورہ کہف کا کچھ حصہ شامل ہے اس لیے مترجم و مفسر نے غلطی سے مخطوطہ پر اس کا نام "تفسیر سورہ بنی اسرائیل و کہف" لکھ دیا اور وہی نام اب بھی قائم ہے۔ اس سے مخطوطہ ہذا کے مطالعہ کرنے والوں کو

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک ۔ ص ۷۵

غلط فہمی ہو سکتی ہے اور وہ سورۂ کہف کے آخری تہائی حصے کو اس میں اس کو ناقص الآخر قرار دے سکتے ہیں۔

مخطوطے میں نہ مفسر کا نام دیا گیا ہے۔ اور نہ سنہ تفسیر درج ہے۔ کسی کی قسم کی بھی عبارت دکھائی نہیں دیتی جس کی وجہ سے ان باتوں کا پتہ لگ سکتا ہے۔ مفسر کے نام کا معلوم ہونا تو کسی ذریعے سے بھی ممکن نہیں۔ البتہ زبان و بیان کی مدد سے کسی قدر یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تفسیر ۱۲۰۰ھ کے لگ بھگ لکھی گئی ہوگی۔

تفسیر سورۂ ھُود کی طرح آیات قرآنی سرخ روشنائی سے لکھی گئی ہیں اور ترجمہ و تفسیر میں کالی روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ اس ترجمہ اور تفسیر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مترجم و مفسر نے نہ ترجمہ براہِ راست قرآن کریم سے کیا ہے اور نہ تفسیر خود لکھی ہے۔ بلکہ فارسی ترجمہ و تفسیر حسینی سے دونوں چیزوں کا ترجمہ اس دور کی مروجہ زبان میں کر دیا ہے۔ نثر کا ترجمہ نثر میں کیا گیا ہے اور اشعار کا نظم میں۔ البتہ کہیں کہیں تفسیر میں کچھ الفاظ یا عبارت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مترجم و مفسر کے اس طرزِ عمل سے یہ بات ظاہر ہے کہ ملا حسین الواعظ الکاشفی کی تفسیر حسینی اس زمانہ میں بے حد مقبول تھی اور اس کو معیاری سمجھا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اقدام نہایت مستحسن تھا۔ مفسر نے ان لوگوں کے استفادے کے لیے جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے ناواقف تھے ان کی اپنی زبان میں ایک معیاری چیز پیش کر دی۔ اگر وہ براہِ راست عربی سے ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے اور تفسیر بیان کرتے تو ممکن تھا کہ وہ اس قدر صحیح مطلب ادا نہ کر سکتے۔ ذیل میں قرآن کا متن، ملا حسین کاشفی کا ترجمہ فارسی اور زیر نظر اردو ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ اس سے اس کی افادیت بھی ظاہر ہو جائے گی اور ترجمہ کی صحت اور تفسیر کی خوبی بھی واضح ہو جائے گی۔

قرانی متن	فارسی ترجمہ و تفسیر (تفسیر حسینی)	اردو ترجمہ و تفسیر
سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (۱:۱۵)	پاکی و بے عیبی آنراست کہ بجہت کرامت برد بندہ خود را کہ محمد است صلی اللہ علیہ وسلم شبی یعنی در بعض از شب مسجد حرام کہ محیط بحرم کعبہ است یا از خانہ ام ہانی چہ مکہ و حرم او ہمہ مسجد اند بسوئے مسجد دور تر از مسجد اہل مکہ یعنی بیت المقدس آن مسجدی کہ برکت کردیم گرد اگرد او کہ ارض شام است ہم برکت دین کہ او را محیط وحی و معبد انبیاء ساختیم و ہم برکت دنیا کہ گرد او را تنیدیم از انہار و اشجار و انہار و بسیاری میوہ و فراخی معیشت و ارزانی نیس بدانجا محمد صلی اللہ علیہ وسلم	پاکی و بے عیبی ہے اوس کے تئیں کہ واسطے کرامت کیلئے لیا بندہ کے تئیں اپنے محمد کے صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات یعنی بیچ بعضے شب کے مسجد حرام سے کہ محیط سات حرم کعبہ کے ہے یا گھر سے ام ہانی کے جو دختر ابی طالب کے تھے زوجہ محترمہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کس واسطے کہ مکہ اور حریم مکہ تمام مسجد ہے طرف مسجد اقصیٰ کے جو بیت المقدس ہے اور اقصیٰ اس کے تئیں اس سبب کہتے ہیں کہ دور تھا اہل مکہ سے اور بیچ اوس زمانے کے سوائے اوس کی مسجد دوسری نہ تھی وہ مسجد کہ برکت کیا ہم نے اطراف و گرد جو زمین شام ہے ہم برکت دی گے اوس کے تئیں

عقل چہ داند کہ چہ مقام است ایں — عقل کیا جانے کہ کیا ہے یہ مقام
عشق شناسد کہ چہ نام است ایں — عشق سمجھتا ہے کہ کیا ہے اس کا نام

فارسی اور اردو ترجمہ اور تفسیر کا مقابلہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے
کہ زیر نظر ترجمہ اور تفسیر کے مصنف نے تفسیر حسینی سے پوری طرح استفادہ کیا
ہے۔ چنانچہ ترجمہ میں تو لفظی یکسانیت ہے۔ تفسیر میں کہیں کہیں ملا حسین الواعظ
کاشفی سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ مثلاً ملا حسین واعظ نے تو اتنا ہی لکھ کر
چھوڑ دیا ہے۔ "از خانہ ام ہانی چہ مکہ و حرم او را حکم مسجد اند" لیکن اردو
ترجمہ اور تفسیر میں اس میں کافی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں "گھر سے ام ہانی
کے جو دختر ابی طالب کے تھے زوجہ محترمہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے"
سمجھ میں آتا جب قرآن کریم میں صاف طور پہ بیان کیا گیا ہے "من المسجد الحرام"
تو ملا حسین واعظ نے کس بنیاد "یا از خانہ ام ہانی" کا اضافہ کر دیا ہے۔ پھر
جب خود ہی یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ "چہ مکہ و حرم او حکم مسجد اند" تو پھر "خانہ
ام ہانی" کی تخصیص چہ معنی دارد۔ بہرحال انہوں نے کلام اللہ میں یہی تحریف
معنوی کی تھی کہ "خانہ ام ہانی" کو "مسجد الحرام" کا درجہ دے دیا تھا لیکن
اردو میں ترجمہ کرنے والے صاحب نے اس پہ مزید اضافہ کرتے ہوئے "ام ہانی"
کا تعارف ان الفاظ میں کرا دیا۔ "ام ہانی جو دختر ابی طالب کی تھی زوجہ محترمہ
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی" چونکہ ملا حسین الواعظ صاحب ام ہانی
کا پورا تعارف کرانے سے چوک گئے تھے اس لیے مترجم اردو نے اس کمی کو یہ کہہ کر
پورا کر دیا کہ "کسی اور ام ہانی کو نہ سمجھ لیا جائے بلکہ یہ وہ ام ہانی ہیں جو بیٹی تھیں
ابو طالب کی اور زوجہ تھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔" ان دونوں بزرگوں
کے بیان میں صرف ایک بات صحیح ہے کہ حضرت ام ہانی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ
کے والد ابو طالب کی بیٹی تھیں۔ باقی دو باتیں بالکل غلط ہیں۔ روز معراج حضرت

ام ہانیؓ کے گھر سے ہوئی اور یہ حضرت ام ہانیؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کی عزیزہ تھیں۔ معراج کا واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔ اس وقت تک نہ ام ہانی
اسلام میں داخل ہوئی تھیں نہ ان کا شوہر "ہبیرہ" مسلمان تھا۔ وہ
نبوت کے بعد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن رہا اور کفر کی حالت میں مرا۔
ایسی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے گھر میں قیام کرنا اور وہاں سے معراج
کے لیے جانا کیسے ممکن تھا۔ بہرحال اس صراحت سے جو ان دو لائق بزرگوں نے کی ہے
ان کے عقیدہ اور رجحان طبیعت کا اظہار ہو جاتا ہے۔

تفسیر میں ایک بات ان دونوں نے دوسرے مفسرین سے زیادہ صحیح لکھی
ہے۔ وہ یہ کہ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر تو نص قرآنی سے ثابت ہے لیکن معراج
کی مزید منازل کے بارے میں قرآن کریم میں کوئی اشارہ نہیں۔ صرف احادیث سے
اس کے متعلق پتہ چلتا ہے۔ دوسرے مفسرین، میلاد خواں اور واعظ اس کے لیے
بھی قرآن سے سند پیش کرتے ہیں اور سورہ النجم کی ابتدائی آیتوں کا حوالہ
دیتے ہوئے یہ تک فرما دیتے ہیں کہ رسول اللہ، اللہ تعالیٰ کے اتنے قریب پہنچ
گئے تھے کہ دونوں کے درمیان "صرف دو کمان" کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہ روایت
جتنی مشہور ہے اتنی ہی غلط ہے۔

لفظ "الی" کا ترجمہ ملا حسین الواعظ نے "لیو" کیا ہے اور اردو ترجمہ
میں "کی طرف" کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ باقی مترجمین نے لغوی ترجمہ "تک"
لیکن ڈاکٹر سید حمید شطاری نے ان دونوں بزرگوں کی اس جدت کو سراہا ہے
اور ان کے ترجمے کو صحیح بتایا ہے۔[1] لیکن اس کو صحیح کہنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی
اس لیے کہ قرآن میں مسجد اقصیٰ سے آگے سفر کا کوئی حوالہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس سلسلہ

---

۱ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۲۴ ورنگل ص ۹۷

یہ تمام تفصیلات احادیث سے حاصل کی گئی ہیں جن سب کا مستند ہونا یقینی نہیں۔ مگر معراج کے سفر کی تفصیلات جو بیان کی جاتی ہیں نا قابلِ تردید ہیں۔ صحابہ کے درمیان یہ اختلاف رہا کہ بعض اس کو جسمانی کہتے ہیں اور بعض روحانی۔

ترجمہ میں بعض الفاظ نرالے استعمال کیے گئے ہیں اور متعدد الفاظ عربی فارسی کے وہی استعمال کر دیے گئے ہیں جو تفسیر حسینی میں ہیں۔ جیسے اشجار، انہار، فراق، معبودہا، ارزاق، آسمانہا، احادیث صحیحہ وغیرہ۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو اس زمانہ میں شمالی ہندوستان میں استعمال ہوتے تھے۔ اور دکن میں وہ رائج نہیں تھے۔ ان شواہد کی بنا پر ڈاکٹر شرف الدین صاحب نے قیاس کیا ہے مترجم کا تعلق شمالی ہند سے ہے۔[1]

تفسیر مرادی از شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی

اس تفسیر کا اصلی نام "خدائی نعمت" ہے جو اس کا تاریخی نام بھی ہے۔ "جمل" کے قاعدہ سے اس نام کے اعداد ۱۱۸۵ برآمد ہوتے ہیں اور خاتمہ کتاب کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مصنف شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی نے ۱۱۸۵ھ میں اس تفسیر کو اختتام کو پہنچایا تھا لہٰذا "خدائی نعمت" ہی اس کتاب کا صحیح نام ہے لیکن کاتبوں کی لاپروائی کی وجہ سے اکثر مطبوعہ نسخوں میں "خدا کی نعمت" درج ہے جو نہ موزوں معلوم ہوتا ہے اور نہ درست۔

• "خدائی نعمت" پارہ عمّ کی اردو زبان میں تفسیر ہے۔ اپنی مقبولیت کی وجہ سے یہ کئی بار طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جتنی مرتبہ

---

1. قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۹۸

یہ طباعت کے مرحلے سے گزر رہی تھی جو مرتب اس کی عبارت میں رد و بدل اور زبان میں اصلاح ہوئی۔ چنانچہ ۱۲۵۱ھ میں طبع ہونے والے نسخے کے خاتمۃ الطبع میں درج ہے کہ طباعت سے پہلے صحت کے لیے دس پارہ کے نسخے فراہم کیے گئے تو پتہ چلا کہ ہر ایک میں تحریف ہوئی ہے۔ البتہ ایک نسخہ جس کی عبارت باقی نسخوں سے واضح ہے تحریفات سے بہت حد تک پاک ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید حمید شطاری کا خیال ہے اور اپنے اس خیال میں وہ حق بجانب معلوم ہوتے ہیں کہ دوگنے حجم کے تعلق سے مرتب کی کسی وضاحت کی عدم موجودگی میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ بقیہ نسخے ہی اصل تفسیر کی نقل ہیں اور سب سے زیادہ تحریف کا شکار وہی نسخہ ہوا ہے جس کا حجم دوچند ہے۔[1]

یوں تو پوری تفسیر کے بارے میں یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ اتنی تحریفات کے بعد کونسی عبارت مفسر کی اپنی ہے جس کی بنیاد پر اس کے طرز تحریر کا کچھ اندازہ لگایا جا سکے۔ تاہم بعض قیاسات و قرائن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خاتمہ کتاب میں جو عبارت دی گئی ہے وہ قریب قریب اصلی حالت میں ہے اور اگر اس میں تحریف کا عمل ہوا ہے تو بہت کم۔ ملاحظہ ہو۔

"حمد اور شکر کا سجدہ لائق ہے واسطے اللہ کے، پاک ہے معبود کارگیتی۔ جس خداوند نے اپنے فضل و کرم سے اور حضرت نبی صاحب صلی اللہ علیہ کے طفیل سے "عم" پارے کی تفسیر ہندی زبان میں تمام کروایا اور اس عاصی گنہگار مراد اللہ انصاری سنبھلی قادری، نقشبندی، حنفی کو یہ خدمت قرآن کی توفیق بخش کر اس کے دل میں اپنے پاک کلام کا بیان بخشا، زبان کو الحمد للہ گو ——

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک ص ۲۰۷

قوت بخشے، قلم کو کاغذوں کے اوپر جاری کر وادیا۔ یہ تحریر کا کام
پورا کر دیا۔ پھر اس تفسیر کا نام خدا کے نعمت مقرر کر وادیا۔ یہ
تفسیر چوبیسویں تاریخ محرم کے مہینے کے جمعے کے دن تمام ہو چکی۔
حضرت پیغمبر صلعم کے ہجرت کے گیارہ سو برس کے اوپر چوالیسے برس
گزر چکے تھے۔ کام اس شروع ہوا تھا اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضرت
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یہ بندۂ عاجز گنہگار
امیدوار ہے جو اس تفسیر کے لکھنے میں، اس کے پڑھنے میں اور
پڑھانے میں یہ بندہ اور دوسرے بھی ہووے پڑھے پڑھاوے ہمیشہ ہمیشہ
دنیا میں قبر میں، آخرت میں اس کے برکتوں سے محروم نہ ہووے
لکھنے کا، پڑھنے کا، پڑھانے کا، سمجھانے کا، سیکھنے کا، سکھانے کا،
عمل کرنے کا اور کو عمل بتلانے کا ثواب پایا کرے۔ نعمتیں خوبیاں
لیتا رہے۔ پھر رحمت خدا کے اور عنایت اور فضل خدا کا حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ ہمیشہ پہنچتا رہے۔ الحمد للہ تعالیٰ
اوّلہٗ و آخرہٗ[1]

مطبوعہ نسخوں میں "ی" معروف اور "ے" مجہول کا عدم فرق اور
حمزہ کی جگہ "و" کا استعمال ختم کر دیا گیا ہے لیکن خاتمہ کتاب کی جو
عبارت اوپر دی گئی ہے اس میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں
جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ خاتمۃ الکتاب مفسر کا لکھا ہوا ہے اور ترجمہ و
تفسیر میں مرتبین نے اصلاح کر دی ہے۔

---

1 تفسیر مرادی مخطوطہ (۵۰۳۰) ادارہ ادبیات اردو بحوالہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک۔ ص ۱۰۴

جس طرح اصل تفسیر کے اندر مقامات پر ضرورت سے زیادہ تحریف کی گئی اسی طرح شاہ مراد اللہ صاحب کے کیے ہوئے ترجمہ میں اس حد تک رد و بدل کر دیا گیا ہے کہ اب یہ پتہ چلانا مشکل ہو گیا کہ ترجمہ کا کتنا حصہ شاہ صاحب کا ہے اور کتنا مرتبین نے دوسری جگہوں سے لے کر اس میں شامل کر دیا ہے۔ جہاں شاہ عبد القادر محدث دہلوی کے ترجمہ کی مقبولیت کو دیکھ کر شاہ مراد اللہ کے ترجمہ کی جگہ اس کو رکھ دیا گیا ہے۔ غرض ان تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا برکت کے لیے شاہ صاحب کا نام رہنے دیا گیا ہے۔ ورنہ اصل کام شاہ عبد القادر صاحب کا ہے۔ اگرچہ مرتبین نے یہ تبدیلی بہتر سمجھ کر کی ہے لیکن دیانت داری کے سراسر خلاف ہے۔ بہتر ہوتا اگر شاہ مراد اللہ کے ترجمہ کو جوں کا توں باقی رہنے دیا جاتا اور مقابلہ کے لیے شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمہ کو حاشیہ پر لکھ دیا جاتا۔ تاکہ دونوں بزرگوں کے اندازِ فکر و عقیدہ کا فرق بھی معلوم ہو جاتا اور اردو زبان کی تدریجی ترقی کا بھی پتہ چل جاتا۔ بہرحال اس وقت جو تحریر سامنے ہے اس کو جانچنے کے لیے قرآن کریم کے متن اور دونوں بزرگوں کا ترجمہ ساتھ ساتھ دیا جا رہا ہے۔

قرآن کا متن	شاہ عبد القادر محدث دہلوی کا ترجمہ	شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کا ترجمہ
عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا (۱ – ۸)	کیا بات پوچھتے ہیں لوگ آپس میں اس بڑی خبر سے جس میں وے کئی طرف ہو رہے ہیں۔ یوں نہیں اب جان لینگے پھر بھی یوں نہیں اب جان لیں گے۔ کیا ہم نے نہیں بنائی	کیا بات پوچھتے ہیں یہ لوگ آپس میں اس بڑی خبر سے جس میں وے کئی طرف ہو رہے ہیں۔ یوں نہیں اب جان لینگے پھر بھی یوں نہیں اب جان لیں گے کیا ہم نے نہیں بنایا

زمین بچھونا ! اور پہاڑ میخیں	زمین بچھونا اور پہاڑ میخیں
اور تم کو بنایا جوڑے جوڑے۔	اور پیدا کیا ہم نے تم کو جوڑے جوڑے۔

غرض اکثر جگہ ترجمے میں شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے مماثلت ہے باقی تمام ترجمہ شاہ عبدالقادر کی نقل ہے۔ البتہ کہیں کہیں فرق ہے۔ جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے وہ شاہ مراد اللہ کی اپنی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بجائے مفسر کے شاہ صاحب ایک واعظ معلوم ہوتے ہیں۔ جس طرح کوئی واعظ اپنی بات سامعین کے ذہن نشین کرانے کے لیے کثرت سے مترادفات کا استعمال کرتا ہے اسی طرح شاہ صاحب نے تفسیر میں کیا ہے۔ اس سے عبارت کی فصاحت اور روانی میں ضرور خلل واقع ہوا ہے تاہم عبارت میں زور اور اثر پیدا ہو گیا جو ایک عام قاری کے لیے مفید ہے۔ تفسیر میں زبان صاف اور سادہ استعمال کی گئی ہے۔ مترادفات کے استعمال سے مفہوم بتمامہ اور تفہیم میں سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ نمونہ کے لیے سورۂ ضحیٰ کی ایک آیت وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ کی تفسیر پیش ہے۔

"اور عنقریب شتاب عطا کرے گا۔ دیوے گا۔ بخشے گا تجھ کو یا "محمد" پاک پروردگار تیرا پھر راضی ہووے گا۔ تو دیوے نعمتیں خوبیاں بخشے گا تجھ کو یا "محمد" پیدا کرنے والا تیرا آخرت میں جو تو خوش ہو جاوے گا۔ سب طرح کی فکر جاتی رہے گی۔ تمام عالم کی شفاعت کا درجہ مقام محمود۔ تمام امت کی شفاعت کا حکم بہشت کی بڑی بڑی نعمتیں دے گا بے حد، بے نہایت ہمیشہ کا اور یہ ایسی بڑی خوبیاں تیرے واسطے رکھی ہیں۔ تو خاطر کو خوش رکھ۔ ان کافروں، مشرکوں کے طعنے مارنے میں غم گین نا خوش مت ہو۔ کوئی دن میں بے سبب

باتیں جاتی رہیں گی۔ تم کو خوشی ہمیشہ رہے گی۔

روایت ہے جب یہ آیت نازل ہوئی حضرت رسول (صلعم) خوش ہوئے اور فرمایا میں ایک آدمی کو بھی میری امت کے دوزخ میں رہنے والا نہیں ہونے کا۔ یہ بات امت کے واسطے بڑی خوشخبری ہے۔ تھوڑے سے بہت ہے۔ پہلے حالت سے آخر کا حال بہتر ہے۔ دنیا سے بہتر ہے۔[1]

اگر یہ تمام عبارت واقعی شاہ مراد اللہ انصاری کی ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اب سے دو سو سال پہلے شمالی ہند میں اردو نثر بھی کافی منجھ گئی تھی۔

تفسیر مرتضوی (منظوم)

یہ ایک منظوم تفسیر ہے اور پارہ عم تک محدود ہے۔ غالباً اردو نظم میں یہ سب سے پہلی تفسیر ہے جو مغل فرماں رواؤں شاہ عالم ثانی کے زمانے میں لکھی گئی۔ اس کے مصنف غلام مرتضیٰ جنون، میر و سودا کے ہم عصر تھے لیکن ان کا ذکر شعرا کے تذکروں میں نہیں ملتا۔ صرف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے گلشن بے خار میں لالہ سری رام نے خم خانۂ جاوید میں سرسری طور پر ان کا ذکر کیا ہے۔ شیفتہ کے الفاظ یہ ہیں۔

> شاہ غلام مرتضیٰ الٰہ آباد کے برگزیدہ لوگوں میں سے تھے۔ زہد و تقویٰ میں مشہور و معروف تھے۔ عرفا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شعر و سخن سے بھی تھوڑی بہت رغبت تھی۔ ان کی فکر کا نمونہ یہ ہے:

---

1. قدیم اردو صفحہ ۱۳۱ بحوالہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۷۸

تری چشم مست سے ساقیا یہ سیاہ مست جنوں ہوا
گرے دور الست طاق پر جو دھری تھی وہ وہیں دھری رہی [1]

خم خانۂ جاوید میں مرقوم ہے۔

"شاہ غلام مرتضیٰ متخلص بہ جنوں متوطن عظیم آباد ہمچشم و ہم عصر مرزا رفیع السودا۔ مہذب بصورت پاکیزہ سیرت۔ نہایت خوش مذاق۔ اکثر فنون میں تاباں اور کامل۔ بڑھاپے میں نابینا ہو گئے تھے مگر مشق سخن میں وہی انہماک تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ لکھتے ہیں کہ ان کا وطن الہ آباد تھا اور بہ لکھنؤ میں مشہور تھے۔ دیوان ریختہ بھی مرتب کیا تھا۔" [2]

ڈاکٹر سید حمید شطاری مخطوطہ تفسیر (؟) کتب خانہ سالار جنگ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"تفسیر مرتضوی کے دیباچہ اور خاتمہ کتاب کے اشعار سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ غلام مرتضیٰ شاہ عالم بادشاہ کے عہد کا ایک اچھا شاعر گزرا ہے۔ ان کے والد کا نام شاہ محمد حمید تھا جو الہ آباد کے متوطن تھے۔" [3]

خود کلام کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غلام مرتضیٰ جنوں ایک اوسط درجہ کے شاعر تھے۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ دار الحکومت سے دور ہونے کے سبب دنیا

---

1. گلشن بے خار اردو ترجمہ جناب محمد احسان الحق فاروقی ایم اے۔ آل پاکستان اردو کانفرنس، کراچی۔ سنہ اشاعت ۱۹۷۳ء ص ۱۵۹
2. خم خانۂ جاوید جلد دوم ص ۲۷۰ بحوالہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ص ۱۱۹ 3. ایضاً ص ۱۲۰

ہو سکے اور ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں تک نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

بہرحال ان کی شاعرانہ عظمت سے قطع نظر یہ بات نہایت اہم ہے کہ دینی رجحان ہونے کی بنا پر انہوں نے قرآن کریم کے اس پارہ کی تفسیر لکھنے کی طرف توجہ کی جس کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے۔ خواص ہی کو نہیں عوام کو بھی دن میں پانچ مرتبہ نمازوں میں اس کی سورتیں پڑھنی ہوتی ہیں اور ان سورتوں میں زیادہ سے زیادہ حفظاً اکثر بیان ہوتے ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو اس زمانہ میں پارہ "عم" کی منظوم تفسیر لکھنے میں ظاہر کی جب اس کا کوئی نمونہ بھی ان کے سامنے نہیں تھا اور اردو شاعری میں اس طرح کے مضامین کو بیان کرنا وقت طلب تھا لیکن عزم و ہمت کے سامنے کوئی دقت و دشواری باقی نہیں رہتی۔ بہرحال غلام مرتضیٰ جنون نے اپنے دینی رجحان سے متاثر ہو کر اور اس نیک کام کی ضرورت و اہمیت کا احساس کرتے ہوئے یہ تفسیر لکھی اور اس کی تکمیل کے بعد خواب میں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اظہارِ پسندیدگی فرمایا جس کا اثر یہ ہوا کہ جب یہ منظرِ عام پر آئی تو بے حد مقبول ہوئی۔ چنانچہ خاتمۂ کتاب میں مفسر نے یہ تفصیلات اس طرح بیان کی ہیں۔

"در بیان خاتمۂ کتاب"

ذکرِ حق میں ایک شب اے دوستاں — ہو گیا بے خود بہ اوجِ آسماں

دیکھتا ہوں کہ بہ ہر حجرۂ حج بمدیں — بیٹھے ہیں حضرت امیر المومنین

تختِ زریں پر بہ اعزازِ تمام — ہیں ملک ہر سو بصد اہتمام

اولیا ہیں دست بستہ با ادب — خاموشی سے صورتِ دیوار ادب

جا کے در پیشِ شہِ عالی مقام — با ادب ہو کے کیا میں نے سلام

عرض کی یہ سن کے کیا حضرت امام — حکم سے تفسیر کے لایا غلام

دونوں جلدیں رکھ کے دونوں ہاتھ پر — نے کیا میں نذر کو پیشِ نظر

پایا حضرت کی مدد سے اختتام — ورنہ ہو سکتا تھا کب مجھ سے یہ کام

دونوں لیں دستِ مبارک سے اٹھا — دیر تک دیکھا کیے مشیرِ خدا

تب یہ فرمایا بہ آوازِ بلند — تیری محنت کو کیا ہم نے پسند

خوش ہوئے ہم اس تری تفسیر سے — تیری اس تحریر اور اس تقریر سے

دوست جو اس کو رکھا ہم نے بجا لا — دوست رکھیں گے اسے سب مومناں

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اظہار پسندیدگی کے بعد مفسر سے دریافت کیا کہ وہ اس کا کیا صلہ چاہتا ہے۔ مفسر نے بہ اشارہ پاکر اپنا مدعا اس طرح بیان کیا:

مانگتا ہوں تم سے اے حق کے حبیب — دولتِ دارین ہو اس کو نصیب

اور رہے جس گھر میں دائم یہ کتاب — وہ رہے آباد تا روزِ حساب

اور جو اس کو پڑھے با اعتقاد — اس کو حاصل ہووے سب دل کی مراد

اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ نہ صرف مفسر کی زندگی میں بلکہ کافی عرصہ بعد تک تفسیر غامی مقبول رہی۔ چنانچہ جس سنہ میں یہ لکھی گئی اس کے [illegible] ٹھیک سو سال بعد مولوی عبدالماجد بن حکیم مولوی عبدالمجید نے مطبع طبی کلکتہ (؟) سے چھپوا کر شائع کی۔ لیکن استعدادِ زمانہ سے اس کی مقبولیت ختم ہو گئی اور اب یہ تفسیر تقریباً نایاب ہے۔ ڈاکٹر سید حمید شطاری صاحب کی تحقیق کے بموجب:[1]

"مطبوعہ نسخوں کے علاوہ اس کے صرف چار مخطوطات دریافت ہوئے ہیں۔ کتب خانہ سالار جنگ میں دو مخطوطے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو میں ایک اور مولوی عبدالحق کے پاس بھی ایک مخطوطہ تھا۔"

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر شطاری) ص ۱۱۹

کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطوں کے نمبر (۷) اور (۸) ہیں۔ لیکن ڈاکٹر
مشتاق علی صاحب نے ان دونوں نسخوں کے جو اشعار بطور نمونہ دیے ہیں
ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخطوطہ نمبر (۸) کے مقابلہ میں مخطوطہ نمبر (۷) کہیں زیادہ
صحیح ہے۔

مفسر نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لقب اور اپنے نام غلام مرتضیٰ
کی رعایت سے تفسیر کا عنوان "تفسیر مرتضوی" قرار دیا۔ چنانچہ "وجہ سبب تصنیف
الکتاب" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:[1]

دل لگا کہنے بوقت اختتام — اس کا رکھ تفسیر مرتضوی تو نام
کیوں کہ تو ہے گا غلام مرتضیٰ — حکم سے مولا کے ہے اس کو لکھا
سنہ ہجری ان دنوں تو جان لے — گیارہ سو اور ایک سو چھ اوپرے

آخری شعر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس تفسیر کا سنہ تصنیف ۱۱۸۲ ہجری ہے۔

حمد و نعت کے بعد تفسیر شروع ہوتی ہے۔ چونکہ یہ تفسیر عم کے سپارہ
کی ہے اس لیے مخطوطہ نمبر (۷) میں سورۃ فاتحہ کی تفسیر نہیں دی گئی اور سورۃ النبأ
کی تفسیر سے اس کا آغاز کیا گیا ہے۔ اور سورۃ الناس پر ختم کر دیا گیا ہے۔ ابتدائی
تفسیر ملاحظہ ہو:[2]

عم یتساءلون (یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ
کرتے ہیں)

اصل تھا عن ما عما ای پسر — نون کے تئیں کر میم پھر ادغام کر
کر الف کو حذف سن معنی بجا — پوچھتے آپس میں چیز سے یہ کافراں

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ص ۱۱۸ [2] ایضاً ص ۱۲۳

یا پئے انکار از پئے ناکہید ہے — کہ نہ الٰہ اندھوں کو چشم دید ہے
بحر کئے حق نے برائے منکراں — یہ دلائل اپنی قدرت کے بیاں
کتنے دیکھا ہیں کتنے فوق مر — کتنے ان کی ذوات میں ہیں جلوہ گر

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا)۔

آیا یہ ہم نے کیا ہے خاک سے — فرش گسترده تمہارے واسطے
ہے بچھائی ہم نے یا خود زمیں — مردہ اور زندوں کے رہنے کے لئے ہیں

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا (اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا)

اور کیا کوہوں کو میخیں استوار — تا نہ کانپے اور زمیں پکڑے قرار

وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا (اور تمہیں (مردوں اور عورتوں کے) جوڑے والی شکلوں میں پیدا کیا)۔

اور تمہیں پیدا کیا ہے ہم نے جفت — ای نر و مادہ کو بے گفت و شنفت
یعنی زن اور مرد کو پیدا کیا — ایک کا دل ایک پر شیدا کیا
تاکہ ان دونوں سے پیدا ہوں بشر — جیسے آب و خاک سے کشت و ثمر
یا مراد از ازواج ہے قسم قسم — مختلف در صورت و الوان و جسم

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا)

اور کیا ہم نے تمہارے خواب کو — موجب راحت تن بے تاب کو
ای کیا ہے ہم نے خواب مردماں — راحت چشم و جنان و جسم و جاں

وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا (اور رات کو پردہ پوش بنایا)

اور گردانا ہے ہم نے رات کو — پردہ کار بد و کار نکو
شیخ اکبر کے سخن پر کر تو میل — یعنی شب ہے پردۂ اصحاب لیل
شب ملاقات ہے انہوں کو یار سے — کر کے پنہا دیدۂ اغیار سے

تاکہ اس خلوت میں ان کو یا حبیب ۔۔۔ لذتِ دیدار ہوتے ہیں نصیب

ہوتے ہیں محبوب جانے ہم کلام ۔۔۔ پیتے ہیں جامِ حضوری کو مدام

در خورِ احوال و استعداد خویش ۔۔۔ ہوتے ہیں برخوردار ہر درویش و ریش

یہ سخن سن کے تو تیغِ اسلام کا ۔۔۔ ہے یہ نکتہ سا انکوں لگے کلام کا

یعنی شب ہے پردہ دارِ سالکاں ۔۔۔ پردہ پوشی کا ہے وہ یارِ عاشقاں

شب ہے پردہ گھر بجز عشاق کا ۔۔۔ شب ہے پردہ دار عاشق مشتاق کا

شب ہے پردہ دیدۂ بے خواب کا ۔۔۔ شب ہے پردہ عاشقِ بے تاب کا

شب دلِ عشاق کی ہے رازدار ۔۔۔ عاشق و معشوق کی ہے غمگسار

کہتے ہیں اہلِ وصالِ دوست سب ۔۔۔ کاش تا صبحِ قیامت رہتی شب

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (اور دن کو معاش کا وقت بنایا)

اور کیا ہیں روز کو وجہ معاش ۔۔۔ تاکہ تم اس میں کرو روزی کی تلاش

یہ سورۂ النبا کی ۱۱ آیتوں کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ ترجمہ آیتوں کے حاشیے اس لیے دے دیا ہے تاکہ تفسیر کو سمجھنے میں مدد ملے۔ واضح رہے کہ تفسیر تقریباً سوا دو سو سال پرانی ہے اور اسی لیے آج کل کی زبان کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس میں بے کیفی اور لا بے لطفی محسوس ہو گی۔ جس زمانہ میں یہ تفسیر لکھی گئی وہ میر اور سودا کا زمانہ تھا۔ اس وقت ان عظیم شعرا کی زبان میں بھی بعض ایسے الفاظ اور محاورات استعمال ہوئے ہیں جو آج کل اجنبی اور متروک سمجھے جاتے ہیں۔ اس وقت کے اسالیب اور طرز ادا میں بھی بڑی حد تک اجنبیت اور پرانا پن محسوس ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اکثر شعرا نے اپنے کلام میں مجرد جذبات واحساسات کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے اس لیے ان کے کلام میں اثر و تاثیر آج بھی محسوس کی جاتی ہے لیکن تفسیر کلام اللہ میں ان چیزوں کی توقع رکھنا عبث ہے۔ قرآن کریم کے جو منظوم ترجمے اس قریب میں ہوئے ہیں ان میں بھی

شاعرانہ لطافت بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں تفسیر مرتضوی پر جو
غالباً اردو زبان میں سب سے پہلی کوشش ہے کسی طرح کا کوئی اعتراض قطعاً
نامناسب ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یہ رائے اپنی جگہ درست ہے
کہ "ایسی چیزوں کا ترجمہ اور وہ بھی نظم میں، سراسر بے لطف ہو جاتا ہے"۔
بے شک خالق کے کلام کا ترجمہ اسی زور اور اثر کے ساتھ نثر میں ہونا بھی ناممکن
ہے چہ جائیکہ نظم میں۔ لیکن جس طرح عربی سے نابلد لوگوں کے لیے نثر میں ترجمہ
ضروری سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ترجمہ اور تفسیر کے لیے نظم کو بھی ذریعۂ اظہار
بنانا ایک مستحسن فعل ہے۔ اس لیے کہ منظوم کلام نثر کے مقابلے میں یقیناً موثر
ہوتا ہے۔ غلام مرتضیٰ صاحب قابل تعریف ہیں کہ انھوں نے شعراء کو ایک نئی
راہ دکھائی۔

تفسیر موضح قرآن

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی

علوم شرعیہ کی ترویج و اشاعت میں خانوادۂ ولی اللٰہی کے جہاں اور
بہت سے کارنامے ہیں ایک کارِ عظیم یہ بھی ہے کہ مکمل قرآن کریم کا اردو ترجمہ
اور اس پر تفسیری حاشیہ بھی سب سے پہلے اسی خاندان کی ایک مقدس ہستی
نے تحریر کیا۔ یہ ہستی حضرت شاہ عبدالقادرؒ محدث دہلوی کی تھی جو حضرت
شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کے تیسرے یا چوتھے فرزند تھے[1]۔ چونکہ ان کے

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی فاطمہ بنت شیخ عبید اللہ
سے ایک صاحبزادے اولاد ہوئے جن کا نام "محمد" تھا۔ شاہ صاحب کے (باقی اگلے صفحے پر)

بجا در بند رگ حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے جو تحت اللفظ ترجمہ اردو میں کیا تھا
اس کی تصنیف کا سن معلوم نہیں ہے۔ اس لیے بعض حضرات قیاس کی بنیاد
پر اس کو سب سے پہلا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ تاہم اگر ان کی اس بات کو صحیح مان
لیا جائے تب بھی شاہ عبدالقادرؒ صاحب اس ترجمہ اور تفسیر کو اولیت کا مقام
حاصل رہے گا۔ اس لیے کہ اول تو یہ ترجمہ بامحاورہ ہے اور شاہ رفیع الدینؒ
صاحب کا تحت اللفظ۔ دوم اول الذکر پر تفسیری حاشیہ بھی ہے جبکہ موخر الذکر
معریٰ ہے۔

”موضح قرآن“ کو غلطی سے ”موضح القرآن“ کے نام سے شہرت دے دی
گئی ہے۔ لیکن چونکہ اس ترجمہ اور تفسیر کا سن تصنیف ۱۲۰۵ھ ہے اور موضح
قرآن کے اعداد بھی جمل کے قاعدہ سے ۱۲۰۵ نکلتے ہیں اس لیے یہ اس کا تاریخی
نام ہوا۔ لہٰذا یہی زیادہ صحیح ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے برصغیر میں جس اہتمام سے
علوم شرعیہ کی اشاعت کی مسلمانان ہند کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔
انہوں نے اپنے زمانہ میں فارسی زبان کی ہمہ گیری اور مقبولیت کو دیکھ کر ضروری
سمجھا کہ قرآن کریم کا فارسی ترجمہ کریں۔ قرآن کریم کے لیے ترجمہ کا مسئلہ بڑا نازک
اور اختلافی تھا اور یہ فارسی ترجمہ بھی بڑی جرأت کا کام تھا۔ یہ ترجمہ خاصا مقبول
(دیکھیے الفوز الکبیر) سب سے بڑے بیٹے تھے۔ آپ نے دوسری شادی اہلیہ محترمہ سعیدہ ارادت
بنت سید ثناء اللہ صوفی پتی سے کی۔ ان سے آپ کے چار صاحبزادے ہوئے
جن کے نام ترتیب وار یہ ہیں (۱) شاہ عبدالعزیزؒ (۲) شاہ رفیع الدینؒ (۳) شاہ
عبدالقادرؒ (۴) شاہ عبدالغنیؒ۔ اگر شاہ محمد صاحب کو بھی ملا لیا جائے تو شاہ
عبدالقادرؒ کا نمبر چوتھا ہوتا ہے۔ اور اگر چار ہی مانے جائیں ان کے حساب سے دیکھا
جائے تو آپ کا نمبر تیسرا ہو جاتا ہے (بحوالہ ”شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان“ مولانا
حکیم محمود احمد برکاتی ص ۱۴۴ تا ۱۴۶)

سو لیکن نصف صدی گزرنے کے بعد اردو زبان نے فارسی کی جگہ لے لی۔
اور عوام کے لیے شاہ صاحب کے فارسی ترجمے سے استفادہ کرنا مشکل ہو گیا
یہ دیکھ کر ان کے فرزند حضرت شاہ عبد القادرؒ نے آسان اور بامحاورہ اردو
میں ترجمہ کیا تاکہ عوام کو قرآن فہمی میں مدد ملے۔ یہ گویا اصولِ ترجمہ و تفسیر ہیں۔
جو غالباً اس تفصیل سے پہلی مرتبہ بیان ہوا ہے۔ انھوں نے دیباچے میں ان
باتوں کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس کے کلام میں جو ہدایت ہے دوسرے میں نہیں۔ یہ کلام پاک
اس کا عربی زبان میں ہے اور ہندوستانی کو اس کا ادراک محال
ہے۔ اس واسطے بندہ عاجز عبد القادر کو خیال آیا کہ جس طرح
ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ بن عبد الرحیم محدث دہلوی
ترجمہ فارسی کر گئے ہیں سہل و آسان اب ہندی زبان میں قرآن شریف
کو ترجمہ کرے۔ الحمد للہ کہ سنہ ۱۲۰۵ھ (بارہ سو پانچ) میں
میسر ہوا۔ اب آگے کئی باتیں چاہئیں معلوم رکھنے۔ اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ
لفظ بلفظ ضرور نہیں کیونکہ ترکیب ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید
ہے۔ اگر بعینہ وہ ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ
اس میں زبان ریختہ[1] نہیں بولی تا عوام کو بے تکلف دریافت
ہو۔ تیسرے یہ کہ ہر چند ہندوستانیوں کو معنی قرآن اس سے
آسان ہوئے لیکن ابھی استاد سے سند کرنا لازم ہے۔ اول معنی
قرآن بغیر سند معتبر نہیں۔ دوسرے ربط کلام ماقبل و مابعد سے
پہچاننا اور قطع کلام سے سمجھنا بغیر استاد نہیں آتا۔ چنانچہ قرآن عربی
زبان ہے اور عرب بے محتاج استاد نہیں۔ چوتھے یہ کہ فقط ترجمہ قرآن

۱۔ ریختہ یعنی زبانِ شعراء اور جملہ معنی اردوئے قدیم کے تفریق کے احساس کا اہمیت۔

ہوا تھا۔ بعد والے لوگوں نے خواہش کی تو لکھنے فوائد بھی متعلق
تفسیر داخل کیے۔ اور ان فوائد کے ابتدا کو حرف (ف) نشان رکھا۔
اگر کوئی مختصر چاہے صرف ترجمہ لکھے اگر مفصل چاہے فوائد بھی داخل کرے
باقی قواعد خط ہندی لکھنے میں طول ہے۔ اوستادوں سے معلوم ہوں گے۔ البتہ
ہندی میں بعضے حرف ایسے ہیں کہ فارسی میں نہیں۔ اس سبب سے فارسی حرفوں
اول اختلاف ہے۔ وہ جب دیکھے تو ماہر ہو جاوے اور اس کتاب کا نام
موضح قرآن ہے۔ اور یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ بھی ہے۔"
اس عبارت سے کئی باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

(۱) جس زمانہ میں یہ ترجمہ اور تفسیری حاشیہ لکھا گیا اس وقت بھی آج کل کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کے لیے عربی زبان کا سمجھنا محال ہو گیا تھا۔

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ نے تقریباً نصف صدی پہلے فارسی زبان میں جو ترجمہ کیا تھا وہ بھی عوام کے لیے قابل فہم نہیں رہا تھا جس کی وجہ سے شاہ عبدالقادر صاحب کو ہندی (اردو) میں ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

(۳) اس زمانہ میں شعرائے اردو جو زبان استعمال کرتے تھے وہ عوام کی روزمرہ کی زبان سے مختلف تھی۔ اور ریختہ کہلاتی تھی۔ عام بول چال کی زبان کو ہندی یا ہندوی کہا جاتا تھا۔ چونکہ شاہ عبدالقادر نے ترجمہ اور تفسیری حاشیہ خصوصیت سے عوام کے لیے لکھا تھا اس لیے وہ عام بول چال کی زبان یا ہندی کو کام میں لانے اور ریختہ سے اجتناب برتا۔ چنانچہ واضح طور پر لکھتے ہیں: "دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف تا عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔"

(۴) ترجمہ اور تفسیری حاشیہ میں عام فہم زبان استعمال کرتے تھے باوجود شاہ صاحب قرآن کو سمجھنے کے لیے استاد کی مدد کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں

وہ فرماتے ہیں: لیکن اچھی استاد سے سند کرنا لازم ہے۔ اول معنی قرآن
بغیر سند معتبر نہیں۔ دوسرے ربط کلام ماقبل و مابعد سے پہچاننا اور
قطع کلام سے بچنا بغیر اسناد نہیں آتا۔"

(۵) شاہ عبدالقادرؒ صاحب نے اپنے بڑے بھائی شاہ رفیع الدینؒ صاحب کے ترجمہ
قرآن کا کوئی حوالہ نہیں دیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک شاہ
رفیع الدینؒ صاحب کا ترجمہ منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا۔ اگر یہ قیاس درست
ہے تو جو لوگ شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے ترجمہ کو اردو زبان میں ہونے والا
سب سے پہلا ترجمہ کہتے ہیں، وہ حق بجانب ہیں۔

(۶) شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے پیش نظر آسان اردو (ہندی) زبان میں صرف
ترجمہ پیش کرنا تھا۔ مگر بعض لوگوں کے مشورہ دینے سے مختصر تفسیری حواشی
بھی لکھے لیکن ان میں بھی عوام کی سہولت کا خیال رکھا اور ان کو نہ طویل ہونے
دیا اور نہ مبہم و معلق۔

(۷) شاہ صاحب نے خود ترجمہ اور تفسیری حواشی کا نام "موضح قرآن" بتایا
ہے اور رقم فرمایا ہے کہ یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ بھی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ "موضح القرآن" بعد کی اختراع ہے۔ شاہ صاحب
نے فارسی ترکیب استعمال کی تھی، معتقدین نے شاہ صاحب کی توضیح پر غور
کیے بغیر حسن عقیدت کی بنا پر کلام اللہ کے ترجمہ اور تفسیری حاشیہ کا نام
عربی ترکیب کے ساتھ "موضح القرآن" لکھنا شروع کیا اور بعد میں یہی نام
چل پڑا۔ اصلی نام کی طرف سے سب کی توجہ ہٹ گئی۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ قرآن کی
بعد کے تمام علماء نے تعریف کی ہے اور ہر زمانے میں اس کو معیاری قرار دیا ہے۔
اکثر مترجمین نے قرآن کریم کا ترجمہ کرتے وقت شاہ صاحب کے اس ترجمہ کو

سامنے رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ یہ امر واقعی حیرت خیز ہے کہ جس زمانہ میں یہ ترجمہ
کیا گیا اس وقت تک مکمل قرآن کریم کے ترجمہ کا تو سوال ہی کیا ہے اردو تحریریں
تو بہت کم تھے۔ پھر شاہ صاحب نے ترجمہ میں جو اہتمام کیا ہے اور صحت کا جتنا
خیال رکھا ہے اتنا موجودہ زمانہ میں بھی جب اردو زبان الفاظ و ترقی کے اتنے
منازل طے کر چکی ہے کسی متنفس کے لیے رکھنا مشکل ہے۔ آپ نے بہت سوچ
بچار کے بعد ترجمہ میں موزوں ترین الفاظ استعمال کیے تاکہ غیر موزوں الفاظ
کے استعمال سے قرآن کریم کے مفہوم و مدعا کو سمجھنے میں غلطی یا الجھن نہ پیدا
ہو۔ اس التزام کے ساتھ کہ عربی، فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ بھی استعمال نہ
ہوں اور زبان عوام کی فہم اور روزمرہ کے مطابق بھی رہے۔ موزوں الفاظ کا
ڈھونڈ نکالنا شاہ صاحب جیسے ہی محتاط اور عزم و ہمت والے انسان کا کام
تھا۔ یہ اسی احتیاط اور تلاش و جستجو کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اس ترجمے کو ۴۰ سال
کی طویل مدت کے اعتکاف میں پورا کیا اور تکمیل کا سنہ ۱۲۰۵ ہجری ہے۔[1]

شاہ عبدالقادر صاحب نے جو اختصار ترجمہ میں برتا اسی کو آپ تفسیر میں
بھی کام میں لائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ اور تفسیری حاشیہ لکھتے وقت اول
سے آخر تک آپ کے سامنے طبقہ عوام رہا۔ اس لیے نہ آپ نے صرفی و نحوی مسائل
پر زور دیا، نہ فلسفیانہ موشگافیوں سے کام لیا اور نہ اسرائیلیات میں الجھے
یا دوسروں کو الجھایا۔ بلکہ جہاں ضرورت سمجھی چند الفاظ میں بات کہہ دی اور
آگے بڑھ گئے۔ ظاہر ہے عوام کو لمبی چوڑی بحثوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔
وہ تو مختصر الفاظ میں بات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحب نے ان کی نفسیات
سامنے رکھا اور ضرورتوں کا احساس کرتے ہوئے "ما قلّ و دلّ" کے

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم اور تفاسیر (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ص ۱۴۳

زریں اصول کو برتا ہے۔ شروع سے آخر تک آپ کا یہی انداز ہے۔ نمونہ کے لیے چند مثالیں پیش ہیں:

قرآن کریم کی پہلی سورۃ "الفاتحہ" ہے۔ اس میں کُل سات آیتیں ہیں۔ اسی لیے اس کو سبع مثانی بھی کہا جاتا ہے۔ ان سات آیتوں میں وہ جامعیت ہے کہ بندہ کی وہ تمام ضروریات جو اس کی ضرورتیں سمٹ کر اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بندہ کی جانب سے دعائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو سکھائی ہیں۔ انسان کو بار بار دہرانے کی ہدایت کی ہے۔ تاکہ اس کے ذہن میں یہ بات تازہ ہوتی رہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو ہماری دین و دنیا کی جملہ سعادتوں کی ضامن ہیں۔ بندہ کی ان دعاؤں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پورا قرآن نازل کیا جس میں اس کی حیات دنیوی اور اخروی کے تمام مسائل بیان کر دیے اور بتا دیا کہ اگر تم اپنی دعاؤں میں مخلص ہو تو اس کتاب میں درج طریقوں کو اپنے عمل کی بنیاد بناؤ۔ یہی تمہیں ہدایت کے راستہ پر چلائے گی اور جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تمہیں اس سے حاصل ہو گا۔[1] شاہ صاحب نے پوری سورت کا ترجمہ کر کے اس کی تفسیر مختصر الفاظ میں بیان کر دی۔

"ف۔ یہ سورت اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں۔"[1]

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بعض باتیں سمجھانے کے لیے ایسی چیزوں کی مثالیں دیتا ہے جو انسان کے مقابل میں اور اس کے نزدیک بہت کم حیثیت اور حقیر ہیں۔ نزول قرآن کے وقت کفار یہ اعتراض کرتے تھے کہ اللہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کی مثال دیتا ہے۔ بلکہ اس سے بڑی اور وسیع

---

[1] عکسی قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر موضح القرآن۔ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل لاہور۔ حاشیہ ص ۲

اشیاء موجود نہیں ہیں کہ ان کی مثالیں دی جائیں۔ ان کم عقلوں کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ

(۲) ان چیزوں کی مثالیں ہی تو زیادہ مؤثر ہوں گی جو ہر وقت انسان کے سامنے رہتی ہیں اور جن کے مخصوص حالات کا انسان کو دن رات تجربہ ہوتا رہتا ہے، جیسے مکھی، مکڑی، چیونٹی، گدھا، اونٹ وغیرہ۔

(۳) مثال میں معنویت کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔ جیسے کسی چیز کی کمزوری کو ظاہر کرنا ہو تو اس کے لیے مکڑی کے جالے کی مثال سے بہتر کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں ان کو یہ سمجھا دیا کہ کوئی سہارا نہیں دے گا اس لیے کہ یہ سہارا مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ کلام پاک کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ٥ (۲۰ : ۴۱)

ترجمہ:۔ جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے، اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔

یہاں تشبیہ اور مثال کے لیے مکڑی کے جالے کو کام میں لایا گیا ہے۔ اس موقع کے لیے اس سے بہتر کوئی مثال ہو سکتی تھی۔ اس وقت تو کفار نے اس قسم کی مثالوں پر اعتراض کیا تھا لیکن بعد میں یہ مثال اتنی مقبول ہوئی کہ اب یہ محاورہ بن گیا۔ "ان دو آدمیوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ تارِ عنکبوت ثابت ہوا"

اسی طرح پڑھے لکھے جاہلوں کے لیے یہ کہا جاتا ہے۔ "گدھے پہ کتابیں لدی ہیں۔" قرآن کریم میں آج سے چودہ سو سال پہلے فرما دیا تھا:

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا

ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

نیز گدھے کی صوت یا آواز کو بدترین آواز بھی قرار دیا ہے۔

إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۔

(۴) سوچنے کی بات ہے کہ کفار اپنے مقابلہ میں چیونٹی، مکھی اور مکڑی کو حقیر سمجھ کر ان کی مثال دینے پر اعتراض کر رہے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک تو نہ صرف انسان بلکہ پوری کائنات میں مکھی اور مکڑی سے زیادہ حقیر ہیں البتہ مخلوق ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ لہذا انسان کو سمجھانے کے لیے وہ کسی چیز کی بھی مثال دے سکتا ہے۔ بہرحال کفار مکہ کی جانب سے جب یہ اعتراض ہوا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کا یہ مختصر سا جواب دیا گیا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ (۲۶:۱)

اللہ کچھ شرماتا نہیں کہ بیان کرے کوئی مثال ایک مچھر یا اس سے اوپر۔ پھر جو لوگ یقین رکھتے ہیں، سو جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے ان کے رب کا کہا۔

احمد رضا صاحب نے یہ تفسیری حاشیہ تحریر فرمایا ہے:

ف۔ قرآن شریف میں کہیں مثال فرمائی ہے مکڑی کی کہیں مکھی کی۔ احمد کا فر عیب پکڑتے تھے کہ اللہ کی شان نہیں کہ ان چیزوں کا ذکر کرے۔ بھلا

اس کا ہونا تو ایسے مذکور نہ ہوتے تھے۔ اس پر یہ دو آیتیں فرمائیں۔ باوجود اس کے
نے تو حقیر ترین جسم والے انسان (جوہر) کو جو اہمیت دی وہ پیش نظر ہے۔

قرآن کریم میں انسان کو اس کی محدود صلاحیتوں کا احساس دلانے کے لیے
مختلف پیرایۂ بیان اختیار کیے گئے ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے
جلیل القدر پیغمبر کو اس سلسلہ میں متنبہ کرنے کے لیے ایک ایسے شخص [illegible]
جس کے بعض کاموں کے کنہ و حقیقت کو وہ نہیں سمجھ سکے اور اس انہیں شخص کے
سمجھانے سے انہیں اصلیت و حقیقت کا پتہ چلا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پیغمبر
تک کا علم بھی محدود ہوتا ہے الّذی علیم خبیر ہے۔ وہ جتنا علم چاہتا ہے
بندوں کو دے دیتا ہے۔ لہٰذا انہیں اپنے علم کو غیر محدود نہیں سمجھنا چاہیے اور
اس پر نازاں نہ ہونا چاہیے۔ ان حقائق کو قرآن کریم نے چند سطروں میں سمجھایا
ہے۔ سورہ کہف۔ آیت ۶۵ میں ہے

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا
وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا ۝ (۱۵ :۱۸: ۶۵)

پھر پایا ایک بندہ ہمارے بندوں میں کا جس کو دی تھی ہم نے
اپنی مہر اپنے پاس سے اور سکھایا تھا اپنے پاس سے ایک علم
تھے۔ وہ بندہ خضر تھا۔ ملنے کا سبب پوچھا آنے کا موسیٰ نے سبب
بتایا۔ خضر نے کہا تم کو اللہ نے تربیت فرمائی۔ یہ بات ہوا ہے کہ
اللہ کا ایک علم مجھ کو ہے تم کو نہیں۔ ایک تم کو ہے مجھ کو نہیں۔
ایک چڑیا دیکھا وہی دریا میں سے پانی پیتی۔ کہا سارا علم سب خلق کا
اللہ کے علم میں سے اتنا ہے جتنا دریا میں سے چڑیا کے منہ میں
پانی۔

سورۃ النحل (سورۃ ۱۶) کی آیت ۱۲ کا ترجمہ دے کر اس پر جو لکھا

حاشیے تحریر کیا ہے وہ شاہ صاحب کے صحیح غور و فکر اور قوتِ فیصلہ کا بولتا ثبوت ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

(۱۶ : ۱۲)

ترجمہ: اور کام لگائے تمہارے رات اور دن اور سورج اور چاند سے۔ اور تارے کام میں لگے ہیں اس کے حکم سے اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو جو بوجھ رکھتے ہیں۔

اس آیت پر شاہ صاحب کا تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو۔ کتنا مختصر اور کیا جامع ہے۔ لکھتے ہیں:

چار چیزوں سے بندوں کو کام لگا رہے ہیں صریح لیکن ستاروں سے کچھ ظاہر میں ان کو کام نہیں۔ ان کو جدا فرمایا۔

چھوٹی پر ابلاغ کا تکلم پر تعجب نہ کیجیے جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ آج کل تو شہد کی مکھیوں کی زبان پر تحقیق ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔

اس آیت کو پڑھ کر اور اس کے ترجمے کو دیکھ کر عام آدمی تو یہی کہے گا کہ جب چار چیزوں یعنی لیل و نہار اور شمس و قمر کو "مسخر" کے تحت جمع کر دیا گیا ہے تو "نجوم" کو "مسخرات بامرہ" کے ساتھ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس کو طولِ کلام سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔ لیکن شاہ صاحب کی توجیہ کو دیکھ کر انسان ان کے غور و فکر کی گہرائی کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وہ صحیح غور و فکر ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بار بار انسان کو متوجہ کیا ہے۔ ارشاد باری ہے "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" (اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بیکار نہیں پیدا کیا) حالانکہ یہ الفاظ انسان کی زبان سے ہی

ادا کر گئے ہیں لیکن جب انسان غور و فکر سے کام نہیں لیتا تو اس کو بہت سی چیزیں بیکار معلوم ہونے لگتی ہیں۔ شاہ صاحب اس مختصر حاشیہ کے ذریعہ جہاں نجوم، کو لیل و نہار اور شمس و قمر سے علیحدہ بیان کرنے کی مصلحت بتائی ہے۔ وہاں یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کوئی شے فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ تاہم بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے فائدے اور کام ظاہر ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ جن کے فائدے ظاہر نہیں ہیں لیکن اس بنا پر ان کو بیکار نہ سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ ایک اور مقام پر قرآن کریم نے اجرام سماوی کا یہ فائدہ بتایا ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (سورہ الانعام: ۹۷)

ترجمہ: اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندروں کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔

اکیسویں پارے یعنی اُتْلُ مَا اُوْحِيَ کی آخری آیتوں اور بائیسویں پارے یعنی وَمَنْ يَّقْنُتْ کی ابتدائی آیات میں ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے حسن معاشرت کے بعض اصول بتائے ہیں۔ یہ ایک طویل رکوع ہے جس میں از اول تا آخر ازواج مطہرات سے تخاطب ہے اور جمع مونث کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ...... وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ۝

اس عبارت کے بیچ میں یہ فقرہ بھی آ گیا ہے اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا اس فقرہ کو آیت

تطہیر کہا جاتا ہے۔ یہاں دو مقامات پر ضمیر جمع مذکر استعمال ہوئی ہے عَنْكُمُ (تم سے) اور يُطَهِّرَكُمْ (اور ستھرا کرے تم کو) لیکن جس طرح پہلے اور بعد کی آیتوں میں ضمیر جمع حاضر چل رہا ہے اسی طرح ان دونوں موقعوں پر بھی ضمیر جمع حاضر ہی کو کام میں لایا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن ازواج کو پہلے اور بعد میں مخاطب کیا جا رہا ہے ان ہی سے مخاطب اس آیت تطہیر میں بھی ہے۔ تاہم عرب کے محاورہ کے مطابق یہاں ضمیر جمع مذکر استعمال کی گئی ہے۔ لیکن ایک فرقے نے اس ذرا سے فرق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس آیت کا تعلق حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد سے قائم کر دیا اور آج کل (ایک جماعت کے نزدیک) اہل بیت کا لفظ اسی خاندان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کوئی کوئی مفسر رحم کھا کر ازواجِ رسولؐ کو بھی اہل بیت میں شامل کر لیتا ہے ورنہ وہ ازواج ہونے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں شامل کیے جانے کے قابل نہیں سمجھی جاتیں۔ حضرت شاہ صاحب نے روشِ عام سے ہٹ کر ازواجِ مطہرات کو اصلی اہل بیت قرار دیا ہے۔ اور تحریر کیا ہے کہ ان کے بعد اور گھر والے بھی اہل بیت میں شامل ہیں۔ شاہ صاحب کا ترجمہ اور تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو[1]۔

---

[1] یہاں تو مخاطب ازواجِ رسولؐ سے ہے۔ اس لیے قواعد کے مطابق بھی جمع حاضر کی ضمیر کا استعمال مناسب ہے لیکن محاورہ عرب نے تو جمع حاضر مذکر کی ضمیر کا استعمال حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی ایک زوجہ کے لیے بھی جائز رکھا ہے۔ چنانچہ جب فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ کو اسحاقؑ کی اور اسحاقؑ کے بعد یعقوبؑ کی خوش خبری دی تو وہ بولی "قَالَتْ يَا وَيْلَتَىٰ أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ" الخ (ہائے میری کم بختی! کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جبکہ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿٣٣﴾ (۲۲ : ۳۳ : ۳۳)

اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں۔ اے گھر والو، اور ستھرا کرے تم کو ایک ستھرائی سے۔ ف ۴

ف ۴ - یہ خطاب ہے ازواج کو اور داخل ہیں حضرت کے سب گھر والے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے واضح طور پر بتلایا ہے کہ "یہ خطاب ہے ازواج کو" لیکن حضورؐ کے سب گھر والوں کو اہل بیت میں داخل کر کے یہ صراحت نہیں کی کہ "ان سب گھر والوں سے کون کون حضرات مراد ہیں۔ چونکہ اس کے لیے قرآن میں کوئی اشارہ یا قرینہ نہیں ہے اس لیے آپ نے اس کو مبہم چھوڑ دیا ہے۔ چونکہ حضورؐ سے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی جیسا کہ قرآن کریم کے ان الفاظ سے واضح ہے "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ" (الاحزاب) صاحبزادیاں سب بیاہی جا چکی تھیں جس کی وجہ سے ان کو آپؐ کے گھر والوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا اس لیے شاہ صاحب کے

(بقیہ حاشیہ) بڑھیا بھی تو بس ہو گئی اور میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" یہ سن فرشتوں نے جو فقرہ کہا قرآن کریم کی زبان میں وہ یہ آیت ہے:

"قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ﴿۷۳﴾ (ہود: ۷۳)

ترجمہ: - فرشتوں نے کہا "اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم کے گھر والو تم پر تو اللہ کی رحمت اور برکتیں ہیں اور یقیناً اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے۔"

اس فقرہ کو کہ "اور داخل ہیں حضرت کے سب گھر والے" آپ کی احتیاط پسندی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

سورۃ "عبس" کی پہلی دو آیتوں کا ترجمہ اور تفسیری حاشیہ شاہ صاحب نے اس طرح دیا ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی (۸۰: ۱ تا ۲)

تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا ف ۳ اس سے کہ آیا اس کے پاس اندھا ف ۴

ف ۳ حضرت ایک کافر کو سمجھاتے تھے کہ اس میں ایک مسلمان آیا نابینا۔ وہ اپنی طرف مشغول کرنے لگا کہ وہ آیت کیونکر ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ حضرت پر گراں لگا بے وقت کا پوچھنا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ آیتیں بھیجیں۔

ف ۴ یہ کلام گویا اوروں پاس گلہ ہے رسول کا۔ آگے رسول کو خطاب فرمایا۔

ایک صحابی جن کا نام ابن ام مکتومؓ تھا نابینا تھے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے ہمراہ غزوات میں نہیں لے جاتے تھے اور اکثر مدینہ میں قائم مقام کی حیثیت سے چھوڑ جاتے تھے۔ چنانچہ ۲۷ یا ۲۸ غزوات میں سے ۹ میں وہی قائم مقام رہے۔ اکثر مفسرین نے نابینا مسلمان سے مراد انہی کو لیا ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے یہاں بھی محتاط روش اختیار کیا ہے۔ اور صرف نابینا مسلمان کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔ نام نہیں لیا ہے۔ شاہ صاحب نے ان دونوں آیتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکایت قرار دیا ہے۔

سورۃ "البروج" کی تفسیر کے تحت "اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ" کے

قصے میں شاہ صاحب نے لکھا ہے۔

"ایک بادشاہ کا لے پالک بیٹا تھا۔ بادشاہ اس کو بھیجتا تھا ساحر پاس کہ سحر سیکھے۔ وہ بیٹھتا ایک راہب پاس کہ انجیل سیکھے۔ اللہ نے اس کو کمال دیا کہ شیر اور سانپ اس کا کہا مانیں اور کوڑھی اندھے اس کے ہاتھ چھونے سے چنگے ہوں۔ اس کے ہاتھ سے بہت خلق اللہ پر اور حضرت عیسیٰ پر ایمان لائی۔ بادشاہ تھا بت پرست۔ اس نے لے پالک کو مار ڈالا پھر شہر میں ہر محلے کے آگے کھائی کھودی۔ آگ سے بھری۔ پھر محلے میں سے مرد اور عورتیں پکڑ منگاتا۔ جو بت کو سجدہ نہ کرے آگ میں ڈالتا۔ ہزاروں خلق شہید کیے۔ جب اللہ کا غضب آیا وہی آگ پھیل پڑی۔ بادشاہ اور امیروں کے گھر سارے پھونک دیئے۔"

بعض مورخین اور مفسرین کے نزدیک یہ واقعہ نجران[1] میں پیش آیا تھا یا تو شاہ صاحب کے زمانے تک یہ تحقیق نہیں ہوئی ہوگی یا پھر عوام کیلئے غیر ضروری سمجھ کر انہوں نے اس ملک کا نام نہ بتایا ہو۔ بہر حال ترجمہ اور تفسیری حواشی کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے پیش نظر ہمیشہ عوام رہتے تھے۔ اس لیے وہ آسان زبان، سلجھا ہوا پیرایۂ بیان اور عوام کی عقل و سمجھ کے مطابق واقعات اختیار کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دو سو سال گزرنے کے بعد بھی ان کا ترجمہ اور تفسیری حاشیہ مقبول ہے۔

۱۔ دیکھیے تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ نمبر ۲۹۶ ——— عرب کے مشہور واقعہ نجران کا ہے۔ جسے ابن ہشام، طبری، ابن خلدون اور صاحب معجم البلدان وغیرہ اسلامی مورخین نے بیان کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے بھی تاریخ ارض القرآن میں یہی لکھا ہے۔

تفسیر قرآنی موسومہ حقانی

سید شاہ حقانی نبیرہ سید شاہ برکت اللہ

سنہ ۱۲۰۶ ہجری

یہ تفسیر قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ (یو۔پی) کے ایک بزرگ سید شاہ حقانی نبیرہ سید شاہ برکت اللہ نے تحریر فرمائی۔ مفسر موصوف نے شروع میں سبب تفسیر بتا کر یہ امر بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ تفسیر پورے قرآن کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور اللہ تعالیٰ کا نام او اور اس کے حبیب اور اس کی آل و اصحاب صَلَوٰتُ اللّٰہِ عَلَیْہِمْ اَجْمَعِیْنَ کے نام کو پڑھ کر یہ عاصی کہتا ہے کہ احوال اس کے لکھنے کا یہ ہے جو غور کر کے دیکھا تفسیر زبان عربی میں اور فارسی میں عالموں، فاضلوں، بزرگوں نے اس پارہ سے چھ برس (۱۲۰۶) کے عرصے میں تصنیف کری ہیں اور اپنے فہم و عقل کے زور سے معنیوں کو آیت آیت حرف حرف کے ساتھ فصاحت اور بلاغت کے لکھے ہیں اور زیر و زبر کو قاعدہ صرف نحو کے سے ثابت کیا ہے اور شان نزول اور احوال پیغمبروں کے موافق حدیث اور روایت صحابہ رضی اللہ عنہم کے داخل کرے ہیں جو ان تفسیروں کو نظر کیا دریا علم کا اور ہدایت کا ہے کہ موج مار تا ہے۔ جاری ہے اور ہر ایک کو اس کے مدعا کو پہنچتا ہے۔ استاد جیسا کچھ چاہیے

شکل ہے۔ پھر آخر کار کتب خانۂ استادی، مرشدی حضرت
بھائی صاحب وقبلہ حضرت سید شاہ حمزہ صاحب قدس اللہ
سرہ العزیز کے تفاسیر پا کر کے حرف حرف کے معنوں کو اور
شان نزول ہر ایک کلمے اور آیت اور صورت کا دریافت
کر کے اور سب احوال پیغمبروں کا سمجھ کر موافق وقوف اور
عقلی اہمیت کے نزدیک کے ہر ایک کلمے اور آیت اور صورت
کے ساتھ مختصر کر کے لکھا۔ داخل کیا تاکہ ان پڑھوں کو جلد
سمجھنے میں آوے۔ عبارت طویل کو موقوف کیا کس واسطے کہ
دل عالم کے تنگ ہو گئے ہیں۔ زیادہ عبارت کے پڑھنے سے
الجھتے ہیں، تنگ آتے ہیں۔ بلکہ پڑھے ان پڑھوں سے زیادہ
بھی چھپاتے ہیں۔"

شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ وتفسیر کا سنہ تصنیف ۱۲۰۵ھ ہے اور
بعض حضرات کے خیال کے مطابق شاہ رفیع الدین کا ترجمہ ۱۲۰۳ھ میں شائع
ہو چکا تھا۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا بعید از قیاس نہیں کہ
ان دونوں ترجموں اور شاہ عبدالقادر دہلوی کی تفسیر "موضح قرآن" کو
دیکھ کر سید شاہ حقانی مارہروی کو تحریک ہوئی کہ وہ خانوادہ ولی اللٰہی
کے ان دو نامور سپوتوں کے شروع کیے ہوئے کام کو آگے بڑھائیں اور
اپنی فہم اور عام مسلمانوں کی ذہنی سطح کے مطابق قرآن کریم کا ایک اور ترجمہ
کریں اور مختصر الفاظ میں آیات قرآنی کی نہایت عام فہم اور سلجھے ہوئے
انداز میں تفسیر لکھیں۔ مقدمہ میں جو باتیں شاہ عبدالقادر صاحب نے بیان
کی تھیں تقریباً وہی ۔ سید شاہ حقانی نے دہرائی ہیں۔ اس سے اندازہ کیا
جا سکتا ہے کہ شاہ عبدالقادر کی شروع کی ہوئی تحریک کا رد عمل کتنی جلدی ہوا۔

یہ ان کے کام کی بیّن ثبوت ہے۔

جن بزرگوں نے قرآن کریم یا احادیث نبوی کی کچھ خدمت انجام دی
ان کی نیتوں پر شک و شبہ کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے البتہ چونکہ
ذہنی صلاحیتیں سب کی یکساں نہیں ہوتیں اس لیے یہ اعتراف کرنے میں
کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ جو بات شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ اور
تفسیری حاشیہ میں ہے وہ سید شاہ حقانی کے ترجمہ میں دکھائی نہیں دیتی۔
نمونہ کے لیے سورہ بقرہ کی آخری چند آیتوں کا ترجمہ جو تفسیر قرآنی موسومہ
حقانی سے نقل کیا گیا ہے، درج ذیل ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ
نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا
بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا
فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (بقرہ (۲) ۲۸۶)

ترجمہ: رنج میں نہ ڈالے گا خدا تعالیٰ کسی کو مگر موافق طاقت
اس کی کے۔ اس کو ہے جو عمل کیا اور اوپر اس کے جو گناہ کیا۔
اے پروردگار میرے عذاب مت پکڑ تو مجھ پر جو بھول جاؤں
میں یا خطا کروں میں۔ اے پروردگار میرے اور پر بوجھ مت
دے تو اوپر میرے بوجھ بھاری جیسے بوجھ رکھا تو نے اوپر
اس گروہ کے کہ پہلے تھے مجھ سے۔ اے پروردگار میرے اور مت
رکھ اوپر سر میرے کے بوجھ جو کہ نہ اٹھا سکوں میں اور درگزر
کر خطاؤں میری سے اور بخش تو گناہوں میرے کو اور رحم کر

تو اوپر میرے۔ تو ہے خاوند میرا۔ پھر غالب کر تو مجھ کو اوپر
قوم کافروں کے۔"

اس کے مقابلہ میں شاہ عبدالقادرؒ کا انہی آیتوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی شخص کو مگر جو اس کی گنجائش ہے۔
اسی کو ملتا ہے جو کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو کیا۔ اے رب
ہمارے نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں۔ اے رب ہمارے
اور نہ رکھ بوجھ ہم پر بھاری جیسا رکھا تھا تو نے اگلوں پر۔
اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم کو جس کی طاقت نہیں ہم کو
اور درگزر کر ہم سے، اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر۔ تو ہمارا
صاحب ہے۔ مدد کر ہماری قوم کافر پر۔"

"لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا" کا ترجمہ شاہ حقانی صاحب نے "رنج میں نہ ڈالے گا خدا تعالیٰ کسی کو" اور شاہ عبدالقادرؒ صاحب نے "اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو" کیا ہے ــــــ شاہ عبدالقادر صاحب نے "اللہ تکلیف نہیں دیتا" محاورہ کے مطابق کیا ہے۔ آج بھی ہم روزمرہ کی گفتگو میں یہی کہتے ہیں "فلاں صاحب کو تکلیف نہ دو" یا "آپ تکلیف نہ کیجیے" یا "آپ نے بڑی تکلیف کی"۔ اس جگہ "رنج میں نہ ڈالے گا" کسی طرح موزوں نہیں۔ اس سے مفہوم بدل جاتا ہے۔ پھر قرآن کریم کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ "حیاتِ دنیوی میں اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی گنجائش اور طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا" گویا یہ سب کچھ زمانہ حال کے لیے کہا جا رہا ہے۔ لیکن شاہ حقانیؒ صاحب نے ترجمہ زمانہ مستقبل میں کر کے کچھ ایسا تاثر دیا ہے کہ یہ بات اخروی زندگی کے لیے کہی جا رہی ہے۔

غرض شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے ہاں اختصار کے ساتھ ساتھ زبان کی

سادگی، سلاست اور فصاحت زیادہ ہے۔ سید شاہ حقانی صاحب کے
یہاں خوبیاں اس حد تک دکھائی نہیں دیتیں۔ تاہم جب یہ حقیقت سامنے
آتی ہے کہ یہ دو سو سال پہلے کی نثر کا نمونہ ہے تو ہمیں اس کی اہمیت کا
اندازہ ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نثر اردو کے نمونے تقریباً ناپید تھے
اور زیادہ تر دفتری، علمی، ادبی کام فارسی میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ نجی
خط و کتابت بھی فارسی ہی میں ہوتی تھی۔ اس وقت اللہ کے کلام کو اس
قدر صاف، سادہ اور عام فہم نثر اردو میں پیش کر دینا ان علماء کا ایسا
کارنامہ ہے جس کی داد دینے سے بھی ہم لوگ قاصر ہیں۔

تفسیر قرآن

از

حکیم محمد شریف خاں علوی دہلوی

دہلی کے شریف خانی خاندان کے اطباء کے مورثِ اعلیٰ حکیم محمد شریف
خاں دہلوی، عہدِ شاہ عالم ثانی کے مشہور و معروف طبیب تھے۔ ان کا
سالِ ولادت تو معلوم نہیں۔ سنہ وفات میں بھی تذکرہ نگاروں میں باہم
اختلاف ہے۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق، حکیم محمد احمد خاں دہلوی کے حوالے
سے ان کا سنہ وفات ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء بتاتے ہیں۔ تذکرہ علمائے
ہند کے مولف مولوی رحمان علی ان کا سنہ وفات ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ء
قرار فرماتے ہیں۔ وہ نہایت وثوق سے لکھتے ہیں۔

ان کی وفات ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۵ء میں ہوئی۔ کسی شاعر نے ان کے انتقال کی
تاریخ یوں کہی ہے۔

قطعۂ تاریخ انتقال حکیم شریف خاں دہلوی

دریغا ازیں دار فانی گزشت — حکیم و طبیب و لطیف و ظریف
خرد گفت سال وفاتش بمن — صد افسوس مرزا محمد شریف [1]
۱۲۲۱ھ

تذکرہ علمائے ہند کے مترجم و مرتب ڈاکٹر محمد ایوب قادری اس تحریر پر یہ اضافہ کرتے ہیں۔

بعض تذکرہ نویسوں نے $\frac{۱۲۲۲ھ}{۱۸۰۷ء}$ تحریر کی ہے اور "دخل الجنۃ بلا حساب" مادہ تاریخ لکھا ہے۔ حکیم شریف خاں کے مزار پر جو لوح کندہ ہے اس پر بغیر "ۃ" کے "دخل الجنۃ بلا حساب" تحریر ہے [2]

ڈاکٹر سید حمید شطاری اپنے تحقیقی مقالہ "قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر" میں لکھتے ہیں۔

"دخل الجنۃ" بغیر "ۃ" کے نہیں بلکہ بغیر نقطوں کے ہو گی اور یہ کتابت کی غلطی ہے۔......"ۃ" کے عدد (۴۰۰) جوڑے جانے کے بعد ہی ۱۲۲۲ ہو سکتے ہیں [3]

بہر حال ان تمام اختلافات کے باوجود اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ حکیم صاحب تیرھویں صدی ہجری مطابق انیسویں صدی عیسوی میں فوت ہو گئے۔

حکیم محمد شریف خاں کے والد کا اسم گرامی حکیم محمد اکمل خاں تھا۔ وہ بھی اپنے زمانے کے نامی گرامی طبیب تھے۔ تذکرہ علمائے ہند کے مترجم لکھتے ہیں:

"حکیم محمد شریف خاں علم و فضل اور شہرت و ناموری میں باپ سے

---

[1] تذکرہ علمائے ہند (اردو) شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۱۹۶۱ء ص ۲۳۳

[2] ایضاً ص ۲۳۳

[3] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۰۷

یعنی سبقت لے گئے۔ شاہ عالم کے عہد میں شاہی طبیب رہے۔ اشرف الحکما کا خطاب ملا۔[1]

ترجمہ و تفسیر قرآن کے علاوہ حکیم محمد شریف خاں کی اور بھی کئی تصانیف ہیں، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

عجالۂ نافعہ، تالیف شریفی، علاج الامراض، دستور الفصد، حاشیۂ نفیسی، حاشیۂ شرح اسباب، مشکوٰۃ شریف کا فارسی میں ترجمہ کاشف المشکوٰۃ کے نام سے کیا۔[2]

حکیم محمد شریف خاں کی تفسیر قرآن کا سنِ تصنیف معلوم نہیں ہو سکا۔ قیاس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ تفسیر شاہ عبد القادر محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین دہلوی کے ترجموں کے بعد مکمل ہوئی ہوگی۔ یہ تفسیر ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ اس کا واحد قلمی نسخہ حکیم محمد احمد خاں صاحب کے کتب خانے میں موجود تھا۔ انہی سے اس تفسیر کے وجود کا علم ہوا اور انہی کو دیکھ کر بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب نے اس کے بارے میں تمام معلومات فراہم کیں۔

ترجمے سے مفسر اور کاتب کے ناموں کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ "حکیم محمد شریف خاں نے شاہ عالم ثانی کے ایما پر یہ کام انجام دیا تھا۔ ترجمے کی عبارات درج ذیل ہے۔

"لِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃُ کہ ایں تفسیر سلامت تحریر حسب الامر ارفع اشرف اعلیٰ پادشاہ جمجاہ دین پناہ السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان اسد المعارک والمغازی جلال الدین۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند (اردو) ص ۲۳۳

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۳، قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۰۳

محمد شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ وافاض علی العالمین برہ واحسانہ ذرہ خاکسار بے مقدار حکیم محمد شریف خاں بن حاذق الملک حکیم محمد اکمل خاں مرحوم شروع در تسوید و تحریر آں نمودہ بود بمساعدت توفیق الٰہی و معاضدت اقبال شہنشاہی در نیکوترین ازمنہ و بہترین اونہ زیب و زینت اختتام پذیرفت الحمد للہ الذی بہ توفیقہ تمت ہذا التفسیر محمد بدر الدین مفوض اللہ بن فیض اللہ ......[1]

بابائے اردو مولوی عبد الحق، حکیم شریف خاں صاحب کی اس تصنیف کو قرآن مجید کا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

"حکیم صاحب اسے تفسیر کہتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ترجمہ ہے۔ البتہ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ ترجمے کی صراحت کے لیے بڑھا دیا گیا ہے جیسا کہ نمونے معلوم ہوگا۔"[2]

اس صراحت کے بعد بابائے اردو تحریر فرماتے ہیں:

"اس کی زبان شاہ عبد القادر مرحوم کے ترجمے کے مقابلہ میں زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی میں اتنی سختی نہیں کی گئی ہے۔ اردو زبان کی ترکیب کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ نیز شاہ صاحب کی طرح ہندی کا میل نہیں بلکہ ریختے میں ترجمہ کیا ہے۔[3] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کی لمبی چوڑی تفاسیر کو دیکھ کر بابائے اردو

---

[1] قدیم اردو ص ۱۳۶ بحوالہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۰۶

[2] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۰۹

[3] ایضاً ص ۲۰۷

حکیم صاحب کی تفسیر کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اور اس کو ترجیح کرتے ہیں۔ مظہر ہیں۔ لیکن جس زمانہ میں حکیم صاحب نے تفسیر لکھی تھی اس وقت اختصار سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ حکیم صاحب کے سامنے شاہ عبدالقادر صاحب کا بھی تفسیری حاشیہ موجود تھا لہٰذا انہوں نے وہی طرز اختیار کیا اور تحت اللفظ ترجمہ کی وضاحت کر دی۔ ترجمہ فارسی محاوروں اور ترکیبوں کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ نہ کہ خالص اردو۔ "شعوذ بناہ پکڑنا" فارسی ترکیب کا لفظی ترجمہ ہے۔ عوام کے سمجھانے کو اتنا ہی بہت تھا۔ رہا حکیم صاحب کی زبان کے عیادت ہونے کا معاملہ۔ اس کا سبب خود بابائے اردو نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ حکیم صاحب نے شاہ صاحب کی طرح جدت نہیں بلکہ دیکھے ہیں ترجمہ کیا ہے۔ یہاں سورہ فاتحہ مع استعاذہ و بسملہ کا ترجمہ و تفسیر درج ہے۔

"(اَعُوْذُ بِاللّٰہِ ......) پناہ پکڑتا ہوں میں اور التجا کرتا ہوں میں ساتھ اللہ کے بدی شیطان وسواس ڈالنے والے کے سے کہ دور رحمت ہی سے اور نکالا گیا بہشت سے (بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) شروع کرتا ہوں میں قرآن اوپر ساتھ نام اللہ لائق بندگی کے بہت بخشنے والا اوپر خلق کے وجود دینے سے دنیا میں مہربان ہے اوپر ان کے آخرت میں"۔ (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ...... وَلَا الضَّآلِّیْنَ) جو تعریف کہ اول سے آخر تک موجود ہے لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا ہے تمام عالموں کو بخشنے والا وجود کا آخرت میں مہربان داخل کرنے بہشت کے سے مالک دن قیامت کے کا تصرف کرنے والا اس دن جو چاہے گا کرے گا۔ خاص تجھی کو بندگی کرتے ہیں ہم اور خاص تجھی سے مدد مانگتے ہیں ہم۔ اوپر بندگی تیری کے۔ دکھا تو ہم کو راہ سیدھی بیچ قول کے اور فعل کے اور اخلاق کے۔ راہ ان آدمیوں کی ...... اور نہ گمراہ ہونے والوں کی"۔

"تفسیر کے بعض حصوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں حکیم صاحب نے شاہ صاحب کا پوری طرح تتبع کیا ہے مثلاً الرحمٰن الرحیم کی تفسیر (حکیم صاحب) بہت بخشنے والا اور خلق کے وجود دینے سے دنیا میں مہربان ہے اور ان کے آخرت میں۔"

(شاہ صاحب) خوب بخشتا ہے اور خلق کے وجود حیات کا۔
بخشش کرنے والا ہے اور خلق کی کہ ایمان لائی ہیں ساتھ اس کے اور بچانے والا ہے آفت سے دن آخرت کے۔"

حکیم محمد شریف خان کی اہمیت یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ اور تفسیر موضح قرآن کے بعد اردو زبان میں پورے قرآن کی یہ دوسری تفسیر ہے۔ اور نہایت عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے۔

تفسیر سورہ فاتحہ

از

حضرت سید احمد شہیدؒ

"فاتحہ" مونث ہے فاتح کا۔ اس لفظ کے لغوی معنی ہیں کھولنے والی عورت یا کامیاب ہونے والی عورت۔ اس لفظ کا مادہ فتح (ف ت ح) ہے جس کے معنی کھولنا ہیں۔ مثلاً فتح الباب یعنی دروازہ کھولنا۔ اصطلاحاً غالب ہونا۔ مالک ہونا۔ فتح کرنا بھی ہوئے جیسے فتح البلاد شہر فتح کیا، اس پر غلبہ پایا، مالک ہوا۔ وغیرہ۔ یہ کلام مجید کی پہلی سورت کا نام ہے جس کی وجہ سے اس لفظ کے مجازی معنی دیباچہ۔ عنوان، آغاز اور شروع ہونے کے ہیں۔ "سورہ فاتحہ" میں سات آیات ہیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے اس کو سبع مثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس سورہ کی اہمیت

اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کا آغاز اسی سورہ سے ہوتا ہے۔ دراصل یہ ان جامع و مکمل دعاؤں کا مجموعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سکھائی ہیں اور جن کو دن میں متعدد بار دہرانے کا حکم دیا ہے۔ انسان کو اپنے "عبد" (بندہ) اور اللہ تعالیٰ کے "معبود" (جس کی بندگی کی جائے) ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

پورا قرآن مجید اسی سورہ فاتحہ کا جواب ہے۔ "بندہ" اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" یعنی اے اللہ تعالیٰ تو ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" یعنی راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا۔ نہ وہ جن پر غصہ ہوا ہے اور نہ بہکنے والے۔ گویا ان آخری آیتوں سے اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ "سیدھی راہ" سے کیا مراد ہے۔

بندہ کی اسی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ یعنی یہ کتاب جو تمہیں دی جا رہی ہے تمام نقائص سے پاک ہے۔ یہ ہدایت دیتی ہے ان متقی لوگوں کو جو غیب کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے ان کو دیا ہے ان میں سے اِنْفَاقٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کرتے ہیں۔

کس قدر بلیغ انداز ہے۔ شروع ہی میں بندہ کو یہ بتا دیا ہے کہ تمہاری ہدایت کے لیے ہم یہ کتاب بھیج تو رہے ہیں لیکن یہ یاد رکھو کہ اس سے تمہیں ہدایت اسی صورت میں ملے گی جب تم تقویٰ کو اپنے دل میں جگہ دے کر ان باتوں پر عمل کرو گے۔ (۱) يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (۲) يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (۳) وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب "تدبر قرآن" میں تحریر کیا ہے یہ بات بتا دی ہے کہ قرآن کریم ہدایت کا سرچشمہ تو ہے مگر اس سے ہدایت اسی صورت میں مل سکتی ہے جب تم اس کا مطالعہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے کرو۔ اگر دنیا کے دکھانے کے لیے بغیر سمجھے بوجھے اس کی تلاوت کرتے رہو یا تنقیدی نظر سے اس کا مطالعہ کرو تو اس سے تمہیں کوئی ہدایت حاصل نہیں ہوگی۔

بہرحال سورہ فاتحہ کی اہمیت مسلّم ہے۔ اسی لیے کئی حضرات نے اس کا ترجمہ نہایت اہتمام سے کیا ہے ساتھ ہی تفسیر بھی بیان فرمائی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سورت کی جو تفسیر لکھی ہے وہ اردو زبان میں ادب العالیہ کا ایک نادر نمونہ ہے۔ انداز بیان نہایت موثر اور زبان بے حد شگفتہ ہے۔ ان سے تقریباً ایک صدی پہلے حضرت سید احمد شہید نے بھی نماز میں اسے بار بار پڑھے جانے کی وجہ سے اس کو اہم سمجھتے ہوئے یہ تفسیر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے داماد اور اپنے مرید مولانا عبدالحئی صاحب کو املا کرائی تھی جو ۲۰ صفحات کے ایک رسالہ کی شکل میں جمادی الآخر سنہ ۱۲۳۷ ہجری میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ بعد میں لوگوں نے اس کی نقلیں بھی کیں جن میں دو قلمی نسخوں کا حوالہ ڈاکٹر سید حمید شطاری نے اپنے تحقیقی مقالہ "قرآن مجید کے اردو تراجم اور تفاسیر" میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس کے دو مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں۔ ایک کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں ہے اور دوسرا کتب خانہ آصفیہ میں۔ اگرچہ کاتبوں کے نام نہیں ہیں لیکن دونوں کاتب الگ الگ معلوم ہوتے ہیں"[1]

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۱۳۰

ترقیمہ کی عبارت درج ذیل ہے:

"الحمد للہ کہ تفسیر الحمد شریف کی ہندی زبان میں جو حضرت رئیس المومنین امام العارفین سید المسلمین زبدۃ الواصلین پیر و مرشد حضرت سید احمد صاحب نے لکھنؤ پہنچانے تم کو اور سب مسلمان بھائیوں کو ان کو لکھانے اور ترالیہ کرنے فیض اور ارشاد ان کا۔ آپ اپنے زبان فیض و ہدایت ترجمان سے فرما کر جامع علوم ظاہری و باطنی مولانا عبد الحئی صاحب دام فیضہ سے تحریر کروائی۔ اور حقیقت صلوٰۃ کی خوبیاں نماز پنجگانہ ہے۔ اور کئی فائدوں کے ساتھ جسے ایک فاضل کامل نے حضرت پیر و مرشد کے مریدوں میں سے حضرت کی زبان اقدس سے سن کر ہندی زبان میں لکھا ہے۔ اہتمام سے عاصی میر خان اور وارث علی کے جناب مولوی سید محمد علی صاحب کی تصحیح سے مولوی بدر علی صاحب کے چھاپے خانے میں خاص و عام کے فائدوں کے لیے چھاپا ہوا۔ اگر عالی ہمت کے مقام پر عبارت محاورے کے مخالف پاویں تو زبان طعنے کی دراز نہ کریں کیونکہ مقصود چھاپنے سے محض خیر خواہی جماعت مسلمین کی اور بہتری خواص و عوام مومنین کی ہے۔ نہ آرائش الفاظ کی۔ لہٰذا جو قلمی مولوی صاحب ممدوح سے تھا۔ اگرچہ بعض مقام پر خلاف محاورہ ہو وے پچیس جمادی الآخر کی بائیسویں تاریخ سنہ ۱۲۴۷ھ ہجری میں علی ہاجرہا الصلوٰۃ والسلام طبع ہوا۔"[1]

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۳۱۵، ۳۱۶

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے طور پر لکھا گیا ہے لیکن چونکہ یہ سورہ نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے اور ہر نماز کا جزو اعظم ہے۔ لہٰذا تفسیر شروع کرنے سے پہلے نماز پنجگانہ کی تلقین، نماز کی اہمیت اور نماز کی ترکیب وغیرہ بھی مختصراً شامل کی گئی ہے۔ مضامین کی ترتیب مندرجہ ذیل طریقے پر رکھی گئی ہے۔

رسالے میں حمد و نعت کے بعد مریدوں اور عام مسلمانوں کو نماز پنجگانہ کی تلقین کی گئی ہے۔ ترکیب نماز کے ساتھ نماز کی اہمیت بھی بیان کر دی گئی ہے اور ساتھ ہی موقع موقع سے کئی فائدے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً

فائدہ: "اور اٹھانا دونوں ہاتھوں کا تکبیر میں دست بردار ہونا دونوں جہاں سے"۔

فائدہ: "نیت اور تکبیر فرض ہے۔ بعد اس کے دعا استفتاح ہے اور اس میں تعظیم اور توحید ہے"۔

فائدہ: رکوع دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ حضور میں بسبب عظمت کے پشت میری جھک گئی"۔[1]

چونکہ نماز میں سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی ایک سورہ پڑھی جاتی ہے اس لیے سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص کا ترجمہ لکھا گیا ہے اور رسالہ کے آخر میں سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھی گئی ہے۔

سورہ فاتحہ کے ترجمہ لکھتے وقت سید صاحب کے سامنے شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ رہا ہے اس لیے رسالہ ہذا میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ شاہ صاحب کا ہی ترجمہ لکھ دیا گیا ہے۔ ذیل میں سورہ فاتحہ کا متن اور دونوں

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۱۸

ترجمے درج کیے جاتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ
يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۭ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ
الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ڏ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ
عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ۧ

(ترجمہ مندرجہ رسالہ تفسیر سورہ فاتحہ) سب تعریف اللہ کو ہے جو
صاحب سارے جہان کا۔ بہت مہربان نہایت رحم والا۔
مالک انصاف کے دن کا۔ تجھی کو ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے
مدد چاہتے ہیں۔ چلا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان کی جن پر تو نے فضل
کیا۔ نہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والوں کی۔[1]

(ترجمہ سورہ فاتحہ از شاہ عبد القادر) سب تعریف اللہ کو ہے جو
صاحب سارے جہان کا۔ بہت مہربان نہایت رحم والا۔
مالک انصاف کے دن کا۔ تجھ کو ہم بندگی کریں اور تجھی سے ہم
مدد چاہیں۔ چلا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے
فضل کیا۔ نہ وہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے۔[2]

حضرت سید احمد شہید نے جس طرح ترجمہ میں شاہ عبد القادر صاحب کا
تتبع کیا ہے اسی طرح دیباچے کے لکھنے میں بھی شاہ صاحب نے بڑی حد تک
استفادہ کیا ہے۔ تاہم چونکہ رسالہ ہذا کا اصل موضوع سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے
اس لیے وہاں سید صاحب نے اپنا انفرادیت قائم رکھا ہے اور بڑے

1۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۳۰

2۔ عکسی قرآن مجید مع ترجمہ مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ قرآن منزل۔ لاہور ص ۲

دلنشین انداز سے تفسیر بیان کی ہے۔ آخری صفحہ ملاحظہ ہو۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ بتلا ہم کو راہ سیدھی یعنی صراط مستقیم
سے اللہ کی رضا سمجھنا چاہیئے۔ اور تجویز اس مقام پر مجھے لائق نہیں
اس واسطے کہ جو کوئی کچھ مانگے۔ کتنا ہی خوب سے خوب مانگے۔ اللہ
کے خزانوں میں ہزار چند اس سے بہتر ہو سکتا ہے۔ مثلاً کوئی اللہ
سے مانگے ایسی بہشت اس طرح کی حوریں مجھے ملیں اور ان حوروں
کے بیان میں خوبیاں اس کے خیال میں گزریں۔ بلکہ جو ساری
مخلوق کے خیال میں گزریں وہ سب کہے اور اس کے سوال مطابق
اللہ تعالیٰ عنایت فرما دے۔ پھر اللہ اپنی قدرت سے ایسی حوریں
پیدا کرے کہ یہ حوریں جو اس کے مانگنے کے موافق ہیں۔ اس
حد کے آگے لونڈی سی ہو جاویں۔ اس واسطے اچھا سوال یہی ہے
کہ اس کی رضا مانگے۔ اپنی تجویز نہ کیجیے۔ اور رضا خدا کی ہر اچھے
کام پر ہوتی ہے۔ اور اچھا کام کبھی برے ان سے بھی ہو جاتا ہے۔۔۔۔
۔۔۔۔ بعضے کافر کھانا بھوکوں کو دیتے ہیں۔ مال خرچ کرتے ہیں
۔۔۔۔ پس یہ رضا کچھ کام نہ آوے گی۔ دنیا میں اللہ چاہے
بدلہ دے پر آخرت میں ان کو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ جب اللہ کی
رضا بعضے اچھے کام کر بروں سے ہوتے ہیں۔ ان پر بھی ہووے
ہے تو اس واسطے صراط مستقیم کا بیان جتلایا۔ کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ
اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کہ راہ ان کی جن پر فضل کیا تو نے۔ وہ لوگ پیغمبر
اور صدیق اور صالح ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ اپنی وہ رضا نہیں مت
جو ایسے لوگوں کو دی۔ نہ ایسی رضا کہ جیسے کسی اچھے کام پر بعضے
برے لوگوں کو ہو جاتی ہے کہ ان پر غصے بھی ہوتا ہے ان کی برائیوں

ہے اسی واسطے فرمایا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ۔ نہ وے کہ جس پر غصہ کیا جیسے گنہگار، فاسق کہ خدا کے غضب میں ہیں ہر چند کوئی کام ان سے اچھا بھی ہو جاوے کہ اللہ کے یہاں مرضی ہو۔ وَلَا الضَّآلِّیْنَ اور نہ گمراہ جیسے کافر، ہر چند ان سے بھی کبھی کوئی کام اللہ کی رضامندی کا ہو جاوے پر ان کی راہ بھی ہرگز نہیں مانگنا ان کے نصیب وہ رضامندی نہیں کہ جو آخرت میں فائدہ دے۔

جس زمانہ میں یہ تفسیر لکھی گئی اس سے پہلے فورٹ ولیم کالج[1] میں اردو نثر نے بڑی ترقی کر لی تھی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ میر امن، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، بہادر علی حسینی، مظہر علی خاں ولا، مرزا کاظم علی جوان، شیخ حفیظ الدین احمد وغیرہ کے ہاتھوں اردو زبان کافی منجھ گئی تھی۔ بہت سی ضخیم کتابیں تصنیف یا ترجمہ ہو کر اردو کے ذخیرۂ کتب میں داخل ہو چکی تھیں۔ خود سید احمد شہیدؒ[2] کے سلسلے کے بزرگوں نے دین کے مسائل پر متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے تھے۔

شاہ عبد العزیزؒ کے بعض شاگردوں اور مریدوں نے بھی بعض غیر اسلامی رسوم و رواج کے خلاف رسالے لکھے تھے۔ جیسے نواب صدیق حسن کے والد اولاد حسن قنوجی نے تعزیہ داری کے رد میں ایک رسالہ "ہدایت المومنین" لکھا تھا۔ اس کا اثر ہے کہ رسالہ ہذا کی زبان نہایت صاف ستھری ہے۔ اگر کوئی

---

[1] فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا تھا۔ اور میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس وغیرہ کی کتابیں ۲۴ فروری ۱۸۰۴ء کو گلکرسٹ کے مستعفی ہونے سے پہلے لکھی جا چکی تھیں جبکہ سید احمد شہیدؒ کی ولادت ۱۷۸۶ء میں ہوئی۔ ۱۸۰۸ء میں ان کا تعلق شاہ عبد العزیزؒ سے ہوا اور یہ تفسیر اس تعلق کے قائم ہونے کے بعد ہی لکھی گئی۔

حقیقتہً موجودہ محاورے کے خلاف دکھائی دے تو اس کے لیے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اوّل تو یہ املا ہے، دوسرے اب سے دو سو سال پرانا ہے

تفسیر مجدّدی المعروف بہ رؤفی

از

شاہ رؤف احمد مصطفیٰ آبادی

اس تفسیر کے مصنّف شاہ رؤف احمد مصطفیٰ آبادی، شاہ ابوسعید دہلوی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ وہ ۱۰ محرم ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام رحمان بخش ہے۔ انہوں نے علومِ شرعیہ کی تحصیل و تکمیل حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مرزا مظہر جانِ جاں کے خلیفہ اجل شاہ غلام علی دہلوی سے سلسلہ نقشبندیہ میں خرقۂ خلافت پایا۔ شاعری میں شیخ قلندر بخش جرأت (م ۱۸۱۰ء) کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ رافت تخلص ہے۔ شاعری کا ذوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ باقاعدہ دیوان مرتب کرنے کے علاوہ انہوں نے جا بجا اپنے اشعار سے کام لیا۔ چنانچہ تفسیر قرآن میں بھی اپنے اس ذوق کو پورا کیا ہے۔ جملہ مراحل طے کرنے کے بعد بھوپال چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اردو فارسی میں مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں اہم ترین[۱۴] تفسیر رؤفی ہے۔ یہ اردو میں ہے۔ اس کا آغاز ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں اور اختتام ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں ہوا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد بھوپال سے حج بیت اللہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے لیکن جہاز ہی میں راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے۔ ان کا سنہ وفات ۱۲۴۹ھ ہے۔ عبدالغفور نساخ نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ کہا ہے۔

رافت آں قبلۂ ارباب کمال | از جہاں رفت بہ سوئے جنت[1]
بہر تاریخ رحلتش تاریخ | شد رقم "قدوۂ جنت رافت"

۱۲۴۹ھ

جیسا کہ سطور بالا میں بتایا گیا ہے شاہ رؤف احمد صاحب کی سب سے اہم تصنیف "تفسیر رؤفی" یا "تفسیر مجددی" ہے۔ یہ تفسیر دو جلدوں میں مکمل ہوئی ہے دوسری جلد میں سورہ ناس کی تفسیر کے بعد ایک مثنوی بھی شامل ہے۔ اس میں مفسر علام نے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنی حالت بیان کی ہے۔ اور آخر میں تفسیر کے تعلق سے یہ دو اشعار لکھے ہیں۔

کلام الٰہی کا اردو زباں میں | کھلا ترجمہ صاف آئینہ سا ہے
بتاریخ آئی ندا غیب سے یوں | کہ تفسیر قرآن ہندی زباں ہے

پھر اس تفسیر کی انفرادیت کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے:

تفسیر کتاب آسمانی | ایسی کہ ہر ایک کے دل نشیں ہے
اردو میں بیان ہیں حقائق | قبل اس کے کوئی ہوئی نہیں ہے

آخر میں ایک شعر سے مادۂ تاریخ تکمیل نکالا ہے اور ضمناً مفسر کے نام کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔ کہتے ہیں۔

تاریخ میں اس کے دل یہ بولا | شاباش رؤف آفریں ہے
۱۲۴۸ھ

تفسیر کا انداز یہ ہے کہ پہلے آیت لکھی گئی ہے پھر فوراً اس کا ترجمہ مع تفسیر

---

[1] تذکرہ علمائے ہند (اردو) صفحات ۲۶۰، ۱۹۶۱ء (مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری) مع مقدمہ از ڈاکٹر سید معین الحق۔ شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۳۰ نیو کراچی
او محصلہ سوسائٹی کراچی، سنہ طبعہ، پہلا ایڈیشن سنہ اشاعت ۱۹۶۱ء)

دے دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں موقع کی مناسبت سے مفسر نے اپنا اردو شعر
دے دیا ہے۔ تفسیر میں شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ ترجمہ میں اکثر اوقات
تحت اللفظ اور بامحاورہ کو ملا دیا ہے لیکن کہیں کہیں لفظی ترجمہ کا اس درجہ
التزام کیا ہے کہ تعقید لفظی کا عیب پیدا ہو گیا ہے اور کہیں ایسا شگفتہ اور
شاعرانہ انداز اختیار کیا ہے کہ اس کی وجہ سے اس پر ایک ادبی تحریر و تصنیف
ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ تفسیر میں چونکہ ترجمہ سے زیادہ آزادی ہوتی ہے
اس لیے اس میں یہ تمام باتیں اور صفات زیادہ شدت سے دکھائی دیتی ہیں۔
نمونے کے لیے سورۂ نبا کی چند آیات کا ترجمہ اور تفسیر پیش ہے۔ ملاحظہ ہو:

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ کس چیز سے سوال کرتے ہیں کافر۔ سمجھ لیجیے کہ پیغمبر
خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو دعوت اسلام کی ظاہر فرمانے لگے اور قرآن شریف
پڑھ کر روز قیامت سے ڈرانے لگے کفار نبوت میں آپ کے اور نزول قرآن
میں اور وقوع بعثت میں اختلاف کر کر آپس میں پوچھنے لگے یا پیغمبر خدا
صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اور مومنوں سے سوال کرنے لگے، حق تعالیٰ نے
ارشاد فرمایا کہ کس چیز سے پوچھتے ہیں کافر عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ خبر بڑی
ہے کہ قرآن شریف ہے الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ وہ خبر جو بیچ اس کے
اختلاف کرنے والے ہیں کہ شعر یا سحر یا کہانت ٹھہراتے ہیں اور جھوٹی باتیں
اور پہلی کہانیاں بتلاتے ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ نبا عظیم نبوت حضرت صلی اللہ
علیہ و آلہ وسلم کی ہے۔ کافروں کا شبہ تھا کہ یہ پیغمبر ہیں یا ولی یا شاعر یا ساحر
یا مجنون۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ نبا عظیم بعثت ہے اس میں کافر اختلاف
کرتے تھے۔ کتنے کہتے تھے بعد مرنے کے نہ جئیں گے نہ اٹھیں گے إِنْ هِيَ إِلَّا
حَيَاتُنَا الدُّنْيَا اور کتنے کہتے تھے قیامت کو اٹھیں گے لیکن شفاعت
ہماری ہمارے بت کریں گے هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ اور کتنے منکر ہی

قیامت ہو گی یا نہ ہو گی بَلْ ھُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْھَا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے
فرمایا۔ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ہرگز نہیں۔ یوں البتہ شتاب جانیں گے وقت نزع
کے کہ جس میں اختلاف کرتے ہیں وہ حق ہے ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ پھر
ہرگز نہیں۔ یوں البتہ جلد جانیں گے، دن قیامت کے مجھے قول پلید عقیدہ
اپنے کو اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِھٰدًا۔ کیا نہیں کیا ہے ہم نے زمین کو بچھونا
بچھا ہوا سا قرارگاہ تمہارا ہے۔ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا اور پہاڑوں کو میخیں زمین
کی تا ان سے محکم رہے۔ وَخَلَقْنٰکُمْ اَزْوَاجًا اور پیدا کیا ہم نے تم کو نر اور
مادہ تا نسل تمہاری باقی رہے یا طرح طرح کے سیاہ اور سفید، دراز اور کوتاہ
خوب و زشت وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا اور کیا ہم نے نیند تمہاری کو
آرام بدن کا تمہارے۔ سمجھو جیسے کہ نیند سے حس و حرکت جاتی ہے قوائے
حواس آرام و آسائش پاتے ہیں۔ ماندگی دور ہوتی ہے وَجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا
اور کیا ہم نے رات کو پردہ مانند لباس کے جو چیزوں کو چھپا لے۔ شیخ محی الدین عربی
رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے فتوحات مکیہ میں کہ رات لباس اصحاب لیل ہے
نگاہ اغیار سے چھپے کہ اس میں لذت مکالمہ کی یا محاضرہ کی یا مشاہدہ کی حسب
اپنے اپنے استعداد کے اٹھاتے ہیں۔

کیوں بہائیں دعا عاشقوں کو راتیں | محبوب سے کرتے ہیں وے باتیں
پاتے ہیں جلوہ اس میں راحت | رکھتے ہیں شہود حق کی لذت

شیخ الاسلام نے فرمایا ہے کہ شب پردہ روندگان راہ ہے و بازار
بیداران سحرگاہ ہے۔

شب محرم راز عاشقاں است | شب خلوت خاص عارفاں ہے

وَجَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا۔ اور کیا ہم نے دن کو وقت طلب معاش
کا اور تحصیل میں اسباب کے جستجو کرو۔ [1] آج سے ڈیڑھ سو سال کی تحقیق ہے نے

[1] [illegible]

کی وجہ سے کہ فارسی کا ذوق ہنوز باقی تھا۔ عبارت میں فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔

تفسیر پارہ عمّ

یہ تفسیر مخطوطہ کی شکل میں دریافت ہوئی ہے اور مخطوطہ کے بھی صرف دو نسخوں کا پتہ چل سکا ہے۔ ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہے، ایک بابائے اردو مولوی عبدالحق کے پاس تھا۔ دونوں نسخوں سے نہ اس تفسیر کے مصنف کا پتہ چلا اور نہ کاتب کا نام معلوم ہوا۔ بابائے اردو کے نسخے کا سنہ کتابت ۱۲۵۴ھ ہے جو ۱۸۳۹ء سے مطابقت رکھتا ہے لیکن اس سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس تفسیر کا آغاز کس سنہ میں ہوا۔ اور تکمیل کس سنہ میں ہوئی۔ قیاس کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ تفسیر انیسویں صدی عیسوی کے دوسرے ربع میں لکھی گئی ہوگی۔ طرزِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مفسر کا تعلق برصغیر کے شمالی حصہ سے ہے۔

کتب خانۂ آصفیہ اور بابائے اردو کے معلوم نسخوں میں یہ فرق ہے کہ اوّل الذکر میں بطور ابتدائیہ اور تفصیل و تفسیر کے طور پر جو عبارتیں دی گئی ہیں وہ موخر الذکر میں مفقود ہیں۔ اسی وجہ سے بابائے اردو اور نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اس کو تفسیر ماننے میں تامل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ عمّ کے پارے کا ترجمہ ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی کی رائے ہے کہ:

"اس کو تفسیر کی بجائے ترجمہ کہنا چاہیے کیونکہ اس میں آیتوں کے لفظی معنی لکھ کر بعض مقامات پر مزید تفصیل کی گئی ہے اور زیادہ تر معنی پر اکتفا کیا گیا ہے۔"[۱]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب کے نزدیک تفسیر میں صرفی اور نحوی مسائل کا بیان کرنا، فلسفیانہ موشگافیوں اور کلامی بحثوں میں الجھانا اور اسرائیلیات اور قصے کہانیوں کا شامل ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے بعض عربی میں لکھی جانے والی تفسیروں کو سامنے نہیں رکھا جن میں وہی انداز اختیار کیا گیا ہے جو زیر نظر تفسیر کا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں مثال تفسیر جلالین کی ہے جو اپنے اختصار کے باوجود تفسیر ہی سمجھی جاتی ہے اور مقبولیت میں عربی میں لکھی جانے والی کسی تفسیر سے کم نہیں۔ اس مثال کے سامنے ہوتے ہوئے تفسیر "فیاوۃ عمّ" کو تفسیر کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

سورۂ نبا جو عام طور پر عمّ یتساءلون کے نام سے معروف ہے اور اس کا شانِ نزول بتاتے ہوئے مفسر نے اس سورۃ کے شروع میں بیان کیا ہے۔

> "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں آشکارا لوگوں کو دینِ اسلام کی طرف بلانے لگے اور قیامت کے دن کا خوف دلانے لگے بعض کافر پیغمبری میں حضرت کی اور قرآن میں اختلاف کرنے لگے اور آپس میں پوچھنے لگے، یہ نیا دین اور قرآن کیا ہے۔ کسی نے کہا شاعر ہے کسی نے کہا ساحر ہے۔ کسی نے کہا اگلے قصے (اساطیر) ہیں۔ اس واسطے حق تعالیٰ نے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حال سے خبردار کیا اور فرمایا عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ۔"

اس عبارت کو تشریح اور تفسیر کے سوا اور کیا کہا جائے گا۔ اس سے قطع نظر جب ہم سورۂ نبا کے ترجمہ اور تفسیر پر آتے ہیں تو وہاں بھی یہی کیفیت واضح نظر آتی ہے۔ چنانچہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا کی تفسیر میں زمین کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس کے بعد

ان آیات کی پوری وضاحت کر دیتے ہیں۔ یہ غرض ترجمہ سے بڑھ کر اس میں
اور بہت کچھ ہے جس کو ہم تفسیری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اب سورۂ نبأ کی چند آیات کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ ہو تاکہ معلوم
ہو سکے کہ مفسر نے عام طور پر کیا روش اختیار کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ کس چیز سے سوال کرتے ہیں وہ کافر آپس میں
پھر ابھی (آپ ہی) فرمایا عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ سوال کرتے ہیں
وہ خود سے کہ بڑی ہے یعنی قرآن اور نبوت اور قیامت سے الَّذِي
هُمْ فِيهِ ایسی خبر عظیم کہ وہ کافر بیچ اس کے مُخْتَلِفُونَ اختلاف
کرنے والے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ حق تعالیٰ نے فرمایا
كَلَّا سَيَعْلَمُونَ حق ہے کہ قریب جانیں گے وہ جب قیامت آئیگی
کہ پیغمبر سچے تھے۔ اور قرآن حق تعالیٰ کا کلام تھا ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ
پھر حق ہے کہ قریب جانیں گے وہ دن قیامت میں کہ برا کیا ہم نے جو
ایمان نہ لائے۔ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا کیا نہیں کی ہم نے
زمین کنیں بچھونا سا کہ رہو تم وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا اور پہاڑ ملائے
میخیں میخیں یعنی جب کہ حق تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا۔ وہ پانی پر
ہلتی تھی۔ پہاڑوں کی میخوں سے اس کو قائم کیا —— فائدہ ——
جاننا چاہیے کہ کرہ پانی کے زمین مانند گیند کے ہے۔ آدھی
سے زیادہ پانی میں غرق ہے۔ اور آدھی سے کم باہر ہے۔ اور جو کہ باہر
ہے دو قسم پر ہے۔ ایک قسم تو محض ویران ہے کہ تنکی آبادی کی اس
میں ہرگز نہیں ہے اور دوسری قسم آبادی ہے کہ اسے ربع مسکون
کہتے ہیں۔ اور اس میں دریا ہیں اور پہاڑ ہیں اور ریگستان اور جنگل
اور شہر ہیں واقع ہیں اور مساحت اس کی ایک سو بیس برس کی راہ

وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا اور پیدا کیے ہم نے تمہاری بیں جوڑے کہ
تم سے اولاد ہو وے۔ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا اور کی ہم نے
نیند کے تئیں تمہاری آرام بدن کا تا ماندگی دن کی دور ہو وے
وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا اور کیے ہم نے رات کیں لباس کہ سب کو
اندھارے سے اپنی ڈھانپیں تا عیوب کے ان کو جو کہ رات کو چھپیں
(چھپیں) صاحب فتوحات مکی فرماتے ہیں کہ رات لباس ہے، دات
کے جاگنے والوں کا ہے کہ اونوں کی نظر سے اغیار کی ڈھانپتی ہے تاکہ
اپنے معشوق سے بہرہ ور ہوویں۔ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا اور
کیے ہم نے دن کے تئیں وقت زندگی کا کہ اوس میں روزی پیدا
کرو سات کسب کے اور بچاو کیا کرو۔ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ اور بنائی
ہم نے اوپر تمہارے سَبْعًا شِدَادًا سات آسمان کے تئیں کہ
محکمت ہیں یعنی محکم اور استوار کہ بیچ اون کے کچھ فرجہ اور خلل نہیں
کہ تا نقصان کی ہے ـــــ فائدہ ـــــ پہلا آسمان فلک قمر دوسرا
فلک عطارد، تیسرا فلک زہرہ، چوتھا (چوتھا) فلک شمس، پانچو
(پانچواں) فلک مریخ، چھٹا فلک مشتری، ساتواں فلک زحل ہے۔
اس کے اوپر کرسی ہے۔ اس کے اوپر عرش ......[1]

جیسا کہ مقدمہ میں بتایا جا چکا ہے کہ عبارت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ
مفسر رضیغر کے تمام متن سے تعلق رکھتا ہے، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ
بہت سے الفاظ کا املا غلط ہے بلکہ دکنی مفسرین و مستقین کی طرح حالت
مفعولی میں اسم کی جمع اس مفسر نے بھی "یں" لگا کر بنائی ہے۔ مثلاً دریائیں،
پہاڑیں، ... اور ... ـــــ بہرحال اس کو اردو زبان کے

۱۔ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر صفحات ۲۳۳ تا ۲۳۶

الالتقا کی ایک منزل کہا جا سکتا ہے۔

تفسیر "چراغِ ابدی"

شاہ عزیز اللہ بحر رنگ

یہ پارہ عم کی تفسیر ہے جو شاہ عالم ثانی کے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں اورنگ آباد کے ایک بزرگ عزیز اللہ بحر رنگ نے لکھی تھی۔ مصنف کا اصلی نام عزیز اللہ اور تخلص بحر رنگ تھا۔ ان کے والد شاہ میر عالم حسینی ایک صوفی بزرگ تھے اور قادریہ و نقشبندیہ سلسلوں میں منسلک تھے۔ بحر رنگ کو بھی تصوف کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بڑے عالم دین اور شاعر بھی تھے۔ اوراد اور وظائف کے ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ تفسیر اور دیوان کے علاوہ ان کی اور بھی کئی تصانیف ہیں جن میں ایک رسالہ "ودودھ لیا" ہے جو فن تصوف میں ہے اور کافی شہرت رکھتا ہے۔

تفسیر "چراغِ ابدی" کا دوسرا نام چراغِ ہدایت بھی ہے لیکن چراغِ ابدی تاریخی نام ہے اس لیے یہ تفسیر اسی نام سے زیادہ مشہور ہے۔ "چراغِ ابدی" کے اعداد ابجد کے قاعدہ سے ۱۲۲۱ھ ہیں۔ اس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف ۱۲۲۱ ہجری میں ہوئی جو ۱۸۰۶ عیسوی سے مطابقت رکھتا ہے اور ۱۸۰۶ عیسوی شاہ عالم ثانی کا سالِ وفات اور شاہ معین الدین اکبر المعروف بہ اکبر شاہ ثانی کا سالِ جلوس تھا۔ مثنوی "وددھ ولیہ" ۱۲۳۳ھ کی تصنیف ہے اور "فقہ العلوم" ۱۲۲۵ھ میں منصۂ شہود پر آئی۔ شاہ عزیز اللہ بحر رنگ کے سالِ وفات کا کسی ذریعے سے بھی پتہ نہیں چلا سکے۔ تاہم بعض شواہد کی بنا پر مشفق خواجہ صاحب نے بتایا ہے کہ وہ ۱۲۶۸ھ سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔[۱]

۱۔ جائزہ مخطوطات اردو جلد اول از مشفق خواجہ شائع کردہ مرکزی اردو بورڈ لاہور طبع اول فروری ۱۹۷۹ء

چراغ ابدی کے کئی مخطوطے دستیاب ہیں۔ ان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تفسیر طبع بھی ہو چکی ہے، لیکن اس وقت تک اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ نہیں ملا۔

تفسیر "چراغ ابدی" اگرچہ اردو زبان میں ہے لیکن خود مصنف نے صراحت کی ہے کہ میں نے یہ تفسیر دکنی ہندی سے ہٹ کر اس زبان ہندی میں لکھی ہے جو بالفعل اورنگ آباد کے لوگوں کا محاورہ ہے۔ ان کی اس تشریح سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں باوجودیکہ اورنگ آباد دکن ہی کا ایک شہر تھا مگر وہ وہاں کی زبان کو دکنی زبان سے مختلف بتاتے ہیں، سچ پوچھیے تو یہ فرق ان کے زمانہ میں پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی "دلی کے دبستان شاعری" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ولی سے پیشتر دکنی زبان میں شعر گوئی موجود تھی لیکن وہ محض دکنی زبان میں تھی۔ جب سے اورنگ زیب نے اپنی شہزادگی کے زمانے سے اورنگ آباد کو اپنا مستقر بنایا (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء) اور (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) تک دکن کے مختلف شہروں کی فتوحات کے سلسلہ میں وہیں رہا تو ان کے ساتھ دہلی اور شمالی ہند کی کثیر آبادی اورنگ آباد اور اس کے قرب و جوار میں بس گئی تھی۔ اس کثیر آبادی کے اثر سے شمالی ہند کی زبان اورنگ آباد اور دکن میں رائج ہوئی جس نے دکنی تمدن اور معاشرت کے ساتھ وہاں کی زبان کو قطعی طور پر مٹا دیا۔"[1]

اس سلسلہ میں مشفق خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] دلی کا دبستان شاعری ص ۱۱۰ (طبع دوم ۱۹۷۵ء)

"بمر تک نے اپنی زبان کو" اورنگ آباد کا محاورہ" کہا ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"مؤلف نے اورنگ آباد کی زبان کی علیحدہ حیثیت قرار دی ہے جس کا دکنی زبان سے تعلق نہیں ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ ابتدا سے اور خصوصاً شاہجہاں اور اورنگ زیب کی صوبہ داری میں اس کا تعلق زیادہ تر شمالی ہند کی زبان سے رہا۔ اور وہاں کے اہل زبان اور شعرا نے جو زبان لکھی ہے وہ حیدرآباد، بیجاپور، اور علاقہ مدراس کی زبان سے بالکل الگ ہے۔ وہ زیادہ تر شمالی ہند کی زبان کی تقلید کرتے تھے۔" (قدیم اردو، ص ۱۲۵)

غرض تفسیر چراغ ابدی کے مصنف نے اپنے زمانے کے رجحان کو دیکھ کر اپنے دور اورنگ آباد کی مروجہ زبان استعمال کی ہے۔ دیباچہ کی عبارت سے بھی اس کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ ملاحظہ ہو[1]:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بہترین تفسیر حمد الٰہی ہے اور خوش تقریر نعت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و صحبہٖ صلوٰۃ متوترۃ عن التناہی۔

اما بعد

بیت

عرض کرتا ہے وہ مسند الوفسی

آشنا یوں نہیں غم گسار و لسی

تا بہ تعیّن کو جو کم نامی دلی استعدادی طالب منصب وارستگی و آزادی فقیر عزیز اللہ ابن میر عالم الحسینی القادری النقشبندی

---

[1] تذکرہ مخطوطات اردو جلد اوّل ص ۲۲

اورنگ آبادی المتخلص بہ مہر رنگ عفا اللہ عنہ وعن والدیہ
و احسن الیہما والیہ کہ جب دیکھا میں اکثر تفسیریں کلام اللہ
کی زبان عربی اور فارسی میں واقع ہیں اور کم علمی بعض اہل ہند کی
دریافت سے معنی ان کے مانع۔ اگرچہ بعض حضرت وسابق ازعزیزوں
نے زبان دکنی ہندی آمیز میں تفسیر جز آخر کی لکھی ہیں لیکن بسبب
الفاظ دکنی کی طرف زبان ہندیکا پورا نہیں پاتا اور دل یادل
کا واسطے مطالعہ اوس کی رغبت کم لاتا۔ اس واسطے اس طرح امر
ہیں اس حقیر کی آیا کہ تفسیر جز آخر کی زبان ہندی میں کہ بالفعل
اورنگ آباد کی لوگوں کا محاورہ ہے لکھی اور بعض فوائد کہ دوسری
تفسیروں میں نہیں ہیں کتب معتبرہ سے جمع کر کر اس میں داخل
کرے کہ عوام اسی باوجود قلت بضاعت کے فائدہ تمام اٹھادیں
اور اس حقیر کی دعا مغفرت سے یاد لاویں

تا اسی ہو وسیلۂ عقبی
بلکہ سب کو مفید ہو اجرا

بعد تقدیم اسمی اس کی اور استعانت حضرت باری کی جو ہر سورۃ
کی فضیلت اور نفع اور خاصیت اور ختم اور تعبیر اور بعض سورۃ کی
فضیلت اور خاصیت ...... وَمِنَ اللّٰہِ التَّوْفِیْقُ وَبِیَدِہٖ
اَزِمَّۃُ التَّحْقِیْقِ[1]

اگرچہ تفسیر چراغ ابدی " عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ " کے پورے پارے کی تفسیر ہے۔
جہاں تک کہ کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطہ کا تعلق ہے وہ پورے "عم"

۱؎ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر از ڈاکٹر سید حمید شطاری، صفحات ۲۲۹، ۲۵۷

کے پارے کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس میں صرف مندرجہ ذیل گیارہ سورتیں شامل ہیں۔

(۱) سُوْرَۃُ وَالنّٰزِعٰتِ		(۷) سُوْرَۃُ الطَّارِقِ	
(۲) سُوْرَۃُ تَکْوِیْر		(۸) سُوْرَۃُ الْاِنْفِطَار	
(۳) سُوْرَۃُ عَبَسَ		(۹) سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی	
(۴) سُوْرَۃُ الْغَاشِیَۃ		(۱۰) سُوْرَۃُ التَّطْفِیْف	
(۵) سُوْرَۃُ الْفَجْر		(۱۱) سُوْرَۃُ الْاِنْشِقَاق	
(۶) سُوْرَۃُ الْبُرُوْج			

تفسیر کی نوعیت بھی عجیب ہے۔ ہر سورہ کی تفسیر اس کی آیتوں کی ترتیب سے کرنے کی بجائے اس میں مضمون کی مناسبت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ لیکن نہ معلوم کس بنیاد پر مولف تفسیر العزیز ہاشمی نے اس کو مکمل پارہ عم کی تفسیر بتایا ہے اور کہا ہے کہ یہ تفسیر سورۂ الحمد سے شروع کی گئی ہے۔ اس کے بعد سورۂ نبا ہے۔ اسی طرح ہوتے ہوتے سورۂ عم یتساءلون پر تفسیر ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب کے پیش نظر کوئی دوسرا نسخہ رہا ہے یا انہوں نے اسی پر قیاس کر کے کتب خانۂ سالار جنگ کے مخطوطات کے متعلق یہ تفصیلات بیان کر دی ہیں۔ اگر اصل مخطوطہ سامنے ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ہاشمی صاحب جیسا محقق اس نوع کی غلطی کرتا۔

جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ تفسیر زیر نظر کے ہر مخطوطے میں ترقیمہ موجود ہے جس سے ہر مخطوطے کا سنہ کتابت معلوم ہو جاتا ہے لیکن مخطوطہ نمبر ۱۸۱ کے ترقیمے میں سہواً سنہ ۱۱۴۳ھ درج ہو گیا ہے جو غالباً ۱۲۴۳ھ ہے۔

مخطوطہ نمبر ۱۸۰ میں دیباچے کے بعد متعدد ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ مثلاً ذکر تعوذ: اس میں استعاذہ کی فضیلت اور ضرورت بیان

ہے۔ اس کے بعد تفسیر استعاذہ ہے پھر "ذکر تسمیہ" اور "تفسیر تسمیہ" ہے۔ بعد ذکر
"سورہ فاتحہ" اور "سورہ فاتحہ" کی تفسیر بیان کر کے قرآن مجید کی ترتیب
کے مطابق سورۂ "نبا" سے سورہ "الناس" تک کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ ہر سورہ
کی تفسیر سے پہلے اس سورہ کے پڑھنے کے فیوض و برکات تحریر کیے گئے ہیں۔

اس مخطوطہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آیتوں کا لفظی ترجمہ کر کے اس کے
ساتھ تفسیر کو اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں
اور ترجمے کو تفسیر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ترجمہ کبھی تفسیر سے پہلے کبھی تفسیر کے
بعد اور کبھی درمیان میں ہے۔ کہیں کہیں تفسیر کے مفہوم کو دلنشین اور موثر بنانے کے لیے
مفسر نے اپنے اشعار دیے۔ نمونے کے لیے سورہ فاتحہ کی تفسیر ملاحظہ ہو:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" تمام حمد یعنی ثنا کرنا اور خصلتیں نیک کی قدردانی اور شکر
کرنا اور نعمتیں دینے موصوف کی حق سے جس حالت سے ہوئی طرف محمود کی۔ یہ سب
ثابت ہے خاص اللہ تعالیٰ کے تئیں کہ وہ لائق ہے اس چیز کے اور حقیقت رکھتا
ہے اس چیز کی۔ اور جو سوائے اوس کے لائق نہیں کہ سراہا جاوے ساتھ ان صفتوں
کمال کے۔ "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ایسا اللہ کہ مالک ہے اور پرورش کرنے والا
ہے کل عالم کا۔ کسیکو روزی ظاہر سے پرورش کرتا ہے اور کسیکو روزی باطن
سے اور کسیکو ساتھ طاعت کے پرورش کرتا ہے اور کسیکو ساتھ محبت کے اور
کسیکو ساتھ فرقت کے اور کسیکو ساتھ وحدت کے۔ اگر ہر ایک کوئی اوپر یافت
نعمت کے شکر دولت کا بجا لاوے اور زیادتی نعمت کی طلب کرے تو حق تعالیٰ
کرم اپنے سے واسطے شکر کے اوس کی نعمت زیادہ کرتا ہے۔ اہل طاعت کو مرتبہ محبت
کا دیتا ہے۔ اور اہل محبت کو رتبہ معرفت کا اور اہل معرفت کو درجہ وحدت کا

عنایت کرتا ہے۔ الحمد کے بعد "عالمین" کی مختلف اقوال سے تشریح کی گئی ہے
"الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" رحمٰن رزق دینے والا دنیا میں تمام کافر اور مومن کو علی العموم
اور رحیم معاف کرنے والا آخرت میں تمام مومنوں کی علی الخصوص۔ کہ ہے اس
معنی واسطے دعا میں کہا جاتا ہے کہ یا رَحْمٰنَ الدُّنْیَا وَرَحِیْمَ الْاٰخِرَۃِ ہے
یا رَحْمٰنُ رحمت کرنے والا طرف خلق کے علی العموم اور رحیم رحمت کرنے والا
طرف خلق کے علی الخصوص کے ہے اور معنی رحمت کے چاہنا خدا نے تعالیٰ کا نیکی
کو طرف لائق اوس نیکی کے ہیں یا معنی رحمت کے ترک کرنا عذاب کو مستحق سے
عذاب کے اور نیکی کرنا طرف اس کی جو لائق کے نہیں ہے ہیں۔

"مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" مالک ہے روز جزا کا اور قادر ہے اوپر پیدا
کرنے ذاتیں عدم سے طرف وجود کے کہ سوائے اس کے دوسرا قادر نہیں یا
جزا دینے والا ہے روز جزا دینے کی بندوں کو موافق اعمال اور احوال انہوں کے
کہ جزا مطیعوں کی جنت ہے اور جزا محبوں کی قربت اور جزا عارفوں کی وصلت
ہے اور جزا موحدوں کی تجلی خاص (اس سلسلہ میں مختلف اقوال پیش کیے گئے ہیں)
......."اِيَّاكَ نَعْبُدُ" تجھے ایک پوجتے ہیں اور لیے مجھے ہیں ہم۔ اور خاص
بندگی اور فرمانبرداری تیری کرتے ہیں ہم (عبادت کے بارے میں خلوص کی تفصیل
بیان کی گئی ہے۔)........ پس قول بغیر فعل کے وبال ہے اور عبادت بے
اخلاص کے بدحال قطعہ:

جو کوئی تیرے کوچۂ الفت میں در آوے
کافر ہے جو پھر دیکھے در و بام کسی کا
ہر گز نہ بجز یار کے اس دل میں جگہ دو
مت غیر کو آشنا یہ جس کا نام کسی کا
"وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" اور خاص تجھی یاری چاہتے ہیں ہم۔ عبادت اور نیک

ترجمہ اگر مجھے بغیر شرک اور ریا اور عجب اور رعونت کی لو جیں ......

صاحب تفسیر نے تمہید میں اس تفسیر کے قلم بند کرنے کی یہ غایت بتائی ہے کہ یہی تفاسیر کی زبان اہل اورنگ آباد کے لیے نامانوس سی ہے۔ اس لیے انھوں نے بلفظ اکثر اورنگ آباد کے محاورے میں لکھی ہے تاکہ اس علاقے کے رہنے والے اس کو بآسانی پڑھیں اور سمجھ سکیں۔

چونکہ اورنگ آباد شمالی ہند اور دکن دونوں سے یکساں طور پر متاثر ہوا تھا اس لیے ان دونوں کے امتزاج سے ایک گنگا جمنی زبان بن گئی۔ اور اورنگ آباد کی زبان کی یہ خصوصیت آج تک برقرار ہے۔ مترجم نے اپنی تفسیر میں اورنگ آباد کی زبان کی ان ہی خصوصیات کو سمویا ہے۔ اہل دکن کے برخلاف وہ علامت فاعلی "نے" کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ بعض جگہ وہ غلط بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے اس شعر میں۔

نام میں جا بار کھوں ایسا کہ نکلے تاریخ

فکر کر دل نے اٹھا لول "چراغ ابدی"

دور قدیم میں "نے" کا استعمال قطعی طور پر مسلم نہیں ہوا ہے اور قواعد اردو نویسوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جمع بنانے کے بھی انھوں نے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ مثلاً کہیں وہ واو۔ نون سے جمع بناتے ہیں اور کہیں الف۔ نون سے۔ اکثر موقعوں پر اسماء جمع مذکر کی جمع "ی ن" سے بنائی ہے جیسے بیماریں۔ بیداریں وغیرہ۔ ان بے احتدالیوں کے باوجود ان کی زبان خاصی سلیس اور رواں ہے۔ خطی نسخوں کی کثرت اور ملک کے مختلف حصوں میں ان کی تسوید سے اس کی خاص و عام میں مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

نثر عبارت میں جہاں قرآن حکیم کی آیات کے تراجم ہیں وہاں احتیاط سے ترجمہ کیا ہے لیکن اس قدر لفظی بھی نہیں بنایا کہ آج کے قاری کو اس میں الجھن ہو

البتہ بعض اور تفاسیر کی طرح اس میں عاشقانہ اشعار کو معرفت کا رنگ
دیا ہے جو بعض ثقہ حضرات کو پسند نہیں۔ لیکن ایک خاص دور میں اس علاقے
کے مخصوص لہجہ کی جھلکیاں اس میں موجود ہیں۔

تفسیر قرآن مجید

یہ تفسیر مخطوطہ کی شکل میں ہے۔ مخطوطہ کا نمبر ۸۴ ہے اور یہ ادارہ ادبیات
اردو حیدرآباد دکن کی تحویل میں ہے۔ مخطوطہ کا عنوان تو تفسیر قرآن مجید ہے
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورے قرآن مجید کی تفسیر ہوگی۔ لیکن اس عنوان
سے جو چیز دستیاب ہے وہ صرف پارۂ عمّ کی تفسیر ہے جو سورہ نبا
سے شروع ہو کر سورہ ناس پر ختم ہوتی ہے۔ آخر میں سورہ فاتحہ کی تفسیر
ہے۔ ممکن ہے مفسر کا ارادہ پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا ہو اور چونکہ پارہ
عمّ میں چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں جن میں بیشتر عقائد بیان کیے گئے ہیں۔ نیز
یہ سورتیں اکثر نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں جس کی وجہ سے عوام و خواص سب
ان سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے پہلے اس پارہ کی تفسیر لکھ دی ہو۔ بعد میں
دیگر مصروفیات یا اجل نے مہلت نہ دی ہو اور کام آگے نہ بڑھ سکا ہو۔

اتفاق سے اس تفسیر میں نہ دیباچہ ہے نہ ترقیمہ اس لیے نہ مفسر کے نام کا
پتہ چل سکا نہ سنہ تصنیف معلوم ہو سکا۔ اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ مفسر کا تعلق
شمالی ہند سے ہے یا دکن سے۔ صرف انداز تحریر سے اور قیاس کی بنا پر اتنا کہہ سکتے
کہ مفسر کا تعلق دکن سے ہے۔ اور یہ تفسیر تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں
لکھی گئی تھی۔ چونکہ تفسیر میں جگہ جگہ اشعار سے کام لیا گیا ہے اس لیے یہ امر
بعید از قیاس نہیں ہے کہ مفسر ایک اچھا شاعر بھی تھا۔

تفسیر زیر نظر کا آغاز سورہ نباء کی شان نزول سے ہوا ہے۔ ابتدا ل

چند سطریں ذیل میں درج ہیں۔

"ہرگاہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دعوت ظاہر کی اور تمام خلق اللہ
کو توحید سنائی اور روزِ قیامت کا خوف سنایا اور کفار نبوت میں
حضرت کی اور نزول میں قرآن کی اور بعثت میں موت کی آپس
میں اختلاف کرتے پیغمبر سے پوچھتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
"عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ" کس چیز سے سوال کرتے ہیں کافران یعنی
یعنی کافران قریش کے ......"

جیسا کہ سطورِ بالا میں کہا گیا ہے کہ مفسر شاعر بھی معلوم ہوتا ہے اس کے
ثبوت میں چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

سورۂ نبا کی پہلی چھ آیتیں دے کر اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اس کی
تفسیر بیان کی گئی۔ پھر مزید تشریح کے لیے یہ قطعہ لکھا گیا۔

(آیات) عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ...... ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ

قطعہ

باقی نہ رہے کس کی خبر بے خبری ہے ۔۔۔ سارا وجود آدم کا جب ہوگا معدوم

مالک سے ہمارا راز آشکار ہے محقق ۔۔۔ باطن میں جو ہیں اپنے مقرب بے خبری ہے

اب آخر میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر ملاحظہ ہو:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" تمام تعریف اول سے آخر تک
سزاوار ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نہیں ایسا اللہ کہ پیدا و پرورش کرنے والا ہے
تمام عالم کا۔ اَلرَّحْمٰنِ بخشنے والا ان کا دوسری یا العبد فنا
ہونے دنیا کے۔ اَلرَّحِيْمِ بخشنے والا رحمت سے دوسری
یا بہشت میں داخل کرنے کا طرح مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

مالک مختار ہے روزِ محشر کا جو چاہے حکم کرے اِیَّاکَ نَعْبُدُ
تیرے تئیں بندگی کرتے ہیں ہم لیکن تو عبادت کے ہے لوں۔
وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اور خاص تیری مدد توفیق بندگی چاہتے ہیں۔
ہم کہ صاحب اعانت ہے توں۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ
ہدایت فرما ہمارے تئیں راہ مقصود دین اسلام صِرَاطَ الَّذِیْنَ
اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ایسے راہ نعمت دی۔ ایمان بخشیا توں ہم
پر فضل سے اپنے ساتھ فایدہ ہدایت نبوت اور رسالت کے۔
غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ نہ راہ ان مغضوبوں کا غضب کیے
گئے ہیں اور تیرے حکم کوں عدولی کرتے ہے وَلَا الضَّآلِّیْنَ اور
نہ راہ ان گمراہوں کا جو تیرے حبیب کی رسالت کے قائل نہیں۔
آمین۔ یعنی ایسا ہی ہو یجیو۔ قول فرشتوں کا ہے۔ تمت تمام شد"

اس تفسیر کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں مفسر نے عام قاری کی نفسیات اور فہم کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ ترجمہ اور تفسیر کو اس طرح ادا کر دیا ہے کہ قاری کے ذہن میں کوئی الجھن نہ رہے اور وہ لمبی چوڑی تشریحات میں پھنس کر مطلب سمجھنے سے محروم رہ جائے۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر مفسر نے کہیں تو آیتوں کا صرف ترجمہ دے دیا ہے۔ کہیں ترجمہ کے ساتھ ساتھ ایک آدھ تفسیری جملے کا اضافہ کر دیا۔ اور کہیں صرف تفسیر بیان کر دی ہے۔ غرض جیسی ضرورت تھی ویسا طریقہ اختیار کیا ہے۔

سورہ ناس کے ترجمہ اور تفسیر میں مفسر نے حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی کا تتبع کیا ہے۔

بعض جگہ تو مفسر نے بڑی حکمت اور دانائی سے کام لیا ہے اور ان کے طرز سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے زمانہ بلکہ آئندہ زمانہ

تفسیر تنزیل یا فوائد البدیعیہ

بابا قادری حیدر آبادی کی

یہ دونوں نام سید بابا قادری حیدر آبادی کی تفسیر قرآن مجید کے ہیں۔ ناموں کے فرق کے علاوہ دونوں میں یہ بھی فرق ہے کہ پہلے یہ تفسیر "تفسیر تنزیل" کے نام سے لکھی گئی پھر درس و تدریس کے سلسلے میں تفسیر تنزیل کے توضیح طلب اس کی جو توضیح و تشریح کی وہ اس تفسیر میں داخل کر کے مصنف و مفسر سید بابا قادری نے اس نظرثانی شدہ ایڈیشن کا نام فوائد البدیعیہ کر دیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے[1] ناموں کے اس فرق کے سبب اور اپنی اسی غلط فہمی کی وجہ سے کہ انھوں نے تفسیر تنزیل کو بارھویں صدی ہجری اور فوائد البدیعیہ کو تیرھویں صدی ہجری کی تصنیف سمجھا، ان کو دو الگ الگ تفسیریں قرار دیا اور ان کے مصنفین کو بھی مختلف شخصیتیں سمجھا لیکن تفسیر تنزیل کے مخطوطات اور فوائد البدیعیہ کے مخطوطے میں بعض ایسے شواہد موجود ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان دونوں کے لکھنے والے ایک ہی بزرگ بابا سید قادری ہیں۔ البتہ تفسیر تنزیل اس تفسیر کا ابتدائی ایڈیشن ہے اور فوائد البدیعیہ نظرثانی شدہ ایڈیشن ہے۔

تفسیر ہذا کے مصنف سید بابا قادری حیدر آبادی کے ایک ذی وجاہت خاندان کے چشم و چراغ تھے جو شریعت و طریقت اور علم و فضل میں نہایت ممتاز تھا۔ ان کے والد سید شاہ یوسف ابن سید محمد عبداللہ قادری نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں ایک صاحبِ شریعت و طریقت بزرگ تھے۔

---

[1] قدیم اردو، کراچی ۱۹۶۱ء ص ۱۲۹

سید شاہ محمد یوسف کے دو بیٹے تھے۔ ایک تو یہی بابا سید شاہ درویش جن کا پورا نام سید محمد درویش بابا قادری تھا۔ اور دوسرے ان کے بڑے بھائی سید شاہ عبداللہ قادری تھے جن کی عرفیت قطبی صاحب تھی۔[1]

سید شاہ محمد یوسف شیخ طریقت اور صاحب تصانیف کثیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ریاست کے معاملات میں بھی دخیل تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۲۴۳ھ کے لگ بھگ ہوا۔ اور مدفن وہیں گنبد کے متصل بودے شاہ (ابو علی شاہ صاحب) کی گھڑی کے پاس قبرستان میں ہوئی۔ زیر نظر تفسیر کے دیباچے میں سید شاہ یوسف کے متعلق مرقوم ہے:

عَلَّامَۃُ الْعَصْرِ الْجَامِعُ بَیْنَ عُلُوْمِ الظَّاہِرِ وَالْبَاطِنِ وَصَاحِبُ التَّصَانِیْفِ فِی الْمَعْقُوْلِ وَالْمَنْقُوْلِ وَالتَّصَوُّفِ[2]

سید شاہ عبداللہ قادری المعروف بہ قطبی صاحب کے بارے میں ڈاکٹر زور محبوب الزمن اور گلزار آصفیہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"قطبی صاحب اپنے والد کے علاوہ ایک اور بزرگ شاہ خاموش کے بھی خلیفہ تھے۔ یہ شاہ خاموش صاحب شاہ اسرار اللہ کے مرید تھے اور ہمیشہ خاموش رہا کرتے تھے۔ درویش فانی و فقیر حقانی تھے۔ ان کا مکان دروازہ چار انگلیاٹ کے اندر واقع تھا۔ اس لئے بعد کے مورخوں نے ان کو شاہ خاموش اول کے لقب سے یاد کیا ہے۔"[3]

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ص ۲۶۷

[2] مخطوطات تفسیر خیر ابی (نمبر ۲۶۶، ۲۷، ۵۲۹، ۸۵۳۲) دیباچہ

[3] محبوب الزمن صفحہ ۹۰۶ اور گلزار آصفیہ صفحہ ۳۸۶ بحوالہ تذکرہ مخطوطات جلد سوم ۔ ادارہ ادبیات اردو (۵۱۱)

مولوی نصیر الدین ہاشمی سید بابا قادری کے بارے میں لکھتے ہیں ؛

"سید بابا قادری کے والد کا نام سید شاہ محمد یوسف قادری تھا۔ بابا قادری کو باپ ہی سے خلافت ملی تھی۔ وہ نہ صرف ایک صوفی تھے بلکہ عالم بھی تھے۔ شریعت اور طریقت دونوں کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ آصف جاہ ثالث سکندر جاہ کی بہن خیر النساء بیگم کو سید بابا قادری سے بڑا خلوص تھا۔ وہ ان کی معتقد تھیں خیر النساء کی فرمائش سے کئی کتابیں لکھیں، جن میں سے ایک شمائل النبی بھی ہے۔"[1]

شمائل النبی کا ترجمہ سید بابا قادری نے ۱۲۵۷ھ میں شروع کیا ۱۲۶۲ھ میں اختتام کو پہنچایا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ۱۲۶۲ھ تک بقید حیات تھے۔

تفسیر تنزیل اور فوائد البدیہہ منثور مخطوطات کی شکل میں ہیں۔ تفسیر تنزیل کے کلی اور جزوی پانچ مخطوطات دریافت ہوئے ہیں اور فوائد البدیہہ کا صرف ایک مخطوطہ موجود ہے۔

تفسیر تنزیل کے ایک مخطوطے جس کے حوالے سے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے اس تفسیر پر بحث کی حسب ذیل امور کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) تفسیر تنزیل کے مصنف سید بابا قادری ہیں۔

(۲) معاونین کے نام یہ ہیں۔

(۱) حاجی میاں محمد علی (۲) محمد عبد الغفور خاں

---

[1] اردو قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں (مولوی نصیر الدین ہاشمی) مقالہ نصیر الدین ہاشمی سہ ماہی اردو۔ جنوری ۱۹۵۲ء ص ۲۷

(۳) کاتبوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) محمد مسافر (اصل نام غلام محی الدین) (۲) محمد واجد علی

(۴) تفسیر کا سنہ آغاز ———— ۱۲۰۰ ہجری

(۵) تفسیر کا سنہ تکمیل ———— ۱۲۰۷ ہجری

لیکن سنوں کے معاملہ میں یا یائے اردو سے سہو ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب سید بابا قادری تیرہویں صدی ہجری کے بزرگ تھے اور ان کی تصنیف شمائل النبی کا ترجمہ ۱۲۶۱ھ میں مکمل ہوا تو تفسیر کا سنہ آغاز اور سنہ تکمیل بھی ۱۲۲۰ھ اور ۱۲۲۷ھ ہونا چاہیے۔

اس قیاس کی تائید و تصدیق تفسیر تنزیل کے اس نسخے سے بھی ہوتی ہے جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

تفسیر تنزیل

مصنف

سید بابا قادری

معاونین

(۱) حاجی میاں محمد علی صاحب

(۲) محمد عبد الغفور صاحب

(۳) محمد مسافر صاحب خوش نویس

(۴) محمد واجد علی صاحب خوش نویس

تاریخ ابتداء تصنیف سنہ ۱۲۲۰ ہجری

تاریخ تکمیل ۲۵ ذیقعد سنہ ۱۲۲۷ ہجری۔[1]

---

[1] تفسیر تنزیل (کتب خانہ آصفیہ (جلد پنجم) ترتیب)

پایا ہے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے تمہید کی حسب ذیل عبارت درج کی ہے۔

"خدائے تعالیٰ نے جیسا کہ اس سورت (یاسین) کے تیئیس پانچ
ناس پر تمام کیا۔ اس تفسیر تنزیل کو بھی پانچ شخصوں پر تمام کیا۔
اوّل یہ تفسیر یعنی مصنف سید بابا قادری دوم حاجی میاں
محمد علی سوم محمد عبدالغفور خاں یہ دونوں اس امر میں بہت کوشش
دکھلے تھے۔ چہارم محمد صادق جوان صالح اور لائق خوش مزاج اور
خوش نویس اور پنجم محمد واحد علی کہ یہ دو شخص تصنیف کے لکھنے
والے تھے کہ خدائے تعالیٰ ان دونوں شخصوں کے لکھنے سے تفسیر
تمام کروایا۔"

"خدائے تعالیٰ قرآن شریف کے تین حروف بے سے شروع کیا
اور ختم قرآن کا حرف سین پر ہوا۔ ان دو حرفوں کے ملنے سے مرکب
کرو تو لفظ "بس" کا حاصل ہوتا ہے یعنی ان دونوں حرفوں
کے بیچ میں تمام قرآن ہے۔ بس کرتا ہے تیرے تئیں۔"

"(فرد) اوّل و آخر قرآن زچہ با آمد و سین یعنی اندر رہ دین
رہبر تو قرآن بس اور تصنیف بھی ——— تفسیر کی پانچ سال میں
تمام ہوئی کس واسطے کہ سن چالیس میں شروع ہوئی اور سن
سینتالیس میں تمام ہوئی۔ دو سال کا مل ناقص ہو گئے۔ تمام شد
تفسیر تنزیل بتاریخ بیست و پنجم شہر ذی قعدہ در سن یک ہزار
یک صد و چہل و ہفت ہجری النبوی۔"[۱]

"فوائد البدیعیہ" کے نام سے تفسیر تنزیل کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ دکن
میں ہے۔ یہ تین جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں دیباچے کے بعد سورہ فاتحہ

---

[۱] قدیم اردو ص ۱۷۸

اور اس کے بعد سورۃ البقرہ سے بارھویں جزو کے تقریباً دو رکوع تک ترجمہ و تفسیر ہے۔ دوسری جلد کا آغاز پہلی جلد کی اختتامی آیت سے اٹھارہویں جزو کی سورہ نور کی چند آیتوں تک ہے۔ تیسری جلد میں قرآن مجید کے باقی حصہ کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ اس طرح فوائد بدیعہ پورے قرآن کریم کی تفسیر ہے۔ اس تفسیر کا دیباچہ ذیل میں درج ہے:

"اما بعد فیقول الفقیر الحقیر بالبضاعت سید بابا القادری الحیدر آبادی بن سیدی و مرشدی و علامۃ العصر الجامع بین علوم الظاہر والباطن و صاحب التصانیف فی المعقول والمنقول والتصوف سید شاہ محمد یوسف القادری بن سید شاہ محمد مسکنہم اللہ المحبوبیہ خیانہ الی قد اخذہ الخرقۃ من اخی المعتی حضرت شاہ عبد اللہ القادری المعارف بقطبی صاحب اعلی اللہ بدعمرہ الہی کبیر الاکبیر بعد از چند چند لیس و وعظ اشتغال داشت کہ بعضے از دوستاں صمیمی سید لعل شاہ و سید قلندر بخش متوطن مرچنداز اولاد حضرت سیدی اسمٰعیل قدس سرہٗ خصوصاً مرزا محمد بیگ بن مرزا حاجی بیگ خان و مرزا محمد علی (باعث کہ شدن (؟)) باعث شدند کہ علمائے پیشین علی قدرہم تفاسیر عربی و فارسی تالیف فرمودہ اند اما کہ ہم مایان مغلوب التقصور از ورک آں قاصر باید کہ تفسیر بعنوان ترجمہ کلام مجید بزبان ہندی او تحریر ہم آں کہ فائدہ وغیرہ از قصص مرتب الاحوال کردہ۔ لہٰذا وفور اشتیاق ایشاں نمودہ خواست کہ آنچہ در فہم ناقص آید بزبان ہندی ترجمہ کلام ربانی بلطفہ العلام شان نزول مفید بہ قلم آرد۔ لہٰذا مستدعی از ناظران عالی فطرت آنست کہ ہر جا کہ

خطا و سہو واقع شود قلم اصلاح بر آں جاری دارند و از طعن
معاف فرمایند۔ پس شروع کردم این کتاب فی شہر ذیقعدہ
سنہ ۱۲۴۰ اربعین و مائتین بعد الالف من الہجرۃ المبارکہ
در عہد نواب مستطاب سکندر جاہ فریدون عصر نواب سکندر
جاہ بہادر دام اللہ ملکہ و متع المسلمین بطول بقائہ ......
...... و نام نہاد تفسیر را فوائد البدیعیہ[1]

واضح رہے کہ یہی دیباچہ تفسیر تنزیل کا ہے جس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ "فوائد البدیعیہ"، "تفسیر تنزیل" ہی کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہے کوئی جداگانہ تفسیر نہیں۔ دوم یہ کہ تفسیر تنزیل ۱۲۴۰ھ میں شروع کی گئی تھی ۱۲۴۲ھ میں نہیں۔

چونکہ "فوائد بدیعیہ"، "تفسیر تنزیل" کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہے اس لئے مصنف و مفسر نے بعض مقامات پر مزید وضاحت کے لیے تفسیر میں کچھ الفاظ بدل دیے ہیں تاکہ ابہام باقی نہ رہے اور عوام کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ نمونے کے لیے چند آیتوں کے اجزاء اور بعض الفاظ قرآن کی دونوں تفسیریں پیش کی جاتی ہیں:

الفاظ یا اجزاء آیات	تفسیر تنزیل	فوائد بدیعیہ
اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ	دروازہ ہر چیز کا	دروازے تمام چیزوں کے
حَتّٰى	تب تئیں	تا وقتیکہ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ	پروردگار عالم کا ہے	پروردگار کہ پرورش کرنے والا تمام عالم کا

---

1 فوائد بدیعیہ — مخطوطہ نمبر ۱۳۰۹ (کتب خانہ آصفیہ)

الفاظ مجردہ آیت	تفسیر تنزیل	فوائد بدیعیہ
سمعکم	تمہارے سننے کو	شنوائی کنیں تمہارے[1]
ابصارکم	تمہاری آنکھوں کو	بصارت کنیں تمہاری[1]

سورہ نبا کی چند ابتدائی آیات کی تفسیر ملاحظہ ہو تاکہ دوسروں کے مقابلہ میں سید بابا قادری کی زبان کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔

"جس وقت کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دعوت ایمان کے آشکارا کیے اور قرآن شریف پڑھے اور قیامت کے روز سے ڈرائے بلکہ کفار حضرت کے نبوت اور نبوت کے آنے میں اختلاف کیے اور آپس میں ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے یا پیغمبر سے اور صحابہ سے پوچھتے تھے جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔ عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ کس چیز سے سوال کرتے ہیں کفار عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ خبر عظیم سے یعنی قرآن سے اَلَّذِي هُمْ اس سے خبر کہ وہ کفار فِيهِ مُخْتَلِفُونَ بیچ اوس خبر کے اختلاف کرنے والے ہیں۔ یعنی قرآن شریف کتیں سحر اور شعر اور کہانت کی نسبت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کہانیاں اول کے ہوئی ہیں۔ اور یہ قرآن دل سے بنایا ہوا ہے۔"[2]

تفسیر از اجاعۃ

اس نام کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات میں موجود ہے۔ یہ

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر سید حمید شطاری) ص ۳۱۰

[2] تفسیر تنزیل مخطوطہ (۲۱) کتب خانہ سالار جنگ۔

چوبیس صفحوں کا ایک رسالہ ہے جس کے صرف تین ابتدائی صفحات میں ترجمہ اور تفسیر ہے اور باقی صفحات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری ایام کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں مخطوطہ میں نہ تفسیر کا نام درج ہے نہ مفسر تفسیر۔ البتہ کاتب کا نام (امین الدین) اور ترقیمہ میں کتابت کا سنہ دیا گیا ہے۔ ترقیمہ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"تمام شد تفسیر سورہ اِذَا جَاءَ بخط مربط مد و سرا فگندہ عاصی خاکسار کمترین امین الدین بتاریخ بست وتیم ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۲ھ بہ پاس خاطر حافظ منتخب علی صاحب تحریر یافت۔"

اس تفسیر کا مقابلہ جب تفسیر تنزیل یا خزانۃ الیدیہ معتقد سید بابا قادری حیدرآبادی میں شامل اِذَا جَاءَ کی تفسیر سے کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تفسیر اس کی ہو بہو نقل ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ تفسیر بھی سید بابا قادری حیدرآبادی کی ہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر تنزیل کی مقبولیت اور اِذَا جَاءَ کے فضائل کے پیش نظر حافظ منتخب علی صاحب نے ثواب دارین حاصل کرنے کی غرض سے اور تفسیر اِذَا جَاءَ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کیلئے تفسیر تنزیل سے سورہ نصر کی تفسیر اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مندرج حالات نقل کر لیے۔ پھر اس مسودہ کا بیضہ امین الدین صاحب سے تیار کرا لیا۔ اس سے لوگوں کو یہ سہولت ہو گئی کہ تفسیر تنزیل سے جو پورے قرآن کی تفسیر ہے، رجوع کرنے کی بجائے ان کی نقل کردہ تفسیر اِذَا جَاءَ سے استفادہ کر سکیں۔

ترقیمہ میں کتابت کا سنہ ۱۲۰۲ھ دیا گیا ہے جو یقیناً غلط اور سہو

کی بات ہے۔ اس لیے کہ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ تفسیر "تفسیر تنزیل" کے
متعلقہ حصہ کی نقل ہے اور تفسیر تنزیل سنہ ۱۲۴۰ھ میں شروع ہو کر
سنہ ۱۲۴۲ھ میں اختتام کو پہنچی تو اس کی نقل اس کے لکھے جانے سے
۲۰۔۱۳۵ سال پہلے کیسے ہو گئی۔ صحیح سنہ ۱۲۶۰ھ ہوگا اور اکائی اور دہائی
کے ہندسوں کے الٹ جانے سے ترقیمہ میں سنہ ۱۲۰۶ھ ہو گیا۔ اس قیاس
کو غیر حقیقی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس قسم کی غلطیاں آج کل بھی
ہو جاتی ہیں۔

اس قیاس کو کہ "تفسیر اذا جاء" نقل ہے "تنزیل" کے متعلقہ حصہ کی
اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ کتب خانہ آصفیہ میں تفسیر تنزیل سے نقل
کیے گئے دو مخطوطے "تفسیر پارۂ عم" کے نام سے موجود ہیں اور اس میں
اس بات کا اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ یہ کوئی علیحدہ تفسیر نہیں ہیں بلکہ تفسیر تنزیل
ہی سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان دونوں مخطوطوں کی درج ذیل عبارت سے یہ بات
واضح ہو جاتی ہے۔

"خدا نے تعالیٰ نماز ان بھی پانچ فرض کیا۔ صبح، ظہر، عصر، مغرب،
عشاء۔ خدا نے تعالیٰ جیسے اس سورۃ کثیرین (سورۃ ناس) پانچ
ناموں پہ تمام کیا۔ اوّل یہ تفسیر یعنی مصنف سید بابا قادری دویم
حاجی محمد علی سیوم عبدالغفور خان۔ یہ دونوں شخص اس امر میں
نہایت کوشش رکھتے تھے۔ چہارم محمد مسافر امام غلام محی الدین جمال
صالح اور لائق خوش مزاج اور خوش نویس۔ اور پنجم محمد واحد علی
کہ یہ دو شخص تالیف کے لکھنے والے تھے کہ خدا نے تعالیٰ ان دونوں
شخصوں کے لکھنے سے تفسیر تمام فرمایا۔۔۔۔۔"

تفسیر سورہ نصر کے سلسلے میں مفسر نے سورہ کی آخری آیت کے ترجمہ

کے بعد یہ معلومات قلم بند کی ہیں۔

"جس وقت یہ سورہ نازل ہوا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ
سُن کر روئے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم پوچھے کہ
"اے عباس تم کس واسطے روتے ہو؟" حضرت عباسؓ عرض کیے
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وسلم اس سورہ کے
نازل ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے تئیں دنیا سے سفر
کرنے کا حکم ہوا ہے" فرمائی رسول خدا صلی اللہ علیہ وعلی آلہ
وصحبہ وسلم کہ "اے عباس تم حق ہے" پس حضرت صلی اللہ علیہ
وعلی آلہ وصحبہ وسلم جبرئیل سے کہے کہ "اے جبرئیل ع۔م۔ میری
تئیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس سورہ لیے میری موت کی خبر
دیتا ہے" جبرئیل ع۔م۔ عرض کیے کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وصحبہ وسلم غمگین مت ہو۔ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ
اور البتہ آخرت بہتر ہے واسطے تمہارے دنیا سے" پس حضرت
صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کی آخرت کے کام میں زیادہ کوشش
کرتے تھے۔ اکثر تسبیح اور حمد اور استغفار کرتے تھے"

ہمیشہ سے یہ سنتے چلے آئے ہیں کہ سورہ "النصر" رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سُن کر حضرت صدیق اکبرؓ رو دیے تھے۔ یہاں یہ
واقعہ حضرت عباسؓ سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اور
بہت سی روایتوں کی طرح یہ روایت بھی خلافتِ عباسیہ کے دور میں وضع کی گئی
ہوگی۔ وہی روایت کسی ذریعہ سے ان مفسرینؒ کو معلوم ہو گئی ہوگی۔ اور
انھوں نے صحیح روایت کو چھوڑ کر کسی وجہ سے یہ موضوع روایت لے لی ہوگی۔
اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے آپؐ کی آخری

متصوریات اور آپ کی وصیتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف احادیث اور روایات سے مدد لی گئی ہے۔ پھر رحلت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تفصیل سے بیان کرنے کے بعد سورہ النصر پڑھنے کے فوائد اور اس کے ثواب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس عبارت پر رسالہ ختم ہو گیا ہے۔

"جو شخص کہ سورت کو خواب میں پڑھتا تو خدائے تعالیٰ اس کو دشمنوں پر فتح دے گا۔ اور تمام مشکلات اس کے حل ہوئیں گے اور بعضے کہتے ہیں کہ یہ خواب دلالت کرتا ہے موت کے تئیں نزدیک اور بھی ہر متعلقات"

سورہ نصر کا ترجمہ لفظی ہے اور آیتوں کا فی شرح و بسط کے کی گئی ہے ملاحظہ ہو:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ...... فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا

(ترجمہ و تفسیر) پیغمبر صلی اللہ علیہ و علی آلہ و صحبہ وسلم کے بھیجنے میں خدائے تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ مکارم اخلاق کو تمام کرنا اور بنا کلمہ توحید کی مضبوط کرنا اور دین اسلام کو ظاہر کرنا اور خلایق کو ہدایت کرنا جس وقت کہ یہ امور بوجہ احسن تمام ہوئے تو خدائے تعالیٰ اپنے رسول صلعم پر یہ آیت نازل کیا کہ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ۔ آج کے روز کامل کیا میں واسطے تمہارے وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ اور تمام کیا میں نے اوپر تمہارے نعمت کیتیں میری یہ آیت عرفات میں نازل ہوئی تھی جس وقت کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم حجۃ الوداع میں خطبے میں تمام مناسک حج بیان فرماتے اور کہے کہ میرے سے تمام مناسک حج سیکھو شاید کہ سال آئندہ میسر نہ ہوئیگا۔ پس

جبرئیل علیہ السلام یہ سورہ لائے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ جس وقت کہ آئی مدد خدائے تعالیٰ کی کہ تمہارے تئیں قریش پر فتح دیا۔ وَالْفَتْحُ اور فتح مکہ تمہارے تئیں اور فتح تمام شہروں کی تمہاری امت کے تئیں۔ وَرَاَیْتَ النَّاسَ اور دیکھے جو تم اے محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم لوگوں کے تئیں یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ داخل ہوتے ہیں بیچ دین اسلام خدائے تعالیٰ کے اَفْوَاجًا گروہ گروہ ——— یہ سورہ نازل ہونے کے بعد جماعت جماعت ایمان لائے تھے جیسا کہ بنی اسد اور بنی قریظہ اور بنی مرہ وغیرہ۔ حضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم کے جائیں اگر مشرف ہوتے تھے۔ فَسَبِّحْ پس تسبیح کرو تم اے محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم بِحَمْدِ رَبِّکَ ساتھ حمد پروردگار تمہارے کے یعنی کہو سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ یہ سورہ نازل ہونے کے بعد ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں دیکھتی تھی کہ ہر نماز کے بعد فرماتے تھے سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَاسْتَغْفِرْہُ۔ اور طلب مغفرت کرو تم اے محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم اوپر خدا سے یعنی واسطے کسر نفسی سے کیجیے عمل کا اقرار کرو یا استغفار کرو واسطے امت اپنی۔ تحقیق وہ خدائے تعالیٰ کَانَ تَوَّابًا ہے توبہ قبول کرنے ہارا مغفرت دالوں سے۔

تفسیر تصریح و تفسیر پارہ عم یتساءلون و تفسیر پارہ عم و تبارک

مولوی حافظ میر شجاع الدین حسین

یہ ایک ہی تفسیر کے تین مخطوطے تین مختلف ناموں سے دستیاب ہیں۔ ان ناموں کے علاوہ کا تبوں نے سرورق پر اس کا نام "تفسیر الحسنی" بھی لکھ دیا

ہے۔ یہ غالباً اس لیے کیا گیا ہے کہ عوام پارہ عم کو عموماً الحمد کا پارہ کہہ دیتے ہیں۔ لہٰذا اس کو "تفسیر الحمد" کہہ کر کا تبوں نے گویا عوام کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن مفسر نے اس کو تفسیر تقریع کے نام سے موسوم کیا ہے۔

زیرِ نظر تفسیر کے لکھنے والے مولوی حافظ میر شجاع الدین حسین ہیں۔ موصوف حیدر آباد دکن کے ایک بڑے عالم صوفی اور صاحبِ تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے اجداد اکبر بادشاہ کے زمانہ میں برِ صغیر میں وارد ہوئے تھے۔ بعد میں ان کے والد بزرگوار مولوی کریم اللہ نے برہان پور میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں شاہ ہاشم برہان پوری کی اولاد میں ایک خاتون سے شادی کر لی تھی۔ مولوی شجاع الدین حسین ان ہی خاتون سے سنہ ۱۲۰۸ ہجری مطابق ۱۷۹۵ عیسوی میں بمقام برہان پور پیدا ہوئے۔ لیکن ایک ہی سال بعد والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کی پرورش اور تربیت کا بار ان کی والدہ پر پڑ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برہان پور علم و فضل کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولوی شجاع الدین حسین صاحب کو بڑے بڑے علماء و فضلاء سے استفادۂ علمی کا موقع ملا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حج و زیارت کے فریضہ کی ادائیگی کی۔ واپس آکر حیدر آباد میں توطن اختیار کر لیا۔ چار مینار کے قریب جامع مسجد میں قیام کیا اور وہیں طلبہ کو درس دینے لگے۔ یہ زمانہ راجا چندو لال اور نواب شمس الامراء کے اقتدار کا تھا۔ یہ دونوں حضرات علم اور علماء کے قدر دان تھے لہٰذا انھوں نے مولوی شجاع الدین حسین صاحب کی کافی پذیرائی کی۔ اور مسجد کے کمرے ان کے شاگردوں کے قیام کے لیے درست کرا دیے۔

مولوی شجاع الدین صاحب، شاہ رفیع الدین قندھاری سے بیعت تھے۔ ان ہی سے خلافت ملی۔ درس و تدریس اور رشد و ہدایت کے ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی شغف تھا۔ کئی کتابیں اردو میں لکھیں۔ ان ہی میں

تفسیر تفریح بھی ہے۔ یہ پارہ عم کی اردو میں تفسیر ہے جس کا ایک مخطوطہ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن میں بھی ہے۔ اس کے سرورق پر شنگرف روشنائی سے یہ عبارت درج ہے:

"این کتاب الحمد تفسیر مولوی میر شجاع الدین صاحب بجائے خاطرِ امام الدین صاحب سید عبد اللہ کمترین نوشتہ داده شد۔"

اس کے نیچے سیاہ روشنائی اور کسی اور کے قلم سے یہ عبارت مرقوم ہے:

"این کتاب الحمد تفسیر مولوی میر شجاع الدین صاحب (مولوی) ملک سید عبد اللہ ولد سید یوسف الامیر غفر اللہ ولوالدیہ آمین۔"

ان دونوں عبارتوں میں تفسیر کا نام "کتاب الحمد" درج ہے جب کہ ترقیمہ میں اس کو تفسیر تفریح کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ترقیمہ: "بفضلہ تعالیٰ تفسیر تفریح میر شجاع الدین صاحب والا مناقب برزبان ہندی فرمودہ اند الحمد للہ والمنۃ این تفسیر الحمد و بتاریخ یازدہم ماہ صفر المظفر روز سہ شنبہ وقت پہر روز و نیک ساعت در زمانہ نواب مستطاب معلی الالقاب سپہر رکاب نواب نصیر الدولہ بہادر جاہ آصفی رئیس دکن فرخندہ بنیاد حیدرآباد باتمام رسید و خط خام کمترین سید عبد اللہ ولد سید حبیب صاحب برائے خاطر حضرت امام الدین صاحب نوشتہ داده شد۔"

ترقیمہ سے کئی باتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ اول یہ کہ کتاب کا اصل نام "تفسیر تفریح" ہے جو خود مفسر کا دیا ہوا ہے۔ کاتب نے عوام کے سمجھانے کو تفسیر الحمد کر دیا ہے۔ اس کی تکمیل ۱۱ صفر کو منگل کے دن ہوئی اور یہ عہدِ حکمرانی نواب ناصر الدولہ کا تھا۔ سنہ مذکور نہیں لیکن بابائے اردو مولوی عبد الحق نے سنہ اختتام ۱۲۴۸ھ قرار دیا ہے۔ تقویم میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱ صفر ۱۲۴۸ھ مطابق ۹

جولائی ۱۸۳۲ء کو منگل کا دن تھا۔ لہٰذا سنہ ۱۲۴۸ھ وہ سنہ ہے جو ترقیمہ
میں درج ہونا چاہیے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر کے مکمل ہونے کی
تاریخ نہیں ہے بلکہ اس کتابت کی تکمیل کی تاریخ ہے جس کا ترقیمہ ہے۔
اس قیاس کی تصدیق ایک اور مخطوطہ کے ترقیمہ سے ہوتی ہے۔ یہ مخطوطہ
کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زیر نظر تفسیر ماہ رجب
کی چاند رات سنہ ۱۲۴۷ ہجری کو مکمل ہوئی۔ اس مخطوطہ کا ترقیمہ ذیل میں درج ہے۔

ترقیمہ

"بتاریخ سلخ (چاند رات) ماہ رجب المرجب سنہ ۱۲۴۷ ہجری
تمام شد۔ بحمت تمام شد تفسیر حضرت مولانا امیر شجاع بتاریخ
ہشتم محرم الحرام سنہ ۱۲۵۷ ہجری روز چہار شنبہ یکم پاس روز
برآمدہ بود۔ تحریر یافت بخط فقیر حقیر شیخ محمد عرف کالے رحال
ساکن بلدہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد برائے خود قلمی شد۔"

تفسیر تفریح کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مفسر نے تفسیر کو زیادہ پھیلایا نہیں
تاہم زبان کافی صاف اور بامحاورہ ہے۔ انداز بیان سلجھا ہوا ہے اور مضمون
عام فہم ہے۔ سورہ نبا عم کے ابتدائی حصے کی تفسیر ذیل میں درج ہے۔
اس سے اس کی خوبی کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آشکارا لوگوں کو اسلام کی
طرف بلانے (بلانے) لگے سب کافران (کافر) تعجب سے آپس
میں پوچھنے لگے کہ نیا دین اور نیا قرآن کیا ہے؟ کسی نے کہا شعر
ہے۔ کسی نے کہا سحر ہے۔ کسی نے کہا اگلے قصے ہیں۔ حق سبحانہ تعالیٰ

اور کے حال سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خبردار کیا (کہ) عَمَّ
یَتَسَآءَلُوْنَ کس چیز سے آپس میں ایک کو ایک پوچھے
ہیں کہ کافر آپس ہی۔ حق نے ایسا فرمایا عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ
الَّذِیْ خبر بڑی ہے کہ وہ قرآن ہے۔ هُمْ فِیْهِ ایسا قرآن کہ
وہ کفار اوس میں مُخْتَلِفُوْنَ اختلاف کرتے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا
ہے اور کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ كَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ تحقیق
جلد ہی جانیں گے۔ جب قیامت آئے گی کہ پیغمبر خدا کے سچے اور
قرآن خدا کا کلام۔ ثُمَّ كَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ پھر تحقیق جلد ہی
جانیں گے کہ بُرا کیا جو ایمان نہ لائے ہم (بُرا کیا ہم نے جو ایمان
نہ لائے) اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا۔ آیا نہیں کیے (کیا)
ہم نے زمین کو بچھونا کہ سب اوس پر ٹھہریں وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا
اور پہاڑوں کو میخیں۔ جب زمین کو پیدا کیا وہ پانی پر ہلتی تھی۔
پھر پہاڑوں کو میخیں اوس پر رکھا تب زمین ٹھہری وَّخَلَقْنٰكُمْ
اَزْوَاجًا اور پیدا کیے ہم نے تمہیں جوڑے جوڑے کو تم سے
اولاد ہووے۔ یا بھانت بھانت جیسا کالے گورے اور اچھے
نیچے اچھے برے وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا اور کیے (کیا)
ہم نے نیند کو راحت کا لباس کہ سب کو اندھیاری سے ڈھانپتے
ہیں۔ (ڈھانپتی) وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا اور کیے (کیا)
ہم نے دن کو معاش کا وقت کہ اوس میں روزی پیدا کرو اور
پھرو چلو۔ کماؤ کھاؤ ......

اتنی طویل عبارت میں محض چند الفاظ ایسے ہیں جن کا استعمال آج کل کے
محاورہ کے مطابق نہیں ہے۔ ورنہ ایسی سادہ زبان کو کام میں لایا گیا ہے

ہر شخص اس کو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ نہ صرف قدیم زبان کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور نہ عربی، فارسی کے الفاظ کی بھرمار ہے۔ عبارت مختصر اور سلجھی ہوئی ہے۔ کلام کی باتیں بیان کر دی گئی ہیں۔ کسی بات کو پیچ دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ ایک دکنی نژاد شخص کی زبان ہے۔ اور اب سے پورے ایک سو چار سو سال پہلے کی اردو کا نمونہ ہے۔

تفسیر زاد الآخرت (منظوم)

قاضی عبد السلام بدایونی

"تفسیر زاد الآخرۃ" کے مصنف قاضی عبد السلام بدایونی بن عطاء الحق ہیں۔ "زاد الآخرت" اس تفسیر کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۶۳ کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ گویا یہ منظوم تفسیر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں لکھی گئی۔

مفسر موصوف قاضی عبد السلام ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۷ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم گرامی عطاء الحق تھا۔ چچا مولوی بہاء الحق، ملا عبد العلی بحر العلوم کے شاگرد تھے۔ اس نسبت سے ان کے علمی مرتبہ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قاضی عبد السلام نے ان ہی فاضل چچا سے تحصیل علم کی۔ بعدہٗ حضرت آل احمد عرف اچھے میاں مارہروی کے دست حق پرست پر بیعت کی اور خلافت پائی۔ ان کو تصنیف و تالیف سے بھی لگاؤ تھا۔ نہایت پر گو شاعر تھے۔ سلام تخلص تھا۔ ان کی کئی تصانیف منظوم ہیں۔ تفسیر قرآن بھی نظم میں لکھی۔ اس منظوم تفسیر کے اشعار کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے۔ دیگر تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہیں۔

اخبار الابرار (فارسی) میں تصوف کے موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے۔
شرح دلائل الخیرات (فارسی)، رسالہ علم الفرائض (فارسی)، طوفان عشق (فارسی)

قاضی عبد السلام کا انتقال ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں ہوا کسی شاعر نے مادہ تاریخ وفات کو اس شعر میں نظم کیا ہے![1]

گفت ہاتف گزشت از سر حال ٭ قاضی عبد السلام عباسی

۱۲۹۲-۳=۱۲۸۹ھ

قاضی عبد السلام کی دیگر تصانیف فارسی میں ہیں۔ صرف تفسیر زاد الآخرت اردو میں ہے۔ یہ تفسیر مولوی محمد محمود بخش کی تحریک اور امداد و اعانت سے لکھی گئی۔ وہ اس وقت بادشاہ تیمور کی منصفی درجہ اول پر فائز تھے۔ پھر اس تفسیر کو مطبع نولکشور نے ۱۲۸۵ھ دو جلدوں (چار حصوں) میں چھاپا۔ غالباً اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش تھی۔

تفسیر کا طریقہ یہ رکھا ہے کہ پہلے آیت لکھی پھر اس کے نیچے اشعار میں تفسیر بیان کی۔ نمونے کے طور پر ذیل میں سورہ یوسف کی چند آیتوں کی تفسیر پیش ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ

[وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان (دلیل اور حجت ـــــــ رب کی برہان سے مراد خدا کی سجھائی ہوئی دلیل ہے) نہ دیکھ لیتا]۔

اور کیا اس نے قصد یوسف کا	اور یوسف نے قصد زن کا کیا
گر تھی زن کو مخالطت کا عزم	اور یوسف موافقت کا عزم
جو نہ ہوتا کہ دیکھی اوسنی دلیل	اپنے پروردگار کی بی قلیل
پیش آتا مخالطت کے ساتھ	اسی زلیخا یہ قول التاده ہاتھ

---

1. تذکرہ علمائے ہند (اردو) مرتبہ و مترجمہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری ص ۲۹۹

تیک ہم نے دکھلایا اس کے تئیں / نور قسمت کا اسی دسعل میں
یا نبوت کا نور دکھلایا / کہ وہ محبت اسی اوس کی یاد آیا
یا بہ ابتدائی دنیا کی دکھلائے / حال ماضی وہ اس کی تئیں آئے
یا نظر آئی اوس کے تئیں جبریل / یا کہ دکھائی اوس کو اسرائیل*
یا کہ سنی گمراہی غیب کی آواز / رہ گئی اس مخالفت سے باز

لیکن جب موضوع کی نوعیت کو سامنے رکھ کر اس کا جائزہ لیا جائے تو ظفر کی اس سعی کو لاحاصل نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان کی اس کوشش کو دل کھول کر سراہنا پڑے گا۔ غالب، مومن اور ذوق اُن اصناف میں طبع آزمائی کر دیتے تھے جن کو ان کے پیشرو کافی بلندیوں پر پہنچا چکے تھے۔ قاضی عبدالسلام صاحب کا تجربہ بالکل نیا تھا۔ پھر یہ کوئی تخیلی شے نہیں تھی جس میں قوتِ متخیلہ سے کام لے کر شاعر رنگینی و رعنائی پیدا کر سکتا ہے بلکہ یہ مضامین قرآن کا معاملہ تھا جہاں ایک طرف تو سادہ حقائق بیان کرنا جن میں نہ مبالغہ آرائی کی گنجائش اور تخیل کی بلند پروازی کا کوئی دخل۔ خالق کے کلام کی تشریح و تفسیر بیان کرنا، ہر قدم پر لغزش کا خطرہ۔ شاعر کو ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ پھر اشعار کی تعداد دیکھیے، دو لاکھ! اتنے اشعار کہنا ہی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ غالب، مومن اور ذوق کو بھی اگر اس پرخار وادی سے گزرنا پڑتا تو یقین ہے کہ وہ بھی آبلہ پائی سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکتے۔ ذوق نے جن اشعار میں پند و نصائح کی ہیں ان کا نمونہ یہ ہے۔

تمام منظور ہے توفیق کے اسباب بنا / پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

---

* حضرت یعقوب کا لقب

وہ عبرت ہمیں کھلا درس ہے   ان کی دبی ہوئی وہ تالیفِ قد[1]

واضح رہے کہ جس زمانہ میں قاضی عبدالسلام صاحب نے یہ منظوم تفسیر لکھی تھی وہ غالب، مومن اور ذوق کا دور تھا۔ اردو شاعری بالخصوص غزل ادب کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ اس کیفیت کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو ادبی نقطۂ نظر سے قاضی عبدالسلام کی یہ طویل نظم پست معیار کی نظر آئے گی۔ شاعرانہ لطافت و دلکشی تو دور کی چیز ہے، زبان کے اعتبار سے بھی یہ زیادہ اچھی نہیں کہی جا سکتی۔ سچ پوچھیے تو ایک صدی پیشتر کی زبان سے بھی اس کا رتبہ بہت پست ہے۔ بعض مواقع پر الفاظ کا استعمال بھی زیادہ موزوں نہیں۔

تفسیر سورہ یوسف (منظوم)

حکیم محمد اشرف کاندھلوی

سورہ یوسف کی یہ منظوم تفسیر حکیم محمد اشرف کاندھلوی نے لکھی تھی۔ حکیم صاحب مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی کے بھتیجے اور داماد اور مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا امام الدین کے صاحبزادے تھے۔ حالات مشائخ کاندھلہ میں لکھا ہے کہ امام الدین والد اور بھائی کے سامنے عین شباب میں انتقال فرما گئے۔ رجب ۱۲۰۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنی تحریرات میں جا بجا ان کی ذکاوت، ذہانت اور علمی قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے۔ اور حضرت مفتی صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا...... حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرمایا کرتے تھے۔ میں نے عمر بھر میں مولوی امام الدین سے زیادہ

۱؎ اردو میں قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (ڈاکٹر سید حمید شطاری) صفحات ۳۸۷، ۳۸۸

ذہین اور عالی طبع نہیں پایا۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہمیشہ ان کی رسائی ذہن اور پرواز ذہن کو اس سے بلند و بالا پایا"۔ مولانا امام الدین صاحب نے ایک لڑکا مولانا حکیم محمد اشرف یادگار چھوڑا۔

"مولانا امام الدین کا سنہ پیدائش معلوم ہے اور حکیم محمد اشرف کا بھی سنہ ولادت کہیں مذکور ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ مولانا امام الدین مفتی الٰہی بخش سے چھوٹے تھے اور وہ ۱۲۰۰ھ میں عین شباب میں فوت ہوئے نیز مفتی صاحب کا سنہ پیدائش ۱۱۶۲ھ ہے لہٰذا ان سب امور سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا امام الدین ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے اور حکیم محمد اشرف جو ان کے اکلوتے صاحبزادے تھے ۱۱۹۰ھ کے بعد پیدا ہوئے ہوں گے۔

مولانا حکیم محمد اشرف نے تحصیل علم اپنے یگانۂ عصر اور عالم اجل تایا حضرت مفتی الٰہی بخش سے کی۔ وہ مفتی صاحب کے ممتاز اور مایہ ناز شاگردوں میں تھے۔ اس لیے وہ بھی معقولات پر پورا عبور رکھتے تھے۔ علم طب میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے اور نبض شناسی میں سب سے زیادہ فائق تھے۔ علم طب میں ایک ضخیم کتاب "بحر العلاج" تصنیف کی جو تمام امراض کے معالجہ پر مشتمل ہے۔ تفسیر سورہ یوسف کے علاوہ مثنوی قیمت کے مقابلہ میں ایک فارسی مثنوی بھی تصنیف کی۔ اور بھی بعض کتابیں لکھیں جو ضائع ہو گئیں۔ عمر کے آخری حصے میں قصبہ خانپور ضلع بلند شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۱۲۴۴ھ میں وفات پائی۔ ان کی شادی مفتی الٰہی بخش صاحب کی صاحبزادی بی بی [illegible] سے ہوئی تھی۔ صرف ایک صاحبزادہ مولوی حکیم محمد شریف یادگار چھوڑا جن کا انتقال ۱۳۰۹ھ میں کاندھلہ میں ہوا۔[1]

---

[1] حالات مشائخ کاندھلہ، تالیف مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی بحوالہ ملفوظات ربانی حضرت نظام الدین نئی دہلی۔ سنہ طباعت ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء۔ صفحات ۳۳ تا ۳۷۔

مولانا حکیم محمد اشرف صاحب کی شہرت تفسیر سورہ یوسف کی وجہ سے ہوئی۔ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک ہیں یہ تفسیر کافی مقبول تھی۔ شریف اور دیندار گھرانوں میں بچوں اور بچیوں کو خاص طور پر پڑھائی جاتی تھی مگر اب یہ ایک تاریخی شے بن گئی ہے اور اس کے سنہ تصنیف تک کا صحیح علم پڑھے لکھے لوگوں تک کو نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید حمید شطاری کتب خانہ سالار جنگ کے ایک نسخے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ نسخہ سنہ ۱۲۷۳ ہجری میں چھپا تھا چنانچہ ترقیمے سے اس کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

ترقیمہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہ تفسیر سورہ یوسف علیہ السلام تصنیف حکیم محمد اشرف صاحب متوطن قصبہ کا تدیلہ متصل محرم الحرام کی پندرہویں کو سنہ ۱۲۷۳ ہجری کو بلدہ سوجولٹ بندہ گر (یعنی) الگناہ محمد عبد اللہ مجید لوہری عفی اللہ عنہ کے اہتمام سے چھپ کر اختتام کو پہنچی۔[1]

اس کے بعد شطاری صاحب رقم طراز ہیں:

لیکن کتاب کے سرورق پر بخط جلی یہ لکھا ہے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہ کتاب مستطاب تفسیر سورہ یوسف در سنہ ۱۲۷۶ھ نبویہ باہتمام محمد عبد اللہ مجید لوہری عفی عنہ در جزیرہ معمورہ بمبئی حلیہ طبع پوشیدہ"[2]

ان دونوں تحریروں میں تفسیر کی طباعت کے سنہ میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس کی ایک توجیہ تو شطاری صاحب نے یہ کی ہے کہ:

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (شطاری) ص ۳۹۰

[2] ایضاً ص ۳۹۰

"۱۲۰۶ ہجری کا سنہ کتابت کی غلطی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ترقیمے میں مندرج سنہ ۱۲۶۴ ہجری صحیح ہو گا۔"[1]

لیکن ان کے نزدیک دوسری توجیہ یہ ہو سکتی ہے "ایا یہ کہ سنہ ۱۲۰۶ ہجری میں یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپی ہے اور سنہ ۱۲۶۴ ہجری میں دوسری مرتبہ۔"[2] حکیم محمد اشرف کاندھلوی مفسر کے حالات و کوائف کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو پہلی توجیہ کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اس لیے کہ سنہ ۱۲۰۶ ہجری میں خود حکیم صاحب کی عمر ۱۴/۱۵ سال سے زیادہ نہیں ہوگی اور اس وقت ان کا دورِ طالب علمی چل رہا ہوگا۔ پھر سنہ ۱۲۰۶ ہجری کی مطابقت ۹۲-۱۷۹۱ء سے ہوتی ہے اس وقت تک برصغیر میں کوئی مطبع بھی قائم نہیں ہوا تھا۔ ایسی صورت میں محمد عبد اللہ مجید لودی عفی عنہ نے اس تفسیر کی طباعت کا انتظام کہاں کیا ہوگا۔

ڈاکٹر سالم قدوائی صاحب کا یہ کہنا بھی درست نہیں معلوم ہوتا کہ:

"ترقیمے کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سنہ ترجمہ بھی ۱۲۶۴ ہجری ہے۔"[3]

اوّل تو ترقیمے کی عبارت میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ سنہ ترجمہ ۱۲۶۴ ہجری ہے۔ پھر جب مفسر کا انتقال سنہ ۱۲۴۲ ہجری میں ہو چکا تھا تو ترجمہ ۱۲۶۴ ہجری کا کیسے ہوا ہو گا۔

ان توضیحات کے بعد بابائے اردو کا یہ قیاس مع الفارق معلوم ہوتا ہے کہ سنہ تفسیر ۱۲۶۸ ہجری ہے۔

غرض اس حقیقت کی روشنی میں کہ مفسر علام حکیم محمد اشرف کاندھلوی

---

1. قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (اشاریہ) ص ۲۹۱
2. ایضاً ص ۲۹۱
3. ایضاً ص ۲۹۱

کا انتقال ۱۲۴۷ھ مطابق ۳۲-۱۸۳۱ء میں ہوا۔ یہ نتیجہ نکالنا غلط
نہ ہوگا کہ تفسیر سورہ یوسف تیرھویں صدی ہجری کے نصف اول یا انیسویں
صدی عیسوی کے پہلے ربع میں ہوئی۔ ڈاکٹر سید حمید شطاری نے زبان کی روانی
اور صحت کی طرف جو ایک بار کا اشارہ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ واقعی
زبان و تحریر کے لحاظ سے تفسیر میں نثر کی زبان بہت صاف، رواں اور سلجھی
ہوئی ہے۔ اس دور کے ولی اللٰہی سلسلے کے اور علماء کی زبان بھی اتنی صاف
اور شگفتہ ہے کہ اس پر موجودہ دور کی زبان ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔
نواب صدیق حسن خاں کے والد اولاد حسن قنوجی کے دو تین رسالے تھوڑے
تھوڑے جو اردو میں لکھے گئے تھے۔ ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ
ان کی زبان ڈیڑھ سو سال سے زیادہ پرانی ہے۔

تفسیر سورۂ یوسف کو ترتیب دینے میں مفسر نے جو طریقہ اختیار کیا
ہے اس کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے فرمایا ہے:

"طریقہ یہ رکھا ہے کہ عنوان میں قرآن کی آیت ہے اور نیچے اس کا
اردو ترجمہ نثر میں۔ اس کے بعد نظم میں اس کی تفسیر"

مثلاً آیت وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ
الذِّئْبُ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ کے

نیچے نثر میں ترجمہ:
اور چھوڑا یوسف کو اپنے اسباب پاس پھر اوس کو کھا گیا بھیڑیا۔
اور تو باور نہ کرے گا ہمارا کہنا اگرچہ ہم سچے ہوں۔"[1]

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر (انتقادی) ص ۳۵۱

آیت مندرجہ بالا کی منظوم تفسیر

بٹھا ہم نے یوسف کو کپڑوں کے پاس
گئے دوڑ نے سب کے سب بے حواس

کہ اتنے میں بھیڑیا آ کے کھا گیا
یقیں ہوگا تجھ کو کب اس بات کا

اگرچہ ہم ایسے ہیں راست گو
ولے اس کو کب راست جانے ہے تو

یہ آیت کے معنے ہوئے ہیں بیان
اب آگے سنو اس کی ہے داستاں

سنا جب کہ یعقوب نے یہ کلام
ہوا کام گویا کہ اس کا تمام

گرا کھا کے غش اور گیا دل دھڑک
غشی میں رہا صبح سے شام تک

لگا رونے اولاد اس کی تمام
کہا اس نے بے جا ہوا ہم سے کام

کیا قتل بھائی کو اور باپ کو
گنہگار ہم نے کیا آپ کو

قیامت کو کیا دیں گے اس کا جواب
خدا اب کہ لیوے گا ہم سے حساب

یہ کہہ کر کے روتے تھے چھوٹے بڑے
اور آگے تھے یعقوب ان کے پڑے

جو دیتے تھے جنبش نہ ہلتے تھے وہ
کسی طرح سے نہ سنبھلتے تھے وہ

کہا بعض نے ایک بارہ ہے گم
ہوا اس کا بیٹا یہ دیکھو جو تم

عجب اس کی حالت ہے مرتا ہے یہ
نہ بولے ہے نے سانس بھرتا ہے یہ

وہ جس کی فقط ایک اولاد ہو
وہ مر جائے تو پھر کیوں نہ برباد ہو

تفسیر القرآن

سر سید احمد خاں

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں سات سمندر پار سے آئی ہوئی انگریز قوم کی فتح اور مجاہدین کی شکست کے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ اس کے اثرات برصغیر میں بسنے والی ہر قوم پر پڑے۔ مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی تہذیب، ثقافت، معاشرت اور معیشت اور ان کے علوم و فنون سب پر مغرب کے اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں تک کہ قرآن کریم کی تفسیر بھی ان اثرات کی زد سے نہ بچ سکی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں سر سید نے قرآن کی جو تفسیر لکھی وہ بڑی حد تک اس رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ سر سید کو ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اس کو سمجھنے کیلیے ان کے حالاتِ زندگی جاننا بہت ضروری ہے۔ اسے اس پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت یوں بھی ہے کہ عیسائی مشنری اسلام اور مسلمانوں پر علی الاعلان حملے کر رہے تھے اور ان کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور قرآن و حدیث کے معاندین کی تلبیس کر رہے تھے۔

سر سید دہلی کے ایک ذی وجاہت سید خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے گھر کا ماحول دینی اور رہن سہن مشرقی انداز کا تھا۔ اس دور کے علماء اور مشائخ سے خاص عقیدت تھی۔ سر سید جو ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے تھے، وہ مرزا جان جاناں مظہر کے خلیفہ حضرت شاہ غلام علی کا ذکر نہایت عقیدت و احترام سے کرتے ہیں اور اپنے خاندان کے شاہ صاحب سے تعلقات کا ذکر بڑے والہانہ انداز سے کرتے ہیں۔ سر سید کی تعلیم بھی مشرقی انداز پر ہوئی تھی۔ انھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی اور مولانا مملوک العلی نانوتوی کے سامنے

زانوئے شاگردی تہ کیا ـــــــ چنانچہ وہ اپنے استاد کے علم وفضل کے بیحد مداح ومعترف تھے۔ چونکہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے بھی وہی استاد تھے اس لیے یہ بات غلط نہیں کہ دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے بعض وجوہ سے سرسید تعلیم مکمل نہ کر سکے لیکن چونکہ غیر معمولی طور پر ذہین و ذکی الطبع تھے اس لیے نجی طور پر انھوں نے اپنی علمیت میں بے حد اضافہ کر لیا اور تھوڑی ہی عمر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو گئے۔ اس وقت بھی دو باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ انھوں نے اپنی معاشرت بدلی اور نہ مطالعۂ کتب کو ترک کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے تحقیق اور تصنیف و تالیف کے کاموں کو بھی جاری رکھا۔ ان کا تحقیقی شاہکار "آثار الصنادید" اسی دور کی تخلیق ہے۔ اس کتاب میں دہلی کے آثارِ قدیمہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے سرسید نے جو کاوش کی ہے وہ ان کا بہت بڑا اور اہم کارنامہ ہے۔ مشاہیر کے حالات معلوم کرنے میں بھی انھوں نے نہایت تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں بڑی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ اس کتاب میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ کافی مسجع و مقفیٰ ہے۔ غرض ۱۸۵۷ء سے پہلے انھوں نے یہ کام مشرقی انداز میں کیا ہے۔ سرسید احمد خاں اور مولانا قاسم نانوتوی ایک ہی سرچشمۂ فکر سے فیضیاب تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کا سبب سے اہم نتائج اور تم انگریز بہادر نہ تھا کہ سپاہی کی تلوار نہیں ٹوٹی تھی بلکہ اس کا جذبۂ حریت فنا ہو گیا تھا اور اس کی سرفروشی کی تمناؤں کا قافلہ لٹ گیا تھا۔ ایک بہت بڑا سانحہ یہ تھا کہ ولی اللہی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک گروہ حق کے اس جادۂ قویمہ پر استوار رہا جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حکمت بالغہ نے متعین کیا تھا۔ اس گروہ کے رہنما مولانا قاسم نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند تھے

دوسرا گروہ سرسید احمد خاں کا تھا جنھوں نے برٹش استعمار اور ہندوؤں کی دشمنی میں پسے ہوئے مسلمانوں کو بچانے کے لیے حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمانوں کی اس حالتِ زار کے اصل اسباب تلاش کرنے اور ان کے حل پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ سرسید احمد خاں اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب مسلمان حکومت سے ٹکر لے کر اور جدید علوم و فنون سے کنارہ کشی کر کے اپنا قومی وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ اس ارادہ کو پالینے کے بعد عملی اقدام کرنے کا فیصلہ کیا کہ سیاسی میدان میں انگریز حکومت سے مفاہمت کی پالیسی اختیار کی جائے۔

انگریزی حکومت نے فتح حاصل کر کے سرسید کو تو خوب نوازا۔ ان کو خلعت عطا کیا، وظیفہ دیا اور بعد میں سر کے خطاب سے نوازا۔ لیکن مسلمانوں کا وہ قتل عام کیا کہ چنگیز خاں اور ہلاکو کے واقعات کو گرد کر دیا۔ ماشاء اللہ متمدن اور مہذب قوم تھی۔ قتل کے وہ وہ طریقے اختیار کیے جو ہلاکو اور چنگیز خاں کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھے۔ وہ غیر مہذب تو تلوار سے ایک ایک کر کے قتل کرتے تھے۔ انھوں نے جمنا کی ریتی پر مسلمانوں اور بے گناہوں کو کھڑا کر کے ایک بار ہی میں سو سو اور دو دو سو کو ختم کر دیا۔ وہ دقیانوسی لوگ تو مقتولوں کے سروں کے مینار بناتے تھے۔ ان روشن خیال حضرات نے پوری پوری لاشوں کو درختوں کی شاخوں پر لٹکا کر زاغ و زغن کے لیے ضیافت کا سامان کیا۔ مہینوں اور مہینوں یہ سلسلہ چلا۔

سرسید نے ایک طرف یہ لرزہ خیز مناظر دیکھے، دوسری طرف وہ قوم کی جانب سے طنز و تعریض کا ہدف بنے۔ ان دونوں باتوں سے بددل ہو کر انھوں نے ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ انگریزی حکومت اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی چکی تھی۔ اس لیے سرسید کو ہجرت سے باز رکھنے کے لیے ان کے کتابچے "اسبابِ بغاوتِ ہند" پر عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد مسلمان قوم کو معاشی طور پر تباہ کرنا

شروع کر دیا۔ جب اس پر احتجاج ہوا تو سرسید کو مشورہ دیا گیا کہ وہ مسلمانوں
کو مغربی علوم سیکھنے کی طرف راغب کریں۔ اس کے لیے ان کو انگلستان لے جا کر
آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں دکھائیں اور مشورہ دیا کہ مسلمانوں کے لیے
اسی قسم کا کالج قائم کریں۔ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ مسلمانوں کے علوم دقیانوسی
ہو گئے ہیں اور موجودہ ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتے لہٰذا ان میں بھی مغربی
افکار و خیالات کی رنگ آمیزی کی جائے۔

انگریز کی ہدایت کے مطابق انگلستان سے واپس آکر ۱۸۷۵ء میں
سرسید نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم (ایم۔ اے۔ او کالج) کی بنیاد رکھی
اور اس میں وہی نصاب تعلیم مقرر کیے جو مغربی جامعات میں ہوتا ہے جس کی
وجہ سے دوسری قوموں کی درس گاہوں سے ہٹ کر اس میں کوئی انفرادیت
قائم نہ ہو سکی۔ پھر اس مرکز علمی کا سربراہ انگریزی حکومت کا تسلط کردہ
کوئی انگریز ہوتا تھا اور عملاً اس کے افکار و خیالات پر وہاں کا نظام مبنی
تھا۔ لوگ اس نظام کو سرسید کا نتیجۂ فکر سمجھ کر اس میں تبدیلی کا مشورہ
دیتے تھے۔ مگر وہ مجبور تھے۔ اس لیے کہ ان کے اختیارات بہت محدود تھے۔
نتیجہ یہ ہوا کہ خود سرسید کے خاص رفقاء کا ان سے اختلاف ہو گیا اور شبلی
کی مخالفت تو اس حد تک بڑھی کہ وہ قطع تعلق کر کے چلے گئے۔

سرسید کے دورۂ انگلستان کا اثر خود ان کے اپنے افکار و خیالات
پر بھی ہوا اور وہاں کی مادی ترقی سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ اسلام
کے بعض بنیادی عقائد کو بھی مادیت کی عینک سے دیکھنے لگے لیکن اس معاملہ
میں ان کے بعض قریبی ساتھیوں کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ پروفیسر رشید احمد
صدیقی نے علی گڑھ میگزین کے اکبر الہ آبادی نمبر میں "اکبر۔ ایک نظر" کے
عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے اس حقیقت کو ان الفاظ

میں بیان کیا تھا۔

"سرسید جس طرح اور جس حد تک مغربیت سے متاثر تھے
اس سے نہ حالی کو اتفاق تھا نہ شبلی کو نہ نذیر احمد کو۔ یہ عجیب
اتفاق ہے کہ یہ تینوں مولوی تھے۔ لیکن پچاس سال بعد معلوم یہی
ہوا کہ جہاں تک مغربیت سے احتیاط برتنے کا سوال تھا سرسید
اور امیر علی دونوں سے یہ طبقہ زیادہ صاحبِ نظر نکلا۔"

سرسید کے ان خیالات کا اظہار ان کی تفسیر میں ہونا ضروری تھا۔ وہ ہوا
ان کے سب سے زیادہ مداح و معتقد ساتھی حالی تک کو بھی اس تفسیر کے
بارے میں یہ کہنا پڑا :

"سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض مقامات
پر ان سے رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔"

تفسیر خواہ کسی درجہ کی ہو لیکن یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ سرسید حق اور انصاف
کے دامن کو کسی طرح ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے اور خود کو انسان ضعیف البیان
قرار دے کر اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کر لیتے تھے۔ انھوں نے لاہور میں
اسلام پر ایک لیکچر دیا تھا اس کے درج ذیل حصے کو حالی نے "سرسید کی مذہبی
خدمات" کے زیرِ عنوان مقالے میں نقل کیا ہے۔ سرسید نے فرمایا:

"میں معصوم نہیں ہوں اور نہ معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں
ایک جاہل آدمی ہوں۔ اسلام کی محبت سے میں نے یہ کام کیا
ہے جس کے میں لائق نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو
مگر آئندہ علماء اس کی صحت کر دیں گے اور اسلام کو مدد دیں گے۔
میرے خیال میں حتی الغیر اللہ مشکلین فی اسلام کے مقابلے میں اسلام کی تائید
اسی طریقہ پر ہو سکتی ہے اور کسی طریقہ پر نہیں ہو سکتی۔"

اس عبارت سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہر کام میں سر سید کا جذبہ دینی ہوتا تھا۔ یقیناً تفسیر القرآن کے لکھنے میں بھی یہی جذبہ اور یہی نیت کارفرما رہی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی سہو ہوا ہے تو اس کو "اَلْاِنْسَانُ مُرَكَّبٌ مِنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْيَانِ" کے اصول کے تحت نظر انداز کیا جانا چاہیے۔ تفسیر لکھنے میں سر سید نے مغربی مذہبی حلقوں کی طرح عقل، نیچر اور تجربہ و مشاہدہ پر بہت زور دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی مغربیت کا اثر ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ دوسرا سبب قدیم مفسرین کی عجائب پرستی اور اسرائیلیات پر ضرورت سے زیادہ انحصار کے خلاف ردِ عمل معلوم ہوتا ہے۔

"تفسیر القرآن میں پورے قرآن کی تفسیر نہیں ہے بلکہ سورہ انبیا تک کی تفسیر ہو سکی ہے۔ اس کے باوجود چھ جلدیں سر سید کی زندگی میں چھپ چکی تھیں، ساتویں لکھی جا چکی تھی مگر چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ۱۸۹۸ء میں سر سید نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور تفسیر نامکمل رہ گئی۔ پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی تھی[1] جس سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہیں کہ اس کام کے لیے سر سیدؒ نے حیاتِ مستعار کے پورے اٹھارہ سال صرف کیے۔ اور یہ کام ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر محض اسلام کی محبت میں کیا گیا۔

نمونہ کے لیے سورہ فاتحہ کا ترجمہ اور تفسیر ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(ترجمہ) خدا کے نام سے جو بڑا رحم والا ہے، بڑا مہربان ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ...... غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ؕ

---

۱ تفسیر القرآن از سر سیدؒ، مطبوعہ مفید عام پریس، آگرہ۔

(ترجمہ) سب بڑائیاں خدا ہی کے لیے ہیں جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے (۱)
بڑا مہربان اور بڑا رحم والا (۲) حاکم ہے انصاف کے دن کا (۳) تیری
ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے ہم مدد چاہتے ہیں (۴) ہم کو سیدھی
راہ پر چلا (۵) ان لوگوں کی راہ پر جن پر تو نے بخشش کی ہے (۶) نہ
ان کی راہ پر جن پر تیرا غصہ ہوا ہے اور نہ بہکنے والوں کی راہ پر۔

(تفسیر) اس سورہ میں کچھ تو خدا کی تعریف ہے اور کچھ دعا۔ پس گویا بندوں کی زبان
سے کہی گئی ہے۔ اور بلاشبہ بندوں کو خدا نے اس طرح التجا کرنی بتایا ہے۔

"دعا جب خلوص دل سے کی جاتی ہے ہمیشہ مستجاب ہوتی ہے مگر لوگ دعا کے
مقصد اور استجابت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جس
مطلب کے لیے ہم دعا کرتے ہیں، دعا کرنے سے وہ مطلب حاصل ہو جائے گا
اور استجابت کے معنی اس مطلب کا حاصل ہونا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلطی ہے
حصول مطلب کے جو اسباب خدا نے مقرر کیے ہیں وہ مطلب تو انہی اسباب کے
جمع ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر دعا نہ اس مطلب کے اسباب میں سے ہے
اور نہ اس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے بلکہ وہ اس قوت کو تحریک
کرنے والی ہے جس سے رنج و مصیبت اور اضطرار میں جو مطلب نہ حاصل
ہونے سے ہوتا ہے تسکین دیتی ہے۔ اور ٹھیک دعا دل سے اور اپنے تمام فطری
قویٰ کو متوجہ کر کے کی جاتی ہے اور خدا کی عظمت اور اس کی بے انتہا قدرت
کا خیال اپنے دل میں جمایا جاتا ہے تو وہ قوت تحریک میں آتی ہے۔ انسان
تمام قوتوں پر جن سے اضطرار پیدا ہوا ہے اور اس مصیبت کا رنج برانگیختہ
ہوا ہے۔ ان سب پر غالب ہو جاتی ہے۔ اور صبر و استقلال پیدا ہو جاتا ہے
اور اسی کیفیت کا دل میں پیدا ہو جانا مستجاب ہونا ہے۔"

"اسی امر کا اشارہ آنحضرت صلعم نے ان لفظوں میں فرمایا ہے کہ الدعاء

مُخُّ الْعِبَادَةِ" یعنی دعا اصل عبادت ہے۔ اور اس سے بھی واضح کر کے فرمایا کہ "اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ" یعنی دعا عبادت ہی ہے۔ پھر فرمایا کہ تمہارا پروردگار کہتا ہے کہ "اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ" یعنی مجھ کو پکارو یا میری عبادت کرو۔ میں تمہارے لیے اس عبادت کو قبول کروں گا (مشکوٰۃ)

"پس دعا سے مطلب کا حاصل ہونا موعود نہیں بلکہ عبادت کا جو نتیجہ ہے وہ موعود ہے دعا کے ساتھ۔ کبھی مطلب حاصل ہو جانا اتفاقیہ بات ہے جو اسکے اسباب جمع ہونے سے حاصل ہو جاتا ہے۔"

تفسیر فتح المنان

معروف بہ تفسیر حقانی

مولوی ابو محمد عبد الحق دہلوی

یہ اردو زبان میں قرآن مجید کی ایک مشہور تفسیر ہے اور مستند تفسیروں میں اس کا شمار ہے۔ مفسر مولوی ابو محمد عبد الحق دہلوی ہیں۔

مولانا عبد الحق حقانی بھی ڈپٹی نذیر احمد کی طرح دہلوی مشہور ہو گئے ورنہ بقول قاری فیوض الرحمٰن "ان کا اصل وطن گنگیلا ضلع انبالہ (مشرقی پنجاب) تھا۔ وہیں وہ ۲۷ رجب ۱۲۶۷ھ (۲۸ مئی ۱۸۵۱ء) کو پیدا ہوئے[1] انھوں نے خود اپنا شجرۂ نسب یہ لکھا ہے۔

"ابو محمد عبد الحق بن محمد امیر بن شمس الدین بن نور الدین ابن خواجہ جعفر بن خواجہ سلیم بن مظفر الدین احمد بن شاہ محمد حبیب ترمذی[2]"

درس نظامی کی بلند پایہ کتابیں مولانا لطف اللہ بن اسد اللہ علی گڑھی سے پڑھیں۔

---

[1] قاری فیوض الرحمٰن "مشاہیر علماء"۔ لاہور ۱۹۷۶ء ص ۲۵۷

[2] تفسیر فتح المنان المشہور بہ تفسیر حقانی ج ۱۔۲ مکتبہ الحسن، لاہور ص ۱۲۸

حدیث مولانا عالم علی نگینوی سے پڑھی تھی۔[1] مولانا حکیم سید عبد الحیٔ نزہۃ الخواطر
میں لکھتے ہیں کہ "ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی۔ پھر کانپور پہنچے اور مولانا
عبد الحق بن غلام رسول حسینی سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر مراد آباد جاکر
صحاح ستہ میں سے کچھ کتابیں مولانا عالم علی نگینوی سے پڑھیں۔ پھر دہلی جاکر
مولانا سید نذیر حسین محدث سے استفادہ کیا۔[2]

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدرسہ فتحپوری دہلی میں تدریس پر مامور
ہوئے اور کافی مدت تک درس وافادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہیں سکونت
اختیار کرلی۔ اور وہیں شادی بھی ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلوی مشہور ہوگئے۔
کافی عرصہ بعد تدریس کو ترک کرکے تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگئے۔ حیدرآباد
دکن سے بغیر خدمت کے وظیفہ مل گیا۔ آخری عمر میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ۵۰۰
روپے ماہوار تنخواہ پر تقرر ہوگیا۔ لہٰذا بسلسلہ ملازمت کلکتہ چلے گئے۔ انگریزی
حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ
(۲۳ جون ۱۹۰۷ء) کو رہگرائے عالم بقا ہوئے۔

مولانا حکیم سید عبد الحیٔ تحریر فرماتے ہیں "بحث ومباحثہ میں قوی تھے۔
طلاقت اور حلاوت پائی جاتی تھی۔ خوش مزاج تھے۔ کتابیں تصنیف کیں جن سے
ہند میں ان کی شہرت پھیل گئی۔" ان کی تصانیف میں اصول فقہ کی کتاب حسامی
کی تلخیص "نامی"۔ عقائد الاسلام اصول دین میں (اردو) البیان فی علوم القرآن
(اردو) فتح المنان فی تفسیر القرآن (اردو) کئی بڑی اور ضخیم جلدوں میں جو تفسیر
حقانی کے نام سے مشہور ہے۔[3]

---

[1] تفاسیر قرآن۔ تالیف ڈاکٹر حافظ قاری فیوض الرحمٰن۔ مکتبہ مدنیہ ۱۷۔ اردو بازار لاہور
ص ۲۲۶۔ [2] نزہۃ الخواطر حیدرآباد دکن ۱۹۷۰ء جلد ۸ ص ۲۳۴
[3] ایضاً، ص ۲۳۲

تفسیر فتح المنان جو تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے مولانا عبد الحق حقانی کی سب سے اہم تصنیف ہے اور اسی کی بنا پر آپ کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں تین باب ہیں جن کو مختلف اعتبارات سے کئی کئی فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً باب اول میں پہلی فصل الوہیت، وحدانیت اور نبوت و رسالت الٰہیہ سے متعلق ہے۔ دوسری فصل معجزات کے بیان میں ہے اور تیسری فصل میں ملائکہ کا بیان ہے۔ باب دوم میں آٹھ فصلیں ہیں اور باب سوم میں پانچ فصلیں ہیں۔ اور اس پوری بحث کو جو ان تینوں ابواب میں کی گئی ہے مقدمہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگرچہ ہر باب دلائل و براہین کی روشنی میں کی گئی ہے اور روایت و درایت دونوں سے کام لیا گیا ہے لیکن افراط و تفریط سے پرہیز کیا گیا ہے اور دوسروں کو بھی ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ مقدمہ ختم کرنے سے پہلے فرماتے ہیں "الغرض افراط و تفریط دونوں بُری ہیں۔ پس جس تفسیر میں روایت اور درایت دونوں عمدہ اور صحیح ہیں وہ تفسیر بھی عمدہ اور صحیح ہے۔ اور جس میں ان دونوں میں قصور ہے اسی قدر اس کی کتاب میں قصور ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں "تفاسیر صدہا ہیں۔ اگر ان کے نام لکھوں تو ایک دفتر بھی بس نہ کرے۔ چنانچہ کشف الظنون میں بے شمار نام درج ہیں مگر میں یہاں چند تفاسیر کو بیان کرتا ہوں۔"

اس کے بعد تفسیر ابن جریر طبری سے شروع کر کے سر سید احمد کی تفسیر القرآن تک اکتالیس نہایت اہم اور مشہور تفاسیر کے نام اور مختصر لفظوں میں ان کی خصوصیات بیان کر دی ہیں۔ چونکہ سر سید نے اپنی تفسیر میں عقلیت پسندی میں حد سے زیادہ انہماک کیا تھا اس لیے مقدمہ میں ان کا تعاقب کیا ہے اور ان کی انتہا پسندی کی مخالفت کی ہے۔ ساتھ ہی ان مفسرین پر بھی تنقید کی ہے جو روایات کے دائرے سے نکلنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ دونوں کو اعتدال کا راستہ

کرنے کی ترغیب دی ہے۔

دوسری جلد کا آغاز خطبہ سے ہوا ہے جس میں حمد و صلوٰۃ کے بعد تفسیر کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ خطبہ کسی قدر طویل ہے لیکن اس میں مفسّر نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ عہدِ صحابہ کے بعد سے ہی مسلمانوں نے علومِ قرآنی کو مدوّن کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں جتنا کچھ لکھا حضرت آدمؑ کے زمانہ سے کسی قوم نے بھی اپنی الہامی کتاب یا اس کا دسواں حصہ بھی نہیں لکھا تھا۔ یہ اسی غیر معمولی انہماک اور توجہ کا نتیجہ ہے کہ قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے بچا ہوا ہے۔

مفسّر نے بیان کیا ہے کہ علومِ قرآنی کی نشر و اشاعت کا اثر یہ ہوا کہ چہار دانگ عالم کا نور پھیل گیا۔ ہندوستان میں بھی صدیوں تک دین اور علومِ دین کا چرچا رہا۔ یہاں تک کہ سات سمندر پار سے فرنگی اس سرزمین میں وارد ہوئے تو وہ اپنے ساتھ الحاد اور گمراہی کے سامان بھی لائے۔ مسلمانوں کے باہمی تفرقہ سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے ان میں بھی بگاڑ پیدا کر دیا اور ایک ایسے گروہ نے ان میں جنم لیا جو برائے نام مسلمان ہے ورنہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے روگردانی اختیار کیے ہے ــــ یہ گروہ دوسروں پر بھی اپنا اثر ڈال کر ان کو خراب کر رہا ہے۔ اس لیے مفسّر موصوف نے ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کی اردو میں تفصیلی تفسیر لکھیں تاکہ مسلمان قوم دین کے اصولوں کو سمجھے اور اپنے دین کی طرف مائل ہو۔[1]

تیسری جلد سے مفسّر نے تفسیر کا آغاز کیا اور مضامین قرآن کو ہر اعتبار سے سمجھانے کی کوشش کی چنانچہ جس انداز سے اور جتنی شرح و بسط سے یہ تفسیر لکھی گئی ہے اس سے پہلے اردو میں اس نمونے کی کوئی تفسیر نہیں ملتی۔ اس میں ترکیب نحوی و [illegible]

۱۔ تفسیر حقانی جلد دوم ص ۲ تا ۴

آیات، حل لغات و بیانِ نکات، اظہارِ مقاصد، مراد و شانِ نزول بھی صحیح بیان کی گئی ہیں۔ نیز مخالفین دینِ اسلام کے الزامات اور دہریہ اور نیچریوں کے اعتراضات کے معقول جوابات دیے گئے ہیں۔[1]

تفسیر دراصل دوسری جلد سے شروع ہو کر آٹھویں جلد تک چلتی ہے اور اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس آٹھویں اور آخری جلد میں پارہ ۳۰ عم کی تفسیر ہے۔

تفسیر حقانی کی طباعت ۱۳۰۵ھ سے شروع ہو کر ۱۳۱۸ھ میں ختم ہوئی۔ پہلی جلد ۱۳۰۵ھ میں مطبع حامی الاسلام دہلی محلہ بلی ماران میں چھپی۔ دوسری جلد کی طباعت دہلی میں ۱۳۰۶ھ میں ہوئی۔ تیسری سے لے کر ساتویں جلد تک ۱۳۱۲ھ تک چھپیں۔ اور آٹھویں جلد کی طباعت ۱۳۱۸ ہجری میں ہوئی۔

چونکہ تفسیر حقانی میں سابقہ مفسرین کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور افراط و تفریط سے بچنے کو ایک مستحسن فعل قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے شدت پسند حضرات اس روش کو برداشت نہیں کر سکے اور انھوں نے اس تفسیر پر کئی اعتراضات کیے۔ لیکن غیر جانبدار ہو کر دیکھا جائے تو ان اعتراضات میں کوئی وزن محسوس نہیں ہوگا۔ اعتراض تو ہر چیز پر کیا جا سکتا ہے لیکن اس اعتراض کی کوئی مضبوط بنیاد ہونی چاہیے۔ اور دلائل و براہین سے اس میں تردید کیا جانا چاہیے۔ اس اعتبار سے جب ہم ان اعتراضات کو جانچتے ہیں تو وہ قطعاً بے بنیاد اور کمزور دکھائی دیتے ہیں۔ بعض معترضین نے جھوٹا بہتان لگا کر مفسر علام کی ذات پر بھی رکیک حملے کیے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے "بطلان الاعلان" میں لکھا ہے۔

"مفسر تفسیر حقانی جو عبد الحق اور اس کے بعد ابو محمد عبد الحق بنا ہے دراصل مسمی ننھو ولد گولا اہیر نو مسلم۔ باشندہ گنھل ساکس پیشہ۔"

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر ص ۲۴۵

قوم را نمونہ ہے ۱

ایک جملہ سے اعتراضات کی حقیقت و اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بہر حال ان باتوں سے صرفِ نظر کر کے دیکھا جائے تو دورِ حاضر کی تفاسیر میں "تفسیر حقانی" سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد اردو زبان میں جتنی تفسیریں لکھی گئیں ان سب کو اسی سے روشنی ملی۔ اور اگرچہ ہر مفسر نے اپنا مخصوص نقطۂ نظر سامنے رکھا ہے لیکن اصول و ضوابط میں سب نے اس کی پیروی کی ہے۔ تفسیر حقانی کی اس اولیت و فضیلت کو اکثر علماء نے تسلیم کیا ہے اور کئی حضرات نے اس کی تعریف کی ہے۔ چند تبصرے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سعید حمید شطاری تحریر فرماتے ہیں۔

"مولوی عبدالحق نے ترجمہ و تفسیر دونوں میں بڑی دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی زبان بہت شستہ و رفتہ ہے اور بہت بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب بیان میں جگہ جگہ واعظیت کی جھلک بھی آگئی ہے۔ اس سے ادبیت تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن علمی عبارت میں جس حزم و احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادبی اسلوب سے دقت و لذتِ اظہار کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسلوب کی اس خامی کوتاہی کے باوجود مفسر کی قدرتِ بیان قابلِ تعریف ہے۔ اس علمی کارنامے کا تعلق اس زمانے سے ہے جبکہ سرسید کے ہاتھوں جدید اردو نثر کا آغاز ہوا تھا۔ خود سرسید نے بھی تفسیر قلمبند کی ہے لیکن ان دونوں تفاسیر کے تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ انداز و اسلوب سرسید کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ سرسید خود صاحبِ طرز نثر نگار تھے اور جدید اردو

نشر کا آغاز ان ہی کی مرہون منت ہے"[1]

دائرہ معارف اسلامیہ میں ہے

"تفسیر حقانی نے بڑی شہرت پائی۔ تفسیر حقانی ترجمہ آیات، بیان شان نزول، ترکیب نحوی، تفسیر، تفصیل و حواشی پر مشتمل ہے۔ مسائل تصوف۔ واعظانہ انداز اور مناظرانہ اسلوب کی وجہ سے کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے" (دائرہ معارف اسلامیہ ج ۳ ص ۵۳۵)

مولانا سید معروف شیرازی لکھتے ہیں۔

"اس کے علاوہ اس تفسیر میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو عام تفسیر میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا شمار اردو کی درجہ اول کی تفاسیر میں ہوتا ہے" (قرآن نمبر ص ۳۰۱)۔

مولانا شاہ محمد سراج الیقین لکھتے ہیں۔

"جناب مولانا عبدالحق دہلوی۔ آپ اکابر و مشاہیر علماء میں ہیں۔ غیر مذاہب سے مناظرہ میں آپ کو بہت ہی کمال حاصل ہے۔ تفسیر فتح المنان المشہور بہ تفسیر حقانی آپ ہی کی تصنیف ہے۔ نہایت جامع اور عمدہ تفسیر ہے۔ بڑی صراحت اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھا ہے۔ اور خوب ہی تحقیق و تدقیق کی ہے اور سید احمد خاں نے قرآن مجید کے معانی اور مطالب میں جو تحریف اور غلطیاں کی ہیں ان کا خوب ہی محققانہ جواب دیا ہے۔ اس تفسیر کے مطالعہ سے حظ تام حاصل ہوتا ہے۔ خداوند تعالیٰ مولانا ممدوح کو اس کی جزائے خیر دارین میں مرحمت فرمائے"

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر صفحات ۱۸۱ و ۴۹۳

(مولانا شاہ محمد سراج الیقین "شمس العارفین" لاہور ص ۱۸۷)۔[1]

"تفسیر حقانی" کے انداز اور اسلوب بیان کو جاننے کے لیے سورہ فاتحہ کی پہلی تین آیتوں کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو کل جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے جو نہایت رحم کرنے والا ہے۔ جزا کے دن کا مالک ہے۔

ترکیب

اَلْحَمْدُ مبتدا لِلّٰهِ ثابت کے متعلق ہو کر اس کی خبر ہوئی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس کی صفت اول (گو یہ نکرہ ہے مگر معنی کے لحاظ سے معرفہ ہے کیونکہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ سوائے خدا کے اور کسی پر صادق نہیں آتا)۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ صفات و موصوف اس کی صفت دوم مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ مضاف و مضاف الیہ مل کر اس کی صفت سوم۔ یہ موصوف اپنی تینوں صفات سے مل کر ثابت کے متعلق ہو کر مبتداء کی خبر ہوئی اور خبر و مبتدا مل کر جملہ اسمیہ ہوا۔ گو مقام انشاء حمد جملہ فعلیہ چاہتا ہے۔ مگر چونکہ خبر حمد بھی انشاء حمد ہے۔ دوام و ثبات کے لیے جملہ اسمیہ لایا گیا۔

تفسیر

ان تینوں آیتوں میں خدائے تعالیٰ بہت سی حکمتیں رعایت رکھ کر اس تقریب کو جتلاتا ہے کہ جس کی طرف بِسْمِ اللّٰهِ میں اشارہ تھا۔ بِسْمِ اللّٰهِ میں لفظ اللہ سے ہیبت اور رحمٰن و رحیم سے رغبت دلا کر اپنی ذات پاک کی طرف

---

[1] تعارف قرآن صفحات ۲۲۵ تا ۲۲۷

متوجہ ہونا بھلا دیتا یا چھڑاتا۔ لیکن اس اصول اور تقرب کا کوئی طریقہ صراحتاً مذکور
نہ ہوا تھا کہ وہ کیونکر اس کی طرف متوجہ ہو اور کون سی روحانی سڑک پر چل کر
شہرِ مقصود تک پہنچے۔ آیا کسی درخت پر اُلٹا لٹکے یا دنیا کے تمام طیبات چھوڑ کر
لنگر لنگوٹا باندھ کر کسی مندر یا دریا یا تالاب کے کنارے بیٹھا کرے یا گھر
گھر جا میں یا جا بجا کر کوئی راگ یا بھجن گایا کرے یا پیالے گھر گھر بھیک مانگ
پھرے یا کوئی اور جتن کرے جس سے اس محبوبِ عالم، معبودِ حقیقی کا وصال اور
جمال یا کمال نصیب ہوتا کہ کمالِ حقیقی اور سعادتِ عظمیٰ ملے۔ سو اس وادیٔ پُرخار
اور بحرِ ذخار میں سینکڑوں بھٹک کر رہ گئے۔ اور بڑے بڑے حکیموں اور فلسفیوں
کی کشتیاں غرق ہو گئیں۔

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار — کہ پیدا نشد تختہ بر کنار

اس لیے رحمٰن و رحیم نے اپنی رحمت سے الہام کے ذریعے اس مشکل کو
حل کر دیا اور اپنی طرف آنے کا راستہ سہل کر دیا کہ اے طالبانِ راہِ نجات والے
جویندگانِ آبِ حیات، تم اپنی زبان سے یوں کہو۔ ان الفاظ کے رنگِ معانی سے
اپنی روح کو رنگین بناؤ۔ کیونکہ جب تم ان الفاظ کے معنی کو خوب دل میں جماؤ گے
اور خیال میں لاؤ گے تو تمہاری روح کی تمام کثافت اور ظلمت اور بہیمیت دُور
ہو جائے گی۔ پس جب آئینہ کا زنگ دور ہوا اسی وقت آفتابِ جہاں تاب
کا عکس پڑ کر پُر نور ہو جا۔

تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان دراصل روح ہے کہ جس کو نفسِ ناطقہ بھی کہتے
ہیں۔ اور جو اس جسم سے پیشتر تھی اور اس کی مفارقت کے بعد بھی رہے گی۔ اس میں
یہ اشارہ ہے کہ جس میں یہ تین وصف نہ پائے جائیں وہ ہر قسم کی حمد کا مستحق نہیں
تو عبادت اور استعانت کا کیونکر استحقاق ہے۔ پس اسی لیے اس کلام کے بعد وہ

کلام ذکر کیا جو اس کا نتیجہ ہے ——— اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۔[1]

تفسیر بیان القرآن

مولانا محمد اشرف علی تھانوی

اس تفسیر کا شمار اردو میں لکھی جانے والی مقبول ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس کے لکھنے والے برِّصغیر کے مشہور عالمِ دین، شیخِ طریقت اور صاحبِ تصانیف کثیرہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔ ان کا تعلق قصبہ تھانہ بھون کے ذی وجاہت فاروقی خاندان سے تھا۔ والدِ محترم کا اسمِ گرامی عبد الحق تھا۔ مولانا اشرف علی صاحب کی ولادت ۱۲ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولانا فتح محمد تھانوی سے حاصل کی۔ پھر دار العلوم دیوبند میں داخل ہو کر تکمیل علومِ دین مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے کی۔ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں فارغ التحصیل ہو کر کانپور میں بطور معلم اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی سال پہلا حج کیا۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے غائبانہ طور پر پہلے بیعت کر چکے تھے، مکہ معظمہ پہنچ کر تجدیدِ بیعت کی اور باقاعدہ ان کے مرید ہو گئے۔ ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں دوسرا حج کیا اور کئی مہینے مکہ معظمہ میں قیام کر کے مرشد سے فیضِ روحانی حاصل کیا اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں مرشد کے ایما پر کانپور کو خیر باد کہا اور مستقلاً تھانہ بھون میں مقیم ہو گئے۔ وہاں رہ کر عرصہ دراز تک علمی و روحانی فیض پہنچاتے رہے۔ آخر کار ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو واصلِ رحمتِ حق ہو گئے۔

مولانا اشرف علی تھانوی سے جتنا علمی اور روحانی فیض برِّصغیر کے مسلمانوں کو پہنچا اتنا بہت کم علمائے دین سے پہنچا ہوگا۔ ملک کے طول و عرض میں آپ کے

[1] تفسیر حقانی جلد دوم صفحات ۱۲ — ۲۲

مریدوں اور عقیدت مند پھیلے ہوئے تھے۔ آپ میں تقویٰ اس درجہ تھا کہ باپ کی آمدنی کو مشتبہ سمجھتے ہوئے ان کے ترکہ میں سے آپ نے ایک حبہ تک نہیں لیا۔ سب کچھ چھوٹے بھائی کو دے کر اپنے لیے الگ ایک چھوٹا سا مکان بنوا لیا اور ساری زندگی اس میں گزار دی۔ جب تک آپ حیات رہے قصبہ پر ایک گونا روحانی فضا چھائی رہی۔ آپ کے اٹھ جانے سے یہ خصوصیت بڑی حد تک ختم ہو گئی۔ آپ نے وعظ و تذکیر کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بڑے پیمانے پر کیا۔ آپ کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ آپ نے اپنی تصانیف کے ذریعہ دین کی تعلیم کو ہر طبقہ تک پہنچایا۔ آپ سے پہلے خواتین کے لیے دینی لٹریچر تقریباً نہیں تھا۔ آپ نے ان کے لیے بھی عام فہم اردو زبان میں کتابیں لکھ کر ان کو دینی تعلیم سے روشناس کیا۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ اور تفسیر ہے۔ عوام کے لیے صحیح ترجمہ اور آسان و مختصر تفسیر کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں اس کام کا آغاز کیا۔ خود تفسیر بیان القرآن کے خطبہ میں فرماتے ہیں:

"یہ ابجد خوان مکتب قرآنی منظر مدعا ہے کہ بہت روز سے خود بھی اور احباب کے اصرار سے بھی گاہ گاہ خیال ہوا کرتا تھا کہ کوئی مختصر تفسیر قرآن مجید کی لکھی جاوے جو ضروریات کو حاوی اور زوائد سے خالی ہو مگر تفاسیر و تراجم کی کثرت دیکھ کر اس کو امر زائد سمجھا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں نئی حالت یہ پیش آئی کہ بعض لوگوں نے محض تجارت کی غرض سے نہایت بے احتیاطی سے قرآن کے ترجمے شائع کرنے شروع کیے جن میں بکثرت مضامین خلاف قواعد شرعیہ بھر دیے جن سے عام مسلمانوں کو بہت مضرت پہنچی۔ ہر چند کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے ان کے مفاسد پر اطلاع دے کر ان

معذوروں کی روک تھام کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر چونکہ کثرت سے ترجمہ بینی کا مذاق پھیل گیا ہے۔ وہ رسالے اس غرض کی تکمیل کے لیے کافی ثابت نہ ہوئے۔ تاوقتیکہ ایسا کے زمانہ کو کوئی ترجمہ بھی نہ بتلایا جاوے جس میں مشغول ہو کر ان تراجم مستبدعہ سے بے التفات ہو جاویں۔ ہر چند کہ تراجم و تفاسیر محققین سابقین کے بالخصوص خاندان عزیزیہ کے ہر طرح کافی و وافی ہیں مگر ناظرین کی حالت و طبیعت کو کیا کیا جاوے کہ بعض تفاسیر میں عربی یا فارسی نہ جاننے کی مجبوری۔ بعض تراجم میں اختصار یا زبان بدل جانے کا عذر مانع ہو۔ غرض یہی ہوا اہل و مشورہ سے کبھی ضرورت ثابت ہو دلی کہ ان لوگوں کو کوئی نیا ترجمہ دیا جائے جس کی زبان و طرز بیان و تقریر مضامین میں ان کے مذاق و ضرورت کا حتی الامکان پورا لحاظ رہے۔ اور ساتھ ہی اس کے کوئی ضروری مضمون خواہ متعلق قرآن ہو یا اس کے متعلق ہو رہ نہ جائے۔ چند روز تک یہ مدافع صورت تجویز ہو پیرایہ تذکرہ میں رہی۔ آخر جب احباب کا تقاضا زیادہ ہوا اور خود بھی اس کی ضرورت روزانہ مشاہدہ و معائنہ میں آنے لگی آخر بنام خدا محض توکلاً علی اللہ پھر اس اطمینان پر کہ اگر میں کسی قابل نہ ہوں تو کیا ہوا بزرگان عصر اصلاح فرما کر اس کو دیکھنے کے قابل کر دیں گے۔ آخر ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں اس کو شروع کر دیا گیا۔[1]

---

[1] مکمل بیان القرآن (۱۳۵۳ھ) جلد اول شائع کردہ میر محمد کتب خانہ آرام باغ کراچی ص ۱ الف۔

اس تمہید کے بعد مولانا نے ان امور کی وضاحت کی جو ترجمہ اور تفسیر میں ملحوظ رکھے گئے۔ ترجمہ کو آپ نے آسان اور قابل فہم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ خاص محاورات کے استعمال سے اجتناب برتا گیا ہے۔ اور ٹکسالی زبان کو کام میں لایا گیا ہے۔ نفس ترجمہ کے علاوہ کوئی اور بات بتانی ہوئی تو اس کو "ف" بنا کر بڑھا دیا گیا ہے۔ مختلف مفسرین کے اقوال میں اس قول کو لیا گیا ہے جس کو ترجیح معلوم ہوئی۔ مطلب قرآنی کی تقریر حسب ضرورت کر دی گئی ہے اختلافات کی صورت میں مذہب حنفی کو لیا گیا ہے۔ ترجمہ میں عوام کا خیال رکھا گیا تھا لیکن خواص کے فائدہ کے لیے عربی میں حاشیہ دے دیا گیا ہے۔

جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے اس میں بعض امور کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جن کو خطبہ کے آخر میں "ذکر بعضے امور مرعیہ ملتزمہ در تحریر تفسیر ہذا" کے عنوان کے تحت مختصراً بیان کر دیا گیا ہے۔

تفسیر بیان القرآن ۱۲ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ یہ تفسیر سب سے پہلے ۱۳۲۶-۳۴ھ / ۱۹۱۶ء میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اضافے اور نظر ثانی کے بعد اس کا ایک ایڈیشن ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۵ء میں تھانہ بھون سے اور پھر ۱۳۵۹ھ میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تاج کمپنی کی اس طرف خاص توجہ رہی ہے۔ چنانچہ اس کمپنی سے اس ضخیم تفسیر کا اختصار بھی چھاپ دیا گیا ہے۔[1]

تفسیر بیان القرآن کو عموماً پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر سید حمید شطاری اس سے خوش نہیں ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب عقیدہ کا اختلاف ہو۔ ان کے اس تبصرہ سے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔

---

[1] قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر صفحات ۲۴۳ تا ۲۴۵

"ان کی اکثر و بیشتر تصانیف سے تو ہب کا رنگ نمایاں ہے۔"
پھر اپنے اس فقرہ کی وضاحت کے لیے بہشتی زیور کا ایک طویل اقتباس
دیا ہے جس کے اوّل اور آخر کے جملوں کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"تبرکات کی زیارت کے وقت اکٹھا ہونا ...... یہ سب گناہ
کی باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے بچا دیں!"

عقیدہ اور نظریات میں اختلاف ہونا بڑی بات نہیں لیکن اس کی بنیاد پر مولانا
کی زبان اور ان کے طرزِ بیان کو اعتراضات اور مطاعن کا ہدف بنانا، ناقابلِ فہم ہے۔
بہرحال ڈاکٹر شطاری کے اظہارِ ناراضگی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ذیل
میں ان چند علماء کی آراء پیش کی جاتی ہیں جنھوں نے اس تفسیر کو پسندیدگی کی نظر
سے دیکھا۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "حضرت کا ترجمہ قرآن پاک تاثیر و سہولتِ بیان
اور موضوع مطالب میں اپنا آپ مثل ہے۔" (یادِ رفتگاں)

مولانا محمد تقی عثمانی رقم طراز ہیں:

"اردو زبان میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی
تفسیر "بیان القرآن" اپنے مضامین کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اور
اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان تفسیر
کی ضخیم کتابیں کھنگالنے کے بعد اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔"
(مولانا محمد تقی عثمانی، علوم القرآن، کراچی ص۵۰۰)

مفسرِ قرآن مولانا احمد سعید دہلوی لکھتے ہیں:

"یہ ترجمہ اور تفسیر بڑی تحقیق کے ساتھ لکھی گئی اور یقیناً اردو زبان

۱؎ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر صفحات ۳۷۳ تا ۳۷۵

یوں اس سے معتبر اور صحیح کوئی تفسیر ہندوستان میں نہیں ہے۔"

(مولانا احمد سعید، ایمان کی باتیں ص ۲۳۴)

قاضی محمد زاہد الحسنی لکھتے ہیں:

"جامع مانع اور مکمل تفسیر بیان القرآن اس زمانہ میں تفسیر کے اساتذہ کے لیے بھی مشعلِ راہ ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی دینی، علمی اور روحانی بصیرت کا شاہکار ہے۔"

(معارف القرآن لاہور: ۱۳۹۸ھ ص ۲۳۷)

مولانا محمد مالک کاندھلوی تحریر فرماتے ہیں:

"حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی کی تفسیر بیان القرآن بھی ایک بلند پایہ اور محققانہ تفسیر ہے جو متقدمین کے علوم کا لباب اور عجیب و غریب موثر انداز اور پاکیزہ اسلوب ہے۔ مطالب قرآن کی توضیح و تفصیل کی گئی ہے۔"

(مولانا محمد مالک، منازل العرفان، لاہور ص ۳۰۸)

مفسرِ قرآن مولانا عبد الماجد دریابادی رقمطراز ہیں:

"اب چند سال سے مسلسل مشغلہ اس بے عالم و ناداں کی خدمت قرآنی کا ہے۔ اپنا تجربہ یہ ہے کہ دوسرے حضرات کے ہاں اکثر اوراق پر اوراق الٹ جانے سے بھی وہ گوہرے نکتے نہیں ملتے جو مفسر تھانوی کے چند سطروں کے اندر میسر آجاتی ہیں۔"

(مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں کراچی ۱۳۵۹ھ / ۱۹۷۹ء ص ۳۸)

مولانا شاہ سراج الیقین لکھتے ہیں:

"ترجمہ دیوان حافظ اور تفسیر بیان القرآن آپ کی بے مثل تصانیف ہیں۔"

(شمس العارفین لاہور ص ۸۳)

جناب محمد عالم کا کہنا ہے:

"تفسیر بیان القرآن ۱۲ جلد مع ترجمہ دہلی مجتبائی پریس ۱۹۲۵ء تاج کمپنی لاہور نے اس ضخیم تفسیر کا اختصار بھی چھاپ دیا ہے۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی تفسیر ہذا کو اردو تفسیروں کا سردار گردانتے ہیں۔ مولانا انور شاہ مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا "میں سمجھتا تھا کہ یہ تفسیر عوام کے لیے لکھی گئی ہے لیکن اس سے علما بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔"[1]

(محمد عالم: قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر، قرآن نمبر ص ۸۱۲)

نمونہ کے لیے سورہ فاتحہ کا ترجمہ اور تفسیر ذیل میں درج ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔

ترجمہ: شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ جو مالک ہیں روز جزا کے ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔ بتلا دیجیے ہم کو رستہ سیدھا۔ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔ نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا۔ نہ ان لوگوں کا جو رستے سے گم ہو گئے۔

---

[1] بحوالہ تعارف قرآن صفحات ۲۷۲ تا ۲۷۶

تفسیر: سورہ فاتحہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ شروع کرتا ہوں
اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ اَلْحَمْدُ
لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر
عالم کے۔ ف مخلوقات کی الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا
ہے۔ مثلاً عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم جن۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ جو
مالک ہیں روزِ جزا کے۔ ف روزِ جزا سے مراد قیامت کا دن
ہے۔ کہ اس دن میں سب اپنے کیے ہوئے کا بدلہ پاویں گے ۔
اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۔ آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں
اور آپ ہی سے درخواست اعانت کرتے ہیں۔ ف یہ بندوں کی
طرف سے جناب باری میں خطاب ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۔
بتلا دیجیے ہم کو رستہ سیدھا۔ ف مراد دین کا راستہ ہے۔ صِرَاطَ
الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۔ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام
فرمایا ہے۔ ف مراد دین کا انعام ہے۔ ان انعام والوں کا پتہ اللہ
تعالیٰ نے قرآن شریف میں دوسری جگہ بتلا دیا ہے۔ کہ وہ انبیاء
اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ہیں۔ وہ آیت یہ ہے کہ وَمَنْ
یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ
مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ۔
غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۔ نہ رستہ ان کا جن پر
آپ کا غضب کیا گیا۔ اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے۔
ف راہِ ہدایت سے چھوٹنے کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ
ان کی پوری تحقیقات نہ کرے۔ ضالین سے مراد ایسے لوگ ہیں۔

دوسری وجہ یہ کہ باوجود تحقیقات کے اس پر عمل نہ کرے مغضوب علیہم سے مراد ایسے لوگ ہیں۔ کیونکہ اچھی طرح جان بوجھ کر خلاف کرنے میں زیادہ ناراضی ہوا کرتی ہے۔[1]

تفسیر قادری

المعروف بہ کشف القلوب

مولانا محمد عمر حسینی قادری

تفسیر قادری حیدرآباد دکن کے ایک عالم اور جرنگ مولانا سید شاہ محمد عمر حسینی قادری کے مواعظ کا مجموعہ ہے جو ۱۳۱۹ھ سے ہر ماہ رسالہ کی شکل میں شائع ہوتے رہے۔ مفسر علام مولانا محمد عمر حسینی قادری ایک ذی وجاہت سید خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ سید محی الدین حسینی شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ میں بغداد سے ہندوستان تشریف لائے اور برہان پور میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کے پوتے سید حیدر علی حسینی برہانپور سے حیدرآباد دکن منتقل ہو گئے۔ وہ مفسر علام کے پر دادا تھے۔ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں مولانا محمد عمر حسینی قادری کی ولادت ہوئی۔ تعلیم و تربیت اپنے بڑے بھائی محمد صدیق حسینی محبوب اللہ سے حاصل کی۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل ان سے کی۔ بعض علوم و فنون کے لیے بعض اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے شاگردی تہ کیا۔ قراءت سبعہ و عشرہ اور حفظ قرآن کے علاوہ شعر و سخن میں بھی کمال حاصل کیا۔ مختلف سلسلوں میں خرقۂ خلافت بڑے بھائی خواجۂ دکن محمد صدیق حسینی سے ملا۔ غرض تکمیل علوم و سلوک کے بعد آپ نے درس و تدریس

---

[1] مکمل بیان القرآن صفحات ۳۰۱

اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ اور ایک کافی عرصہ تک خلق خدا کو فیض پہنچا کر ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں رہگرائے عالم بقا ہو گئے۔ قادری چمن میں آسودہ ہیں۔

مولانا محمد عمر حسینی قادری تصنیف و تالیف کے کام سے شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ نظم و نثر میں آپ کی کئی کتابیں ہیں جن میں سے ایک کتاب "قرۃ العین الصادق" ہے جو علم المیراث پر اور نظم میں ہے۔ "تاریخ العروس الحاوی تہذیب النفوس" کا صحیح و مقفیٰ اردو میں ترجمہ "مہر طریقت" کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ ترجمہ بہجۃ الاسرار رسالہ تحفہ قادریہ ہے جو مطبع بریلی سے شائع ہوا ہے۔ اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے اور دینی کتابیں تحریر فرمائیں۔ لیکن آپ کا اہم کارنامہ تفسیر قادری کلاں ہے۔

جیسا کہ مقدمہ میں بتایا جا چکا ہے "تفسیر قادری" مولانا محمد علی عمر حسینی قادری کے مواعظ کا مجموعہ ہے۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد مکہ مسجد (بلدہ دکن) میں قرآن مجید کے ایک رکوع کی تفسیر نہایت موثر اور دلنشیں انداز میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ چودھویں سیپارے تک تو یہ سلسلہ وعظ کی شکل میں چلا رہا۔ اس کے بعد بعض حضرات کو خیال ہوا کہ ان مواعظ کو تحریری شکل میں محفوظ کر دیا جائے۔ لیکن چونکہ پہلے چودہ پاروں کی تفسیر کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا اس لیے ان کو تحریری شکل دینا ممکن نہ ہوا۔ اس لیے اس سلسلہ کو پندرھویں پارہ سے شروع کیا گیا۔ تفسیر کا یہ سلسلہ انتیسویں پارے تک پہنچا تھا اور اشاعت سورہ فتح کے کچھ حصہ کی ہونے پائی تھی کہ حضرت مولانا کا انتقال ہو گیا۔ تاہم آپ کے صاحبزادے سید محمد بادشاہ حسینی قادری کے زیر ادارت باقی حصہ بھی شائع ہو گیا۔ اس طرح تفسیر کا کام تکمیل کو پہنچ گیا۔ چونکہ ختم وفات ۱۳۱۹ھ میں ہوئی تھی اس لیے تفسیر کا تاریخی نام "تفسیر کشف القلوب" ہو گیا۔

تفسیر قادری کے مقدمہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ...... میرے اللہ تیرے کلام پاک کے اقبال سے مجھے سیدھی راہ پر قائم رکھ اور اس کے سمجھنے اور سمجھانے کی توفیق عنایت فرما۔ اما بعد۔ یہ فقیر سراپا تقصیر ابوالوفا عمر، تخلص خلیق، کان اللہ لہ عرض کرتا ہے کہ ایک مدت سے قرآن مجید کا عاشق ہے۔ اسی کی تلاوت اسی کا درس اسی کا بیان ہے۔

لَا اَبْتَغِیْ اُخْرٰی وَلَا یُفَارِقُ مُھْجَتِیْ   فِیْھَا شِفَاءُ الْقَلْبِ فِیْ اَفْکَارِہٖ

چند سطور کے بعد سبب تحریر کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

اب تحریر تفسیر نصف آخر سے شروع ہوئی اس لیے یہ عاصی کئی سال سے مکہ مسجد حیدرآباد دکن میں بعد نماز جمعہ قرآن مجید ہی کا بیان ابتدا سے کر رہا تھا۔ اس شوال کے بعد پارہ سبحان الذی شروع ہونے والا تھا یہی رائے قائم ہوئی کہ اسی جگہ سے قصہ معراج بھی تقریر کے ساتھ تحریر کی بھی ابتدا کی جائے اور اللہ سے امید رکھی جائے کہ اسے قبول فرما کے ہمارے لیے باقیات صالحات کر دے۔

الحمد للہ کہ یہ کام شروع ہوا۔"

اس سلسلہ میں کسی قدر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"جس کسی بد مذہب کی نئی تصنیف دیکھنے میں آئی اس کا جواب رسالہ الگ کر دکھایا اور اصل باعث تفسیر لکھنے کا یہی ہوا کیونکہ جن مطالب کا تفاسیر قدیمہ میں تذکرہ ہے بعض وہ مذہب اس وقت نہیں بلکہ اس کی بنا کے نئے نئے فرقے پیدا ہو گئے ہیں اس لیے تفسیر میں بھی ان کے رد کی ضرورت ہوئی۔"

اس کے بعد ان تفاسیر کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے۔ آخر میں ایک مقدمہ کے لیے چند ضروری اور مفید ہدایتیں بھی درج کی گئی ہیں اور تفسیر قادری کے ترجمے اور تفسیر کے تعلق سے بھی چند باتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً زبان جو استعمال کی گئی ہے اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ

"اس میں ترجمے کی طرف پہلے توجہ کی گئی ہے اور جہاں تک ہو سکا محاورہ اور الفاظ دونوں کا خیال رکھا گیا ہے لیکن عربی زبان اس قدر وسیع ہے کہ ترجمہ کے لیے اردو زبان میں الفاظ نہیں ملتے۔ پھر حالانکہ جو سعدی فصاحت و بلاغت ہے اس کا ترجمہ اسی طرح ہے۔ گویا حسین آدمی کی تصویر کہ صورت تو ہے لیکن جان نہیں۔ آدمی کے لیے جس طرح جان ہے کلام کے لیے فصاحت و بلاغت ہے۔ پھر بلاغت بھی وہ کہ تمام فصحائے عرب سے اسی کلام عربی میں ادا ہو سکی تو ترجمہ میں وہ بلاغت کس طرح باقی رہ سکتی .... غرض لفظ و معنی دونوں کا خیال رکھ کر ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں ہمارا محاورہ لفظوں کے مطابق نہ ہوا تو اس وقت میں بہت دشواری پیش آئی۔ آخر مجبوری سے جس جانب ترجیح معلوم ہوئی اسی کو اختیار کیا اور تفاسیر معتبرہ سے بہت کچھ چھان بین کی گئی۔ پھر بھی جو غلطی صادر ہو گئی ہو تو ناظرین تفسیر سے امید ہے کہ اس سے آگاہ فرمائیں تاکہ مستقل طور پر ترجمہ چھاپنے کے وقت اس کی رعایت رکھی جائے۔"[1]

ان وضاحتوں اور عذر و معذرت کے بعد ترجمہ و تفسیر کا کام شروع کیا گیا۔

---

1. مقدمہ تفسیر قادری، بحوالہ قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک (ڈاکٹر سید حمید شطاری) صفحات ۵۰۹–۵۱۱

پہلے متن کے نیچے ترجمہ ہے اور اس کے بعد تفسیر ہے چونکہ سورہ بنی اسرائیل سے اس تفسیر کا آغاز ہوا ہے اس لیے نمونہ کے طور پر اسی کا ابتدائی حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور بڑا رحم والا ہے سُبْحَانَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ۔ (۱۵-۱)

ترجمہ: وہ پاک ہے جو اپنے بندہ (سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مصاحب ہو کر تھوڑی سی رات میں مسجد محترم (مکہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا کہ ہم نے گرد اگرد اس کے برکت دی۔

تفسیر: اس قصے کو لفظ سُبْحَانَ سے شروع کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ کوئی وہمی و خیالی آدمی اہل تشبیہ و تجسیم سے یہ نہ خیال کرے کہ خداوند عالم کسی جہت اور حد و مکان میں محدود ہے بلکہ اوس کے اعتبار کرتے سب مکانوں کی نسبت ایک ہی ہے اور وہ سب جا موجود ہے ہاں جو قرآن میں اپنی خصوصیت بعضے مکانوں سے بتلایا ہے ہم اوس کی مراد پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ تاویل سے گھبراتے ہیں۔ گو متاخرین نے اس کو اختیار کیا ہے لیکن سلف و متقدمین کا یہی مذہب رہا۔ اور لفظ سُبْحَانَ میں یہ بھی ایک نکتہ ہے کہ کوئی اوس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جھٹلائے۔ اس قصۂ معراج میں جو جسم عنصری سے ہوا ہے تاویلیں نہ کرے۔ خدا سے ضرر ا کے وہ لے گیا ہے۔ یہ خود تو نہیں گئے۔ منکروں کو چوں و چرا کا موقع باقی نہ رہے۔ سبحان اللہ خدا کے قادر کے فعل پر بھی عیب لگاتے ہو۔ اپنا سا اوس کو بھی مجبور جانتے ہو۔ اسری (اور سرے کے معنی ہیں۔ رات کو

گیا لیکن لیلاً کو یہاں اس کا ظرف کیا۔ تاوہم بھی تردد نہ ہو جاوے
اور جو سیر نہار پر بھی کبھی اطلاق ہوتا ہے اس کا خیال نہ آ سکے۔
(بِعَبْدِہٖ) یائی مصاحب عبدہٗ میں بڑھایا۔ اس میں یہ نکتہ
ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ ہو کے اس کو سیر دکھلایا۔ پھر دن
کی سیر کا جب بیان آیا هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
فرمایا یعنی وہی ہے جو تم کو بحر و بر میں چلاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا
کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ سے کیسی خصوصیت اور
کیا علاقہ ہے۔ اس واسطے دعا میں بھی اکثر آپ یوں فرماتے ہیں۔
یہ دعا روایات میں آئے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ
یعنی یا اللہ تو ہی سفر میں مصاحب ہے۔ پھر یہ معراج تو خاص سفر
ہے اس میں مصاحبت کی خصوصیت بھی سب سے بڑھ کر ہے۔
(اسریٰ بعبدہٖ) میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ آپ کی بندگی کی نسبت
اور سیر کی اضافت بھی اپنی ہی طرف کی ......"

حالانکہ مولانا سید محمد عمر حسینی قادری نے تفسیر کے مقدمے میں ترجمے کی نوعیت
کے تعلق سے خصوصیات کے ساتھ یہ وضاحت کی ہے کہ "ترجمہ لفظی بھی ہے اور
بامحاورہ بھی۔ یعنی جہاں لفظی ترجمہ کوئی نحوی الجھاؤ نہ پیدا کرتا ہو اور عربی
الفاظ کے مقابلے موزوں اردو لفظ مل جاتا ہو تو لفظی ترجمہ ہی کیا گیا ہے۔
اور جہاں بامحاورہ ترجمہ مفہوم کی ادائیگی میں زیادہ مدد دیتا ہو یا الفاظ میں
زیادہ دلچسپی پیدا کرتا ہو تو محاورہ کا اہتمام کیا گیا ہے" لیکن جہاں تک
تفسیر کا تعلق ہے وہ چونکہ وعظ کی شکل میں بیان کی گئی ہے اس لیے اس میں نہ
بحث و تشفی پیدا ہو سکی اور نہ علمی شان اور بلاغت و متانت کا اظہار
ہو سکا۔ بلکہ بعض جگہ تو تشریح طلبی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی ایک جملہ کا اعادہ

تو ظاہر یا ادنیٰ سا ہو گیا ہے اور دوسرے کا ایسا عالم الا کہ ایک معمولی استعداد کے قاری کی فہم سے ماوراء جیسے" اس قصۂ معراج میں جو جسم عنصری سے ہوا ہے تاویلیں نہ کرے۔ خدا سے شرمائے وہ لے گیا ہے یہ خود نہیں گئے۔"

احسن التفاسیر

مولوی سید احمد حسین

یہ تفسیر ریاست حیدر آباد دکن کے سابق تعلقہ دار مولوی سید احمد حسن نے لکھی ہے۔ مفسر کے زیادہ کوائف معلوم نہیں۔ تاہم قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق شمالی ہندوستان سے تھا۔ تفسیر کی طباعت کے سنین ۱۳۲۵ھ سے ۱۳۲۷ھ تک ہیں۔ اس لیے قیاس ہے کہ انہی سنوں کے درمیان یہ تفسیر لکھی بھی گئی ہوگی۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کام نہایت عجلت میں کیا گیا ہے اسی لیے نہ ہی جامع تمہید قائم کی گئی اور نہ نکات بیان کیے گئے بلکہ سہل طریقہ پر سیدھے سادے انداز میں مفہوم بیان کر دیا گیا ہے۔ تفسیر میں بھی نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے اور عبارت آرائی کی بھی کہیں کوشش نہیں کی گئی۔ گویا عام قاری کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے جو اس کو دوسرے چشموں سے اپنی تشنگی دور کرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

تفسیر کا انداز بالکل فطری ہے۔ یعنی پہلے آیت پھر اس کا ترجمہ اور پھر مختصر تفسیر۔ تفسیر کا آغاز حسب ذیل طریقہ پر کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

- اور حمد و صلوٰۃ کے شائقین تلاوت قرآن کو معلوم ہو کہ تفسیر یا کی روایتوں کے موافق اکثر علماء کے نزدیک قرآن شریف کی قرأت سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کا

پڑھنا سنت ہے[1] جس کے معنی شیطان مردود کی ہر طرح کی برائی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی التجا کے ہیں۔ اس بات پر تو سب علماء کا اتفاق ہے کہ سورہ نمل کی آیتوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں جو بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے وہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے[2] لیکن الحمد کی یا کسی اور سورہ کی آیتوں میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ایک آیت ہے یا نہیں اس میں سلف کا اختلاف ہے اور حدیثیں دونوں جانب ہیں۔ مگر نماز میں تکبیر اور سورہ فاتحہ کے مابین پکار کر بسم اللہ نہ پڑھنے کی حدیثیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ سوا سورہ فاتحہ کے اور سورتوں کی بحث اس کے باب میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے ابو داؤد میں بسند صحیح جو روایت ہے اس کا ماحصل اسی قدر ہے کہ قرآن شریف کے نازل ہونے کے وقت ایک سورہ کا ختم اور دوسری سورہ کا شروع معلوم ہو جانے کی غرض سے بِسْمِ اللّٰہِ نازل ہوا کرتی تھی۔

اس کے بعد سورہ فاتحہ کے نام اور شان نزول پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور صحیح مسلم اور سنن نسائی کے حوالے سے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت بیان کی گئی ہے۔ بعدہٗ سورہ فاتحہ کی الگ الگ آیتیں لکھ کر ان کے نیچے ترجمہ دیا گیا ہے اور پھر تفسیر بیان کی گئی ہے۔

---

1. قرأت سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ پڑھنا واجبات میں سے ہے۔
2. آیت یہ ہے۔ "اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّہٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" (سورہ النمل ۲۷: آیت ۳۰)

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بہت ہی مہربان نہایت رحم والا

مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ ۔ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ

مالک انصاف کے دن کا ۔ تجھی کو ہم بندگی کریں ۔ اور تجھی سے مدد چاہیں

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ

چلا ہم کو راہ سیدھی ۔ راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ

نہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے۔

تفسیر: "الحمد للہ" حمد کے معنی زبان سے تعریف کرنے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ نازل فرما کر اپنے بندوں کو سکھایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف اس طرح کیا کریں۔ رب العالمین۔ رب اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے جس کے معنی مربی کے ہیں۔ یہ لفظ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی مخلوق کی شان میں بغیر نسبت اور اضافت کے نہیں استعمال کیا جا سکتا۔ ہاں مخلوق کی شان میں اضافت کے ساتھ ساتھ استعمال ہو سکتا ہے۔ مثلاً رب الدار کہہ سکتے ہیں جس کے معنی گھر کے مالک کے ہوں گے۔ عالمین: عالم کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا سب مخلوقات کو عالم کہتے ہیں۔ آسمان، زمین کی آبادی، جنگل، دریا میں اللہ تعالیٰ کی طرح طرح کی مخلوقات ہیں جن سب کا مربی و معبود اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لیے لفظ عالم کو جو خود جمع ہے پھر جمع کر کے فرمایا۔ الرحمٰن الرحیم۔ صاحب رحمت کے معنوں میں

یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے نام ہیں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ کسی چیز کا مالک وہ کہلاتا ہے جس کو اس چیز میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو۔ قیامت کے دن ہر طرح کی جزاء و سزا کا اختیار خاص اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ اس واسطے اپنے آپ کو اس دن کا مالک فرمایا۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ شروع سورہ سے یہاں تک حمد و ثنا کا ذکر تھا۔ اور حمد و ثنا ممدوح کی غائبانہ حالت میں اعلیٰ درجہ کی حمد و ثنا کہلاتی ہے۔ اسی لیے یہاں تک غائب کے صیغے تھے۔ اس آیت سے دعا کی حالت شروع ہوتی ہے۔ اور دعا میں حاضری مناسب ہے اس واسطے اللہ تعالیٰ نے طرز کلام کو بدل دیا۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے معنی اس طرز کلام کے موافق یہ ہوں گے کہ یا اللہ سوا تیری ذات کے اور کسی کی عبادت ہم نہیں کرتے کیونکہ تو نے ہم کو پیدا کیا اور تیری ہی ہدایت سے ہم کو عبادت کی توفیق ہوئی۔ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اور یا اللہ ہماری قابل قبول عبادت میں شیطان کو وسوسہ اور خواہش نفسانی ہر طرح سے مانع ہے۔ اس لیے ہم تیری ذات پاک سے قابل قبول عبادت کے ادا ہونے کی مدد چاہتے ہیں۔ کیونکہ جس عبادت میں وسوسہ شیطانی کا دخل ہوگا اس میں نمائش اور ریاکاری کا اور جس عبادت میں خواہش نفسانی ہوگی اس میں بدعت کا اندیشہ اور نقصان بغیر تیری مدد کے رفع نہیں ہو سکتا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ مسند امام احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے بسند معتبر روایت ہے جس میں خود صاحب وحی صلعم نے لفظ صراط المستقیم کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے۔ اس لیے اب

کسی دوسری تفسیر کی ضرورت نہیں۔ اس تفسیر کی بناء پر آخری سورہ
تک کی دعاء کا حاصل یہ ہے کہ یا اللہ جس طرح تو نے اپنے فضل سے
ہم کو اسلام کے راستے پر لگایا ہے اسی طرح تا قیامت ہم کو اسی
راستے پر قائم اور ثابت قدم رکھ کیونکہ یہ راستہ انبیاء اور
ایسے کامل دین داروں کا ہے جن پر تو نے اپنی طرح طرح کی دین
و دنیا کی نعمتیں ختم کی ہیں۔ اور پچھلی امتوں کے جو لوگ راہ راست سے
بہک گئے ہیں اور ان کی اسی گمراہی کے سبب تو ان سے ناراض اور
ان پر تیرا غضب ہے۔ ان کی چال اور روش سے ہم کو بچا۔ حضرت
عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ حضرت
عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کی امت میں وہ لوگ ہیں جو اپنے دین پر
قائم رہے۔ مسلم وغیرہ کی صحیح روایتوں کے موافق سورہ فاتحہ کے
ختم کے بعد آمین کہنا سنت ہے۔ امام مالکؒ، شافعیؒ اور امام
احمدؒ کے نزدیک سورہ فاتحہ کا پڑھنا نماز کا ایک رکن ہے۔ بغیر
اس کے ان کے نزدیک نماز نہیں ہوتی۔ امام ابو حنیفہؒ اس کے
مخالف ہیں۔ دلیلیں جانبین کے مذہب کی فقہ کی کتابوں میں ہیں۔
اس سورہ کی اول کی آیتوں میں بندوں کی طرف سے بارگاہ الٰہی میں
دعا ہے۔ اسی واسطے حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ
مجھ میں اور میرے بندوں میں اس سورۃ کی نصفا نصف کی تقسیم ہے۔
صحیحین وغیرہ میں جو صحیح حدیثیں ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ امام مقتدی
منفرد کسی کی نماز بغیر سورہ فاتحہ کے پڑھنے کے نہیں ہوتی۔★

★ مرزا حمید الخلفاء مالک افضل المطابع و افضل الاخبار دہلی کے اہتمام
۱۳۲۷ھ میں شائع ہوئی۔

تفسیر ماجدی

عبدالماجد دریابادی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ تفسیر اردو کے صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کی لکھی ہوئی ہے اور تاج کمپنی نے بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے۔ کاغذ عمدہ اور نہایت اچھے گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ درمیان میں بے حد خوبصورت خط اور بیل دار حاشیے کے اندر قرآن کا متن مع ترجمہ ہے۔ اور چاروں طرف چوڑا حاشیہ دے کر تفسیر بیان کی گئی ہے۔ متن اور ترجمہ سمیت کل تفسیر ۱۲۱۵ صفحات پر مشتمل صرف ایک ضخیم جلد میں ہے اور باوجودیکہ اختصار سے کام لیا گیا ہے لیکن
• انداز بیان اور جامعیت کی بناء پر یہ ایک جلد بعض اور مفسرین کی کئی کئی مجلدات سے زیادہ واضح اور پر تاثیر ہے۔

مفسر موصوف مولانا عبدالماجد دریابادی وسط مارچ ۱۸۹۲ء میں اپنے وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی عبدالقادر (۱۸۴۲ء تا ۱۹۱۲ء) اودھ کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ وہ اگرچہ نہایت دیندار اور مجذوب انسان تھے تاہم زمانہ کے تقاضہ کے مطابق صاحبزادہ کو مذہبی تعلیم گھر پر دلا کر انگریزی اسکول میں داخل کر دیا۔ سیتاپور ہائی اسکول سے ۱۹۰۸ء میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اسکول میں عربی اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھی۔ استاد اچھے اور شفیق ملے۔ انھوں نے شفقت سے پڑھایا۔ اور انھوں نے توجہ سے پڑھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکول میں عربی زبان میں اچھی استعداد ہوگئی جس کو بعد میں اتنا بڑھایا کہ قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر لکھنے کے قابل ہوگئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایف اے اور بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ کالج میں ان کے خاص اور دلچسپی کے مضامین

انگریزی، منطق اور فلسفہ تھے۔ یہ مضامین انگریز استادوں سے پڑھے اور مغربی فلسفہ زیر مطالعہ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا میلان الحاد کی جانب ہوگیا۔ اور اس کا اثر ان کی طبیعت پر کئی سال تک رہا۔ اس جوش اور جذبے کے تحت انھوں نے فلسفہ اور نفسیات پر کئی کتابیں لکھیں اور دوسری زبانوں سے ترجمہ کیں۔ ان میں مبادی فلسفہ ۲ جلد، فلسفۂ جذبات، فلسفۂ اجتماع، مکالمات برکلے (ترجمہ) اور تاریخ اخلاق یورپ (ترجمہ) بہت مشہور ہیں۔ یہ کتابیں انھوں نے جس والہانہ انداز میں لکھی ہیں اس سے اردو زبان کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ لیکن خود وہ کچھ سال گمراہی میں مبتلا رہے۔ جس کو بعد میں وہ خود اپنا دور جاہلیت کہا کرتے تھے۔

کئی سال تک الحاد کی ظلمتوں میں گھرے رہے لیکن اللہ تعالیٰ کو انھیں ہدایت دینی تھی اور ایسی ہستیوں کی صحبت نصیب ہوگئی جو اسلام ہی کو ازلی اور ابدی حقیقت سمجھتے تھے۔ ان میں پہلی ہستی مولانا محمد علی کی تھی اور دوسری اکبر الہ آبادی کی اور تیسری مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی۔ ان حضرات کے ہاتھوں نے ان کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف پہنچا دیا اور اس حد تک اصلاح ہوئی کہ شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت بھی طے کی اور مولانا تھانوی کے ایما سے حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے حلقۂ مریدین میں داخل ہوگئے۔

ذریعہ معاش کے طور پر کچھ عرصہ ملازمت کی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں دار الترجمہ حیدرآباد دکن سے منسلک ہوگئے۔ لیکن جلد ہی دل برداشتہ ہوکر ملازمت ترک کردی اور وہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ اس کے بعد زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزارا اور صحافت سے تعلق قائم کیا جو مرتے دم تک جاری رہا۔ پہلے ایک اسلامی ہفت روزہ "سچ" نکالا۔ ۱۹۵۰ء میں اس کا نام بدل کر

"صدق جدید" جاری کر دیا۔ یہ اخبار آخری وقت تک نہایت باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ اسی کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی بڑے پیمانے پر جاری رہا اور بڑی معیاری کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو ۸۵ سال کی عمر میں رہگرائے عالم بقا ہو گئے۔ انتقال دریاباد ہی میں ہوا۔[1]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مولانا عبد الماجد دریابادی کی زندگی لکھنے لکھانے کے لیے وقف تھی۔ چنانچہ انھوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں۔ ان سب ہی کو اردو ادب میں بلند مقام حاصل ہے لیکن جس چیز نے انھیں شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلوائی وہ انگریزی اور اردو میں ان کا کلام پاک کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ دلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ بجائے خود کچھ کہنے کے ایک اور جید عالم مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی رائے پیش کر دی جائے۔ وہ فرماتے ہیں:

"آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جو بقائے دوام کا ضامن ہے، وہ انگریزی اور اردو میں ترجمہ و تفسیر کلام مجید ہے۔ ابھی عمر کی درمیانی منزل میں تھے کہ آپ کو اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فیض صحبت و تربیت سے قرآن مجید کے ساتھ ایسا شغف و انہماک پیدا ہوا کہ زندگی اس کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ اگرچہ وہ دوسرے کام بھی کرتے رہے لیکن ان کی حیثیت ضمنی تھی۔ ترجمہ و تفسیر کے سلسلے میں مولانا نے مسلسل سالہا سال جو محنت شاقہ برداشت کی ہے اور جس ذوق و شوق اور انہماک سے یہ عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس کا اندازہ کتاب

۱۔ معارف قرآنی، صفحات ۲۲۱ ـ ۲۲۲

دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس تفسیر میں مولانا نے عربی اور اردو زبان کی تفاسیر اور عربی و قرآنی لغات کا مطالعہ تو محنت اور وسعت سے کیا ہی تھا، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چونکہ قرآن مجید میں اہل کتاب اور ان کی کتابوں کا کثرت سے تذکرہ ہے۔ پھر امم قدیمہ کے حالات و سوانح بھی جگہ جگہ بیان کیے گئے ہیں، اس بنا پر مولانا نے کتب قدیمہ یعنی عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کے پرانے اور نئے ایڈیشن اور امم سابقہ کی تاریخ پر نہایت مستند اور محققانہ کتابوں کا وہ عظیم ذخیرہ بڑی محنت اور دل کی لگن کے ساتھ کہاں کہاں سے فراہم کیا، اس سلسلہ میں عبرانی زبان بھی سیکھی، پھر قرآن مجید سے متعلق جو کچھ یورپ میں لکھا گیا تھا اس کی کتابیں بھی بڑے اہتمام سے منگاتے اور بڑے غور و خوض سے اس کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں فلسفہ اور سائنس کے نئے نئے نظریات اور اور افکار سے بھی واقف رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں ان سب چیزوں سے کام لیا۔ اور یہی مولانا کی تفسیر کی وہ انفرادی خصوصیت بن گئی جس میں کوئی بھی ان کا سہیم و شریک نہیں ہے[1]

اسی کے ساتھ ایک اور بڑے عالم یعنی مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی رائے بھی سن لیجیے۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ تفسیر دور جدید کے صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے ہے۔ اس کی تین جلدیں ہیں[2]۔ حدیث اور قرآنی آیات سے

---

[1] مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم اے نظرات: برہان دہلی، ج ۸۰، شمارہ ۱ - ص ۳۲ء

[2] اب تینوں جلدوں کو ایک مجلد میں بھی شائع کر دیا گیا ہے۔

اصلاحی نکات کے استنباط کا اچھا سلیقہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ مرحوم رسمی عالم نہ تھے لیکن باوجود اس کے اپنی علمی صلاحیت سے بڑا کام لیا۔ قرآن کریم کی تفسیر تین جلدوں میں لکھی اور عربی والی طلبہ پر بڑا احسان کیا کہ عربی تفسیر کی اصل عبارتیں سب نقل کر دیں۔[1] تفسیر ماجدی پر من الحیث المجموع دوسرا زاویہ نگاہ اپنانے کے بجائے اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیات کی تفسیر کو دیکھا جائے۔

ان میں سے ایک سورہ فاتحہ کی چوتھی آیت اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہے۔ اس میں عبادت اور استعانت کے لیے جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ ایسا ہے کہ اس سے شرک کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ مگر بہت کم مفسرین اس کی طرف توجہ کرتے اور اس کی اس انداز سے تفسیر بیان کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے تو اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ دوسرے مفسرین بھی اس پر سے سرسری طور پر گزر گئے ہیں۔ مگر مولانا عبدالماجد نے نہایت مختصر الفاظ میں اس کو اس طرح سمجھایا ہے کہ جس کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا ہوگا وہ عبادت و استعانت میں کسی طرح کے حیلے بہانے سے کام لے کر شرک کا مرتکب نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

ترجمہ: ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

تفسیر: (نہ کہ کسی اور سے اسے حاجت روا سمجھ کر اے اللہ) آیت کے جزو اول میں بیزاری اور تبری ہے شرک سے۔ اس آخری جزو میں بندہ کی زبان سے اقرار ہے اپنی بے بضاعتی، بے قدری کا۔ اور اقرار ہے اپنے کو حفاظت اور نصرت کے لیے ہر طرح اللہ کے ہاتھ میں سپرد کر دینے کا

---

[1] لغات القرآن ص ۲۱۸

فَالْاَوَّلُ تَبَرُّءٌ عَنِ الشِّرْكِ وَالثَّانِیْ تَبَرُّءٌ عَنِ الْحَوْلِ وَالْقُوَّۃِ وَالتَّفْوِیْضِ اِلَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ (ابن کثیر) نَعْبُدُ کے معنی بعد نَسْتَعِیْنُ لانا گویا بندوں کی زبان سے یہ کہلانا ہے کہ ہم عبادت تک میں تیری ہی توفیق تیری ہی اعانت تیری ہی دستگیری کے محتاج ہیں۔ اِیَّاکَ کی تکرار توحید اور رد شرک کی اہمیت کو اور دوبالا کر رہی ہے۔ کَرَّرَ ذٰلِکَ اِھْتِمَامًا وَالْحَصْرُ (ابن کثیر) کَرَّرَ الضَّمِیْرَ لِلتَّنْصِیْصِ عَلَی اَنَّہُ الْمُسْتَعَانُ بِہٖ لَا غَیْرُہٗ (بیضاوی) آیت نے جڑ کاٹ دی ہے۔ ہر قسم کی مظاہر پرستی اور مخلوق پرستی کی۔ شرک کی خفی سے خفی بھی راہیں بند کر دی ہیں۔ اور کوئی خفیف سی بھی گنجائش پیر پرستی، پیغمبر پرستی، فرشتہ پرستی وغیرہ کی نہیں چھوڑی۔ مرشد تھانوی نے فرمایا کہ سالک کا مقام اِیَّاکَ نَعْبُدُ پر تمام ہو جاتا ہے۔ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سے وہ طالب تمکین و رسوخ کا ہوتا ہے۔

ایک اور مقام وَمَنْ یَّقْنُتْ کے سیپارے میں آیات ۳۲، ۳۳ اور ۳۴ کی تفسیر ہے۔ ان ہی آیات میں آیت تطہیر بھی آگئی ہے۔ یہاں تخاطب ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور تذکرہ تمام تر امہات المومنین کا ہے۔ ایسی صورت میں قیاس اور عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ آیت تطہیر کا تعلق بھی امہات المومنین سے ہو لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ بعض مفسرین کو اس آیت کو کلیۃً حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں اور بعض مفسرین مفسرین تھوڑی سی رعایت برت کر (بطور طفیلیوں کے) امہات المومنین کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور استدلال یہ پیش کرتے ہیں کہ

ا القرآن الحکیم مع ترجمہ و تفسیر از مولانا عبدالماجد دریابادی شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ ص ۳

امہات المومنین چونکہ خواتین ہیں اس لیے جہاں ان جمع مونث کی ضمیریں
جمع مونث کے صیغے استعمال ہو رہے ہیں۔ ان کا تعلق تو ان سے ہے
لیکن آیت تطہیر میں چونکہ دو جگہ جمع مذکر کی ضمیر (عنکم اور یطہرکم
میں) کا استعمال ہوا ہے اس لیے اس آیت کا تعلق بعض مردوں سے بھی ہے یا یہ کہ
امہات المومنین کے ساتھ بعض مرد بھی شریک ہیں اور وہ ہیں حضرت علی اور
حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس قیاس
کی بنیاد پر بعض مردوں کو بھی اس میں شریک کرنا ضروری ہے تو وہ کون سا قرینہ
ہے جس کی بنیاد پر حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہی کو
شریک کیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد
اور حضرات حسنینؓ نواسے تھے تو ان ہی رشتوں کی بنیاد پر حضرت عثمانؓ اور حضرت
ابو العاصؓ کو اور رسول اللہ کے سب سے بڑے نواسے حضرت علیؓ ابن حضرت
زینبؓ بنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب
نواسی حضرت امامہؓ زوجہ حضرت علی کو بھی شامل کیا جاتا۔ بعض حضرات
اور دیگر حضرات نے جب اس طرح بات بنتے نہ دیکھی تو ایک حدیث اور چادر
تطہیر کا سہارا لیا لیکن قرآن کے واضح ارشاد کے مقابلہ میں ان دلائل میں
کوئی وزن نہیں رہتا۔ بہرحال بحث کو زیادہ طول دیتے ہوئے اس آیت پر غور
کرنے کی ضرورت ہے جو مولانا عبدالماجد دریابادی نے بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو

يٰنِسَاۗءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ ....
يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (۳۲-۳۳-۳۴)

ترجمہ: اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو جبکہ تم تقویٰ اختیار
کر رکھو۔ تو تم بولنے میں نزاکت مت اختیار کرو کہ (اس سے)
ایسے شخص کو خیال فاسد پیدا ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی

ہے۔ اور قاعدے کے موافق بات کہا کرو۔ اور اپنے گھروں میں
قرار سے رہو۔ اور جاہلیت قدیم کے مطابق اپنے کو دکھاتی مت
پھرو۔ اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ کا اور
اس کے رسول کا حکم مانو۔

"اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ اے (نبی کے) گھر والو تم سے آلودگی
کو دور رکھے اور تم کو خوب نکھار دے۔ اور تم اللہ کی ان آیتوں
اور اس علم کو یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں پڑھ کر سنائے جاتے
رہتے ہیں۔

(آیت تطہیر) إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ
أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۝

ترجمہ: اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ اے (نبی کے) گھر والو تم سے آلودگی
سے دور رکھے۔"

(وضاحت) اہل سنت کا اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ آیت کا سبب نزول
ازواج النبیؐ ہی ہیں اور اہل بیت سے اولاً وہی مراد ہیں۔ البتہ گفتگو اس میں
ہوئی ہے کہ آیا ان کے علاوہ بھی کوئی مراد ہے؟ سو محققین اہل سنت کا فیصلہ
ہے کہ لفظ کے عموم میں ازواج کے علاوہ بھی ہستیاں داخل ہیں۔ قال
عِكْرِمَةُ إِنَّهَا نَزَلَتْ فِي نِسَاءِ النَّبِيِّ صلعم فَإِنْ كَانَ
الْمُرَادُ أَنَّهُنَّ كُنَّ سَبَبَ النُّزُولِ دُونَ غَيْرِهِنَّ فَصَحِيحٌ وَ
إِنْ أُرِيدَ أَنَّهُنَّ الْمُرَادُ فَقَطْ دُونَ غَيْرِهِنَّ فَفِي هٰذَا نَظَرٌ فَإِنَّهُ
قَدْ وَرَدَتْ أَحَادِيثُ تَدُلُّ عَلَى أَنَّ الْمُرَادَ أَعَمُّ مِنْ ذٰلِكَ (ابن کثیر)
وَالَّذِي يَظْهَرُ مِنَ الْآيَةِ أَنَّهَا عَامَّةٌ فِي جَمِيعِ أَهْلِ الْبَيْتِ مِنَ
الْأَزْوَاجِ وَغَيْرِهِنَّ (قرطبی) اہل بیت کے جو متعارف معنی اردو میں سمجھے

ہیں وہ بھی حدیث سے نکلتے ہیں لیکن یہاں ذکر صرف اصطلاحِ قرآنی کا ہے۔
قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی اہل بیت کا لفظ ایک پیغمبر کی زوجہ محترمہ کے
لیے آیا ہے۔[1] (ہود ۔ ع ۔ ۷ ۔ ۷۳)

---

[1] یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضرت لوط علیہ السلام کی امت کی بداعمالیوں
کی وجہ سے اس پر عذاب نازل کرنے کے لیے فرشتے آئے۔ اس وقت وہ انسانوں کی
شکل میں تھے۔ وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہؓ کو بیٹے کی خوشخبری دینے کو
بھی آئے تھے۔ انھوں نے آکر حضرت ابراہیمؑ کو سلام کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا تم پر
بھی سلام ہو۔ وہ فرشتوں کو معمولی مسافر سمجھتے ہوئے ان کی خاطرداری میں لگ گئے
اور ایک تلا ہوا بچھڑا لاکر ان کے سامنے رکھا۔ لیکن انھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ
نہیں بڑھایا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ متوحش ہوئے۔ فرشتے بولے آپ ڈریئے
نہیں۔ ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کی آیات ملاحظہ ہوں۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ
مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۔ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا
عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۔ قَالُوْٓا
اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ
الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۔ (۱۱ : ۷۱ ۔ ۷۳)

ترجمہ: اور ان کی بیوی کھڑی تھیں۔ پس وہ ہنسیں تو پھر ہم نے انھیں بشارت
دی اسحٰق کی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی۔ بولیں۔ ہائے خاک پڑے کیا
اب میں بچے جنوں گی۔ درآنحالیکہ میں بوڑھی ہو چکی اور یہ میرے میاں
بھی بالکل بوڑھے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ وہ بولے اے تم تعجب
کرتی ہو اللہ کے کام میں اے خاندان والو تم پر تو اللہ کی (خاص) رحمت اور اس کی

معارف القرآن

مولانا مفتی محمد شفیع

اردو تفاسیر میں یہ نہایت مشہور، مقبول، جامع اور بلند پایہ تفسیر ہے۔ پیرانہ سالی اور صحت کی خرابی کے باوجود یہ تفسیر مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمت اللہ علیہ نے صرف پانچ سال کی قلیل مدت میں لکھ کر شائع کی۔ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبند کے عثمانی شیوخ میں سے تھے اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمت اللہ علیہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ۱۸۹۷ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے۔ چونکہ کئی پشتوں سے خاندان میں علم دین متوارث چلا آرہا تھا۔ مفتی صاحب کے والد ماجد مولانا محمد یٰسین خود دارالعلوم دیوبند کے شروع دور کے فارغ التحصیل تھے۔ اور فراغت کے بعد بھی عمر بھر اسی مرکز علم سے وابستہ رہے۔ اس لیے انھوں نے مفتی صاحب کو بھی دین کی تعلیم دلائی۔ انھوں نے قرآن دارالعلوم کے اساتذہ حافظ عبدالحلیم اور حافظ نامدار خاں سے حفظ کیا پھر اپنے والد محترم محمد یٰسین کی خدمت میں رہ کر ان سے اردو، فارسی، حساب، ریاضی اور ابتدائی عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں دارالعلوم کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخلہ لے کر ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) برکتیں اللہ کی تم پر ہیں، بیشک وہ تعریف کے لائق اور بڑی شان والا ہے۔
بڑھی کو یہ شک ہے کہ یہاں مخاطب صرف حضرت سارہ زوجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہے جو مخاطب تھیں
آگے دو لفظوں میں ان کے لیے ایک جگہ جمع مؤنث کا صیغہ "تعجبین" (اتم تعجب کرتی ہیں) استعمال ہوا ہے اور
دوسری جگہ جمع مذکر کی ضمیر "کم" (علیکم) سے تعبیر ہوا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ استعمال اس دور کے
اہل زبان کے محاورے کے مطابق ہے۔ اسے اگر زبان کے مروجہ قواعد کی روشنی میں جانچنا ٹھیک نہیں ہے۔

درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ متوسط تعلیم عربی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند
رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ بعد ازاں علوم عربیہ کی تکمیل حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ
صاحب کشمیری، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت سید اصغر حسین صاحب،
حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی، حضرت مولانا محمد ابراہیم
صاحب بلیاوی اور حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب رحمہم اللہ سے کی۔ ۱۳۳۶ھ
مطابق ۱۹۱۸ء میں فنون کی چند کتابیں پڑھانا شروع کیں اور اسی سال سے دارالعلوم
میں تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ایک سال تعلیم و تعلّم ساتھ ساتھ چلتے
رہے۔ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء سے باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہو گیا۔
بارہ سال بعد ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں صدر مفتی بنا دیے گئے۔ اس کے
ساتھ ساتھ کچھ کتابیں حدیث و تفسیر کی بھی زیرِ درس رہیں۔ یہ سلسلہ ۱۳۶۲ھ
مطابق ۱۹۴۳ء تک چلا۔ اسی سال تحریکِ پاکستان کی جدوجہد اور کچھ دوسرے
اسباب کی بنا پر دارالعلوم دیوبند کی خدمات سے سبکدوش ہو گئے۔[1]

۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آگیا اور تقریباً آٹھ ماہ بعد
شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے بلانے پر مئی ۱۹۴۸ء میں دہلی اور دیگر
مقامات سے ہوتے ہوئے پاکستان آگئے اور بقول مفتی صاحب "کراچی جبر
اختیاری طور پر اپنا وطن بن گیا۔ لیکن جن مقاصد کے لیے پاکستان محبوب و مطلوب
تھا اور اس کے لیے سب کچھ قربان کیا تھا۔ حکومتوں کے انقلاب نے ان کی حقیقت
ایک افسانہ خواب سے زیادہ نہ چھوڑی۔"

1۔ معارف القرآن جلد اول۔ شائع کردہ ادارۃ المعارف۔ دارالعلوم کراچی ۱۴،
طبع جدید جولائی ۱۹۸۳ء۔ صفحات ۶۰ تا ۶۱ و میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات مرتبہ مفتی محمد
شفیع۔ ناشر دارالاشاعت، مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی۔ صفحات ۵۔ ۲۲ معارف القرآن صفحہ ۱۰ تا ۱۳۔

بلبل ہمہ تن خوں شد و گل شد ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر ایں است بہارے

حالات کے باوجود مفتی صاحب نے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ درس و تدریس اور
کا کام بھی انجام دیا۔ اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ دینی علوم کی بھی خدمت
کی۔ دارالعلوم دیوبند کے نمونے کا کورنگی میں ایک دارالعلوم قائم کیا جو ان کے
رحلت کے بعد بھی ان کے لائق صاحبزادوں کی نگرانی میں نہایت خوبی سے چل
رہا ہے اور کافی مخلوق اس سے فیضیاب ہو رہی ہے۔[۱]

دارالعلوم دیوبند میں رہتے ہوئے درس و تدریس اور فتویٰ نویسی کے
ساتھ ساتھ مفتی صاحب نے تصنیف و تالیف کا کام بھی باقاعدگی سے انجام
دیا اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر
بیعت کر کے راہ طریقت بھی طے کرنی شروع کر دی۔ بیس سال تک حضرت کی
خدمت میں حاضری دیتے رہے اور اکتساب فیض کرتے رہے۔ ان ہی کے ایما
سے احکام القرآن پر عربی زبان میں دو جلدیں لکھیں۔ ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا
کہ قرآن کریم کے ساتھ ایک خصوصی تعلق قائم ہو گیا جو پاکستان آنے کے بعد بڑھتا
گیا۔ ۱۹۵۰ء سے آرام باغ کراچی کے متصل مسجد باب الاسلام میں درس قرآن
کا سلسلہ شروع کیا جو سات سال میں مکمل ہو گیا۔ پھر ریڈیو پاکستان سے
"معارف القرآن" کے نام سے ہفتہ وار درس نشر کیا جو عام مسلمانوں کی ضرورت
کے مطابق احکام کی آیات کی تفسیر ہوتی تھی۔ یہ تفسیر سورۂ ابراہیم تک پہنچی تھی کہ
ریڈیو پاکستان کی نئی پالیسی کے تحت یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا لیکن بعد میں جنوبی افریقہ
اور پاکستان کے بعض دیندار مسلمانوں کی فرمائش پر تیرہویں سپارے تک کی

۱؎ معارف القرآن جلد اول صفحات ۴۳-۶۳۔

تفسیر شروع کرنے کا ارادہ کیا لیکن ابھی سورہ بقرہ کا کام شروع ہی کیا تھا کہ مفتی صاحب سخت بیمار ہو گئے جس کی وجہ سے کام رک گیا۔ لیکن پھر شوال ۱۳۸۸ھ مطابق نومبر ۱۹۶۸ء میں پھر کام شروع کیا اور علالت کی ناسازی کے باوجود ۲۱ شعبان ۱۳۹۲ھ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء کو یہ عظیم تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی۔ بعد میں آپ کے لائق صاحبزادے مولانا محمد تقی عثمانی نے علوم قرآن اور علم تفسیر سے متعلق ضروری معلومات کے عنوان سے ایک مقدمہ لکھ کر اس میں اضافہ کر دیا جس سے علم قرآنی کے لیے اس کی افادیت میں معتدبہ اضافہ ہو گیا۔

تفسیر معارف القرآن آٹھ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے اور بے حد مقبول ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کا یہ کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک ان کے نام کو زندہ رکھے گا۔ اس تفسیر کی جامعیت کے بارے میں مصنف علام نے جو الفاظ بیان فرمائے ہیں بہتر ہے وہ ان کی زبان میں بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ فرماتے ہیں:

مذکورۃ الصدر التزامات نے تفسیر معارف القرآن کو مندرجہ ذیل چیزوں کا جامع بنا دیا ہے:

(۱) قرآن مجید کے دو مستند ترجمے۔ ایک حضرت شیخ الہندؒ کا جو دراصل شاہ عبد القادر صاحب کا ترجمہ ہے۔ دوسرا حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا ترجمہ۔

(۲) خلاصۂ تفسیر جو دراصل بیان القرآن کا خلاصہ اور تسہیل ہے جس کو اگر الگ بھی قرآن مجید کے حاشیہ پر طبع کر لیا جائے تو مختصر فرصت والوں کے لیے فہم قرآن کا مستند اور بہترین ذریعہ ہے۔ اس نے ایک اور ضرورت کو پورا کر دیا جس کی طرف مجھے اخی فی اللہ مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنیؒ

---

۱ معارف القرآن جلد اول ص ۳۰

مدینہ منورہ سے علامہ فرید وجدی کی ایک مختصر تفسیر حاشیہ قرآن پر
دکھلا کر توجہ دلائی تھی کہ کاش اردو میں بھی کوئی ایسی تفسیر ہوتی جو اسی کی
طرح مختصر اور آسان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ آرزو بھی پوری فرما دی۔
یہ دونوں چیزیں تو اکابر علماء کی مستند اور معروف ہیں۔

تیسری چیز معارف و مسائل ہیں جو میری طرف منسوب ہیں اور میری محنت
کا محور ہیں۔ الحمد للہ کہ اس میں بھی میرا اپنا کچھ نہیں سب اسلاف امت
ہی سے لیا ہوا ہے۔ آج کل کے اہل علم اور اہل قلم اکثر اس فکر میں رہتے ہیں
کہ اپنی کوئی تحقیق اور اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیش کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ
کا شکر گزار ہوں کہ اس سب کام میں میرا اپنا کچھ نہیں۔

این ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیج — بے عنایات خدا ہیچیم ہیچ [1]

مفتی صاحب نے اس تفسیر کے لکھنے میں جتنی کاوش کی ہے اس کو ہر شخص سمجھ
سکتا ہے لیکن اللہ والوں کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد
بھی انھوں نے کس آسانی سے کہہ دیا کہ "اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس
سب کام میں میرا اپنا کچھ نہیں"۔ کوئی دنیا دار ہوتا تو سب کچھ دوسروں سے نقل
کرنے کے علاوہ ان ہی کے سر عیب لگاتا اور اپنے متعلق ڈھنڈورے سے کہتا

جو کام ہوا ہم سے ہوا کہ تم سے نہ ہوگا

بہر حال مفتی صاحب نے یہ فقرہ لکھ کر اپنی بندگی اور عبودیت کا اظہار کیا
ہے۔ ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر کام پر اللہ کا شکر ادا کرے اس لیے
کہ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں۔ تاہم تائید ایزدی سے
مفتی صاحب نے اس تفسیر میں جو انداز اختیار کیا ہے سچ پوچھیے تو وہ ان ہی کا حصہ

---

[1] معارف القرآن جلد اوّل ص ۱۰

ہے۔ انھوں نے تین مرحلوں میں تفسیر بیان کر کے اس کو ہر قاری کے لیے عام قابلِ فہم بلکہ بے انتہا مفید بنا دیا ہے۔ پہلا مرحلہ ترجمہ کا ہے، دوسرا مرحلہ خلاصۂ تفسیر کا اور تیسرا معارف و مسائل کا۔ ترجمہ مختصر، بامحاورہ، رواں اور شگفتہ ہے جس کی وجہ سے قاری کو کسی ابہام سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ خلاصۂ تفسیر سے ہر بات پوری طرح واضح اور منقح ہو کر ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ اور معارف و مسائل پڑھنے کے بعد تو قاری کے لیے کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ ان امور پر تفصیلی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے البتہ نمونہ کے لیے ذیل میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر پیش کی جاتی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔۔۔۔۔۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ
وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ (الفاتحہ)

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا ہے سارے جہان کا، بے حد مہربان نہایت رحم والا، مالک روزِ جزا کا، تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، بتلا ہم کو راہ سیدھی، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا، جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

خلاصۂ تفسیر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے (مخلوقات کی الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا ہے، مثلاً عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم جن)۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، جو مالک ہیں روزِ جزا کے (مراد قیامت کا دن ہے جس میں ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پائے گا)۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، بتلا دیجیے ہم کو رستہ سیدھا (مراد دین کا راستہ ہے) صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا (مراد دین کا انعام ہے) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے۔ (راہ ہدایت سے ہٹ جانے کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی پوری تحقیق ہی نہ کرے ضالین سے ایسے لوگ مراد ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تحقیق پوری ہونے کے باوجود اس پر عمل نہ کرے۔ مغضوب علیہم سے ایسے لوگ مراد ہیں کیونکہ جان بوجھ کر خلاف کرنا زیادہ ناراضی کا سبب ہوتا ہے۔)

معارف و مسائل

تفسیر کا یہ مرحلہ سب سے زیادہ طویل ہے۔ چنانچہ سورۂ فاتحہ میں اس کی وسعت بڑے سائز کے چوبیس صفحات کو گھیرے ہوئے ہے اور اس لیے اس طویل بحث کو ذیلی عنوانات کے تحت بیان کرنا پڑا ہے۔ یہ عنوانات اس طرح قائم کیے گئے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ دو جملوں کی حقیقت اور عقلاً اس کی ضرورت، مالک کون ہے۔ تَكْمِيْلُ الْهِدَايَةِ فِيْ تَفْصِيْلِ دَرَجَاتِ الْهِدَايَةِ۔ صراط مستقیم کونسا راستہ ہے۔ صراط مستقیم کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں کے مجموعے سے ملتا ہے۔ فرقہ وارانہ اختلافات کا اصل سبب۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا انسان کا فطری فرض ہے۔ خود اپنی مدح و ثنا کسی انسان کے لیے جائز نہیں۔ لفظ رب اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے۔ غیر اللہ کو رب کہنا جائز نہیں۔ استعانت کے معنی کی تشریح اور مسئلہ توسل کی تحقیق۔ صراط مستقیم کی ہدایت دنیا و دین

یعنی تفسیر کا میا اب ہے۔

ظاہر ہے کہ اتنے ذیلی عنوانات کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں اس لیے شروع کا حصہ اور آخر کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔

سورہ فاتحہ کے مضامین

سورہ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے جن سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے اور آخری تین آیتوں میں انسان کی طرف سے دعا و درخواست کا مضمون ہے جو رب العزت نے اپنی رحمت سے خود ہی انسان کو سکھایا ہے اور درمیانی ایک آیت میں دونوں چیزیں مشترک ہیں، کچھ حمد و ثنا کا پہلو ہے کچھ دعا و درخواست کا۔

وسیلہ استعانت اور استمداد کے مسئلہ میں بکثرت لوگوں کو خلجان رہتا ہے۔ امید ہے کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء و اولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختار مطلق سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے۔ اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے۔ اس میں عام طور پر لوگوں میں افراط و تفریط کا عمل ہوتا ہے۔

تفسیر نور العرفان[1]

مفتی احمد یار خان

اور

خزائن العرفان فی تفسیر القرآن[2]

صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کا ترجمہ قرآن المعروف بہ

---

[1] تفسیر نور العرفان مفتی احمد یار خان ترجمہ مولانا احمد رضا خان (باقی اگلے صفحہ پر)

"کنز الایمان" اردو زبان میں چھپنے والے بہترین ترجموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر تو اس کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس ترجمہ پر ان کے بعض معتقدین نے تفسیری حواشی تحریر کیے ہیں۔ ان میں دو تفسیریں زیادہ مشہور ہیں۔ ایک تفسیر "نور العرفان" مصنفہ حکیم الامت مفتی احمد یار خان صاحب بدایونی اور دوسری "خزائن العرفان" مصنفہ صدر الافاضل مولینا سید محمد نعیم صاحب مراد آبادی۔ باوجودیکہ دونوں مفسرین بڑے لائق اور نہایت فاضل ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو ان کی تفسیریں اس شان کی نہیں جس شان کا ترجمہ ہے۔ فاضل بریلوی نے جس غور و فکر اور تدبر سے کام لیا ہے وہ چیز ان تفسیروں میں نظر نہیں آتی۔ بعض مقامات پر تو محض تقلید سے کام لیا گیا ہے اور بعض جگہوں پر کمزور دلائل کا سہارا لیا گیا ہے۔ مثلاً اعلیٰ حضرت نے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کا نہایت صحیح ترجمہ کیا ہے۔ "ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں" ترجمہ میں یکسانیت قائم رکھ کر مترجم نے وہی مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآن کریم کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ نَعۡبُدُ اور نَسۡتَعِیۡنُ دونوں کے ساتھ "اِیَّاکَ" لا کر ایک جیسے درجہ میں رکھا گیا۔ یہ لفظ کسی بات پر زور دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر اس لفظ کے "نَعۡبُدُ" کے ساتھ لگنے سے غیر اللہ ہماری عبادت کا مرجع بننے سے خارج ہو جاتے ہیں تو نَسۡتَعِیۡنُ کے ساتھ لگنے سے بھی غیر اللہ ہمارے لیے استعانت یا امداد کا مرجع بننے سے خارج ہونا چاہیے۔ وہ کون سا قرینہ ہے جس کی بنیاد پر دونوں مقامات پر اس کے الگ الگ اثرات قائم ہوں یا ایک جگہ کچھ مفہوم لیا جائے اور دوسری جگہ کچھ اور۔ اسی بات کو اس طرح بھی کہا

---

[1] انجیل مقدس کا حاشیہ، شائع کردہ ادارہ کتب اسلامیہ پاکستان، گجرات مغربی پاکستان

[2] خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، لاہور

جا سکتا تھا "نَعْبُدُكَ وَنَسْتَعِيْنُكَ" لیکن چونکہ سورہ فاتحہ میں بندہ سے عہد و اقرار کرایا جا رہا ہے کہ اے القدیم نہ عبادت میں تیرے ساتھ کسی کو شریک کرتے ہیں اور نہ استعانت (مدد) میں۔ اس لیے یہاں یہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے "إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (ہم تجھی ہی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں۔)

اس واضح بات کو دونوں لائق مفسرین نے اپنے اپنے طریقے پر بیان کر کے قارئین کو ایک گورکھ دھندے میں مبتلا کر دیا ہے۔ مفتی احمد یار خان صاحب نے تو اس کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے۔

"اس سے معلوم ہوا کہ حقیقتاً مدد اللہ تعالیٰ کی ہے جیسے حقیقتاً حمد رب کی ہے۔ خواہ واسطے سے ہو یا بلا واسطہ۔ خیال رہے کہ عبادت صرف اللہ کی ہے۔ مدد لینا حقیقتاً اللہ سے ہے۔ مجازاً اس کے بندوں سے۔ اس فرق کی وجہ سے ان دو چیزوں کو علیحدہ جملوں میں ارشاد فرمایا "إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کو حرف عطف "و" کے ذریعے سے ملایا گیا ہے اس لیے دونوں ایک حکم کے تحت آتے ہیں۔ خیال رہے کہ عبادت اور مدد لینے میں فرق یہ ہے کہ مدد مجازی طور پر غیر اللہ سے بھی حاصل کی جاتی ہے (نوٹ: غیر اللہ سے اس کی زندگی میں یا اس عقیدہ کے ساتھ کہ وہ غیر فانی بھی ہے جبکہ باری تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" (مح) رب فرماتا ہے۔ "إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ" اور فرماتا ہے "وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ" لیکن عبادت غیر خدا کی نہیں کی جا سکتی..... الخ

مولانا سید محمد نعیم الدین صاحب "إِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے

فرماتے ہیں:

«اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ» سے یہ تعلیم فرمائی کہ استعانت خواہ بواسطہ یا بے واسطہ ہر طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ حقیقی مستعان وہی ہے۔ باقی آلات و خدام و احباب وغیرہ سب عون الٰہی کے مظہر ہیں۔ بندہ کو چاہیے کہ اس پر نظر رکھے اور ہر چیز میں دستِ قدرت کو کارکن دیکھے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ اولیاء و انبیاء سے مدد مانگنا شرک ہے عقیدۂ باطلہ ہے۔ کیونکہ مقربانِ حق کی امداد امدادِ الٰہی ہے۔ استعانت بالغیر نہیں۔ اگر اس آیت کے وہ معنی ہوتے جو وہابیہ نے سمجھے تو قرآن پاک میں اَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ اور اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ کیوں وارد ہوتا۔ اور احادیث میں اہل اللہ سے استعانت کی تعلیم کیوں دی جاتی۔ (نوٹ: اپنے اس عقیدۂ باطلہ کے جواب دہ تو وہابیہ ہیں۔ لیکن جو استدلال یہاں استعانت بالغیر کو جائز ثابت کرنے کے لیے کام میں لایا گیا ہے وہ منطق کی اصطلاح میں منطقی مغالطے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔)

اس نوع کے اختلافات سے قطع نظر دیکھا جائے تو یہ تفسیریں مختصر ہونے کی وجہ سے عوام اور اوسط طبقے کے لوگوں کے لیے بے حد مفید ہیں۔ زیادہ تفصیلی تفسیروں کو افسوس ہے چند ہی پڑھتے ہیں اس لیے کہ لمبی چوڑی تحقیقیں عام قاری کے لیے عموماً قابلِ فہم نہیں ہوتیں۔ وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور یا تو پھر اکثر بیچ ہی میں چھوڑ دیتا ہے یا ان سے بغیر سمجھے ہوئے سرسری طور پر گزر جاتا ہے۔ نتیجہ دونوں حالتوں میں مایوس کن ہوتا ہے۔

ذیل میں سورۃ العصر کا ترجمہ اور دونوں مترجموں کی تفسیر پیش کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

(۳۰-۱۵۳)

ترجمہ: اس زمانہ محبوب کی قسم بیشک آدمی ضرور نقصان میں ہے۔ مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔

مولانا سید محمد نعیم الدین صاحب اس سورۃ کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تفسیر: سورۃ والعصر جمہور کے نزدیک مکیہ ہے۔ اس میں ایک رکوع تین آیتیں، چودہ کلمے اور اڑسٹھ حروف ہیں۔ عصر زمانہ کو کہتے ہیں اور زمانہ چونکہ عجائبات پر مشتمل ہے۔ اس میں احوال کا تغیر و تبدل ناظر کے لیے عبرت کا سبب ہوتا ہے۔ اور یہ چیزیں خالق حکیم کی قدرت و حکمت اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ زمانہ کی قسم مراد ہو اور عصر اس وقت کو بھی کہتے ہیں جو غروب سے قبل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خاسر کے حق میں اس وقت کی قسم یاد فرمائی جائے، جیسا کہ صالح کے حق میں الضحیٰ یعنی چاشت کی قسم ذکر فرمائی گئی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ عصر سے نماز عصر مراد ہو سکتی ہے جو دن کی عبادتوں میں سب سے پچھلی عبادت ہے اور سب سے لذیذ راجح تفسیر وہی ہے جو حضرت مترجم قدس سرہٗ نے اختیار فرمائی کہ زمانہ سے مخصوص زمانہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مراد ہے جو بڑی خیر و برکت کا زمانہ اور تمام زمانوں میں سب سے زیادہ فضیلت اور شرف والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور کے زمانہ مبارک کی قسم

یاد فرمائی ہے۔ جیسا کہ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ میں حضور کے
مسکن و مکان کی قسم یاد فرمائی ہے۔ اور جیسا کہ لَعَمْرُكَ میں
آپ کی عمر شریف کی قسم یاد فرمائی۔ اور اس میں شانِ محبوبیت کا
اظہار ہے کہ اس کی عمر جو اس کا راس المال ہے اور اصل پونجی ہے
وہ ہر دم گھٹ رہا ہے۔ حق کی تاکید سے مراد ہے ایمان و عمل صالح۔
ان تکلیفوں اور مشقتوں پر جو دین کی راہ میں پیش آئیں۔ یہ لوگ
بفضلِ الٰہی ٹوٹے میں نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کی جتنی عمر گزری، نیکی
اور طاعت میں گزری۔ تو وہ نفع پانے والے ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب اس سورۃ کا شانِ نزول یہ بتاتے ہیں کہ:
"ایک دفعہ کلدہ بن امیہ حضرت ابوبکر صدیق سے بولا کہ تم تو تجارتی
کاروبار میں بہت ہوشیار تھے۔ تم نے یہ کیا خسارہ اٹھایا کہ اسلام
لاکر امیروں کی دوستی کے عوض غریبوں کی محبت چند معبودوں
کے مقابل ایک اللہ کی عبادت قبول کی۔ حضرت صدیق نے فرمایا
کہ مومن مستقل نقصان میں نہیں رہتا۔ تب حضرت صدیق کی تائید
میں یہ سورۃ نازل ہوئی (عزیزی) لہٰذا یہ سورت صدیق اکبر کے
فضائل میں سے ہے۔ اس کے بعد لفظ "عصر" پر بحث کرکے
اس کی قسم کھانے کی وجہ بتائی گئی ہے۔ پھر اس چیز کی تشریح کی گئی ہے۔
کہ انسان کو خسارے میں کیوں کہا گیا ہے۔ لیکن جن کے ایمان قوی ہیں
اور اعمال صالح وہ اس خسارے سے محفوظ ہیں"۔ پھر فرماتے ہیں:
"اس سے چند مسئلے معلوم ہوئے کہ ایمان اعمال پر مقدم ہے۔ بغیر
ایمان کوئی نیکی مقبول نہیں .... دوسرے یہ کہ کوئی مومن ہمیشہ
ٹوٹے میں نہیں رہتا ..... تیسرے یہ کہ مومن ہر قسم کی نیکیاں کرے جیسا کہ

صالحات کے عموم سے معلوم ہوا .... جو مجھے یہ کہ اپنی شخصی نیکیاں
کرو جیسا کہ عمل صالح کے اطلاق سے معلوم ہوا .... وہ شخص بھی
اس خسارے سے محفوظ ہے جس نے ایمان و نیک اعمال کا ہر کسی کو
تاکیدی حکم دیا اور صبر یعنی نفس کو شرعی حدیں توڑنے سے باز
رکھا اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کی۔"

فیوض القرآن

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی

یہ تفسیر ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی نے مرتب کی ہے۔ اللہ کی شان دیکھو جس سے
جو چاہے کام لے لے۔ ڈاکٹر صاحب اردو زبان و ادب کے فاضل، اور کلام اللہ
کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ حالانکہ سچ پوچھیے تو علمائے دین میں بھی یہ سعادت کسی کسی
ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کو توفیق خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی تمنا
اکثر لوگ کیا کرتے ہیں۔ مگر یہ دولت اس کو ملتی ہے کہ جو جس کے مقدر میں ہو۔

بہرحال یہ ڈاکٹر صاحب کا بڑا اچھا کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی اپنے وطن بلگرام میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم
الہ آباد یونیورسٹی میں حاصل کی۔ پروفیسر وقار عظیم اور پروفیسر احتشام حسین کے
ساتھیوں اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے شاگردوں میں تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین
اپنی مشہور و مقبول کتاب "مختصر تاریخ ادب اردو" کے دیباچہ (طبع حال)
میں لکھتے ہیں:

"میرے چند عزیز شاگرد (جن کو اب دوست بھی سمجھنا چاہیے)
اس تصنیف میں ہر وقت میرا ہاتھ نہایت خوشی کے ساتھ بٹاتے
رہے۔ سید حامد حسن صاحب بلگرامی ایم اے، سید وقار عظیم صاحب ایم اے،

ریسرچ اسسٹنٹ اور سید احتشام حسین صاحب بی اے جس محنت و محبت کے ساتھ اس کتاب کے لیے جاں فشانی اٹھاتے رہے وہ صرف قابلِ قدر ہی نہیں بلکہ میرے لیے مایۂ ناز بھی ہے۔ ان کی سعادت مندی و قابلیت اور ادبی شغف کو دیکھ کر بے ساختہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدا ہر استاد کو ایسے شاگرد نصیب کرے۔ ان لوگوں نے نہ صرف پروف ہی پڑھا بلکہ مواد بھی اکٹھا کیا۔ اور جا بجا مضمون بھی ترتیب دیے۔ ان تمام باتوں کا احساس خود اپنی جگہ پر ایک شکریہ ہے۔ اب میں ان کی خاطر سے اگر شکریہ یا اس قبیل کا کوئی لفظ نہ بھی استعمال کروں تو پڑھنے والے میرا مطلب خود سمجھ لیں گے۔[1]

بہر حال ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی اور سید وقار عظیم دونوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے درجہ اول میں ایم اے پاس کیا۔ اس کے بعد بلگرامی صاحب ڈی اے وی کالج دہرہ دون میں اردو کے لکچرر ہو گئے۔ وہاں کافی مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔ پھر ڈون اسکول دہرہ دون میں ٹیچر اور ہاؤس ماسٹر متعین ہوئے۔ اور ۱۹۴۸ء تک اسی حیثیت میں کام کرتے رہے۔ اسی دوران الٰہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

۱۹۴۸ء کے بعد افریقین اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات و شعبۂ ثقافت ہند و پاک اور سیلون سے اور اورینٹل اسکول میں لکچرر رہے۔ ۱۹۵۳ء میں لوٹ کر پاکستان آ گئے اور پلاننگ کمیشن حکومت پاکستان کے ڈپٹی چیف آف ایجوکیشن اور سربراہ رہے۔ ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ کی اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین ایم اے ڈی لٹ صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی۔ ناشر اردو اکیڈمی سندھ تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۱ء صفحات ۹-۱۰

کا نظم و نسق سنبھالا۔ لیکن ایک سال بعد جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے رئیس الجامعہ (وائس چانسلر) مقرر ہو گئے۔ جہاں ۱۹۷۹ء تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۸۷ء سے ۱۹۸۸ء تک ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشن کے ڈائریکٹر اور اس کے بعد بیورو آف اسلامک ریسرچ و پبلیکیشن کے چیف رہے۔ کئی سال پبلک اسکول حیدرآباد کے سربراہ کی حیثیت سے کام کیا اور اسکول کی تنظیم کی۔ کچھ عرصہ کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں بحیثیت پروفیسر کام کیا۔ پھر مشیر برائے عالمی مرکز اسلامی تعلیم مکہ کی حیثیت سے تعینات ہو گئے۔[1] غرض پوری زندگی نہایت فعال رہی ہے۔ اب کراچی میں قیام ہے۔

ویسے تو ڈاکٹر بلگرامی صاحب کبھی بھی دین بیزار نہیں رہے۔ ان کا انداز زندگی ہمیشہ اسلامی اور مشرقی رہا۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں جب پہلی بار حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی تو زندگی میں عظیم انقلاب رونما ہو گیا۔ خود فرماتے ہیں:

> "مولائے کریم نے پہلی بار جب ۱۹۵۰ء میں زیارت حرمین شریفین اور فریضۂ حج کی سعادت نصیب فرمائی تو آستانۂ مقدسہ دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ہی دعا ۲۹ دن زبان پر رہی کہ "اے اللہ تو مجھے دین کی سمجھ عطا فرما۔" اس دعا کی مقبولیت کا ثمرہ تھا کہ وطن واپس آنے کے بعد کچھ عرصہ بعد ۵۸ء میں ایک عالم متبحر صاحب قلب بزرگ حضرت احمد عبدالصمد صاحب قبلہ فاروقی قادری چشتی سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ پہلی ہی بات جو آپ نے فرمائی یہ تھی کہ:
>
> "انسان یا اکتساب فیض کرے یا ایصال فیض۔ اگر ان دونوں میں کچھ نہیں تو زندگی بیکار ہے۔"[2]

---

۱ تعارف قرآن (ڈاکٹر فیوض الرحمٰن) ص ۲۵۸

۲ فیوض القرآن سعید کمپنی ایڈیشن جلد پنجم ص ط

میں نے سمجھ لیا کہ اَلِف ب پڑھنے کا وقت آ گیا۔ اور انھوں نے نہایت شفقت و محبت سے پانچ سال مجھے درسِ قرآن دیا۔ جب وہ یہ فریضہ ادا کر چکے اور جو میری قسمت میں تھا مجھے مل چکا تو ۱۹۶۳ء میں نہایت سکون اور جمعیتِ خاطر کے ساتھ اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ وصال کے دو دن قبل میں ان کی خدمت میں دن بھر رہا اور نہ جانتا تھا کہ یہ شفیق استاد سے آخری ملاقات ہے۔

ان کے وصال کے تیسرے ہی دن مجھے پھر دیارِ بیکس پناہ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اب میرے مضطرب قلب کے لیے پھر تسکین کی ضرورت تھی۔ اس بار اس عزم کے ساتھ واپس کیا گیا کہ جو کچھ استادِ محترم سے ملا ہے وہ ضبطِ تحریر میں لے آؤں۔ اور یہ مشکل کام تھا لیکن جہاں حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ التفات شاملِ حال ہو وہاں کوئی مشکل نہیں رہتی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مجھے جامعہ اسلامیہ کی قربت میسر تھی۔ اور اسی علمی اور ادبی ماحول میں بحمد اللہ پانچ ہی سال میں ترجمہ و تشریح کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جامعہ کے جید علماء کرام نے مسودہ کو خود سے پڑھا اور ہر طرح میری اعانت اور حوصلہ افزائی فرمائی۔

کام ختم ہو چکا تھا لیکن دل کانپ رہا تھا کہ خدا جانے جو کچھ ضبطِ تحریر میں آیا وہ اس قابل بھی ہے کہ پیش کر سکوں۔ ایک قلبِ مضطرب کے لیے آستانۂ فیض و کرم پہ حاضری کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اسباب مہیا فرما دیے گئے اور مجھے طلب کر لیا گیا۔ الحمد للہ کیا دلجوئی کیا کرم تھا کہ اس ناچیز کو روضۂ مبارک اور منبر شریف کے درمیان روضۂ مبارک سے قریب بیٹھنے، پڑھنے اور پیش کرنے

کی سعادت سے نوازا گیا۔ مجھے خود حیرت ہے کہ کس طرح روزانہ ایک
منزل مع ترجمہ و تفسیر کے پیش کرتا، کیسے آداب کو ملحوظ رکھ کر
گھنٹوں بیٹھا رہتا اور کیسے ختم کرتا۔ ان کیفیات اور عنایات
کو بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ البتہ آٹھویں دن سر سجدہ
میں تھا اور زبان پر اس نورانی ماحول میں اپنے رب سے کیا
کہہ رہا تھا۔[1]

تفسیر کی تالیف و ترتیب کے بعد اس کی طباعت و اشاعت کا مرحلہ
تھا۔ اتنی ضخیم جلدوں کو چھپوانا بھی آسان کام نہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ
مرحلہ بھی بحسن و خوبی طے کرا دیا۔ پہلی بار یہ تفسیر تین جلدوں میں لاہور سے شائع
ہوئی۔ پھر الحاج محمد زکی صاحب مالک ایجوکیشنل پریس کراچی نے اپنے ان
سے دو جلدوں میں چھاپ دی اور اس طرح صوری و معنوی اعتبار سے ایک اعلیٰ
پایہ کی چیز منظر عام پر آ گئی۔ چنانچہ مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اپنے ارشادِ
گرامی میں ان خوبیوں کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"ماشاء اللہ حسن معنوی کے ساتھ حسن ظاہر سے بھی آراستہ ہے"[2]

اللہ تعالیٰ نے اس کو حسن قبول بھی عطا فرمایا۔ اور نہایت قلیل مدت میں اگلے
کئی ایڈیشن نکل گئے۔ چنانچہ اس وقت جو نسخہ سامنے ہے وہ پانچواں ایڈیشن
ہے۔ جو جمادی الآخر ۱۴۰۷ھ مطابق فروری ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا۔

"فیوض القرآن" نہ صرف ان نوٹس کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر بلگرامی صاحب
نے اپنے استاد احمد عبد الصمد صاحب فاروقی، قادری، چشتی کے درس کا

---

۱ فیوض القرآن سعید کمپنی ایڈیشن، جلد پنجم ص (۲۱۹۶)
۲ ایضاً ص ف

روشنی میں مرتب کیے گئے بلکہ اس میں مختلف تفاسیر اور ترجموں سے بھی مواد حاصل کر کے شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حسنِ تالیف، زبان و بیان کی خوبیوں، صحتِ مضامین وغیرہ نے اردو تفاسیر میں اس کو ایک بلند مقام عطا کیا ہے۔ اس کی بعض خصوصیت کی جانب خود ڈاکٹر صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ترجمہ میں قرآن مجید کی تاثیر، اس کی معنویت و مقصد سے قریب لانے کے لیے قدیم مفسرین کے انداز پر ترجمہ کے دوران جابجا چھوٹے چھوٹے مختصر مگر قرآنی مقصود کو نہایت وضاحت سے پیش کرنے والے جملے قوسین میں لکھے گئے ہیں، جگہ جگہ اس کی مختصر اور بھرپور تشریح بھی ہے جو مستند تفاسیر پر مبنی ہے تاکہ ربطِ کلام باقی رہے۔ پڑھنے والے کی توجہ قرآن کے مطالب پر مرکوز رہے اور کلام پاک کی ترتیب و تسلسل واضح ہوتا جائے۔ اسی طرح ایک آیت اور دوسری آیت کے ربط کو بھی دو آیات کے درمیان واضح کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ہر رکوع کے شروع میں اس کی خصوصی اہمیت اور گزشتہ رکوع سے اس کے ربط کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ ہر سورہ کے شروع میں ترتیبِ قرآنی میں سورت کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ایک سورہ کا ربط دوسرے سورہ سے واضح ہو جائے"[1]

فیوض القرآن کو کئی جید علماء نے دیکھ کر پسند فرمایا اور اپنی آراء کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ حضرت مولانا پیر محمد کرم شاہ صاحب ازہری فرماتے ہیں:

---

[1] فیوض القرآن صفحہ ۷

"اس ترجمہ کا ہر جملہ موزوں، ہر فقرہ دلنشین، حشو و زوائد سے یکسر پاک، مطالب و اسرار کا جامع۔ محترم ڈاکٹر بلگرامی صاحب نے قرآن کریم کے ان حقائق کو بے نقاب کر دیا ہے جو بہت کم کسی کو اپنے ہاں اذن باریابی دیتے ہیں۔ شریعت کا دامن کہیں چھوٹنے نہیں پایا اور معرفت کے ان رموز و نکات کو بیان کرنے میں کہیں بخل سے کام نہیں لیا جنھیں اب تک زمانے کے شدید تقاضے پردہ کشائی پر مجبور کر رہے تھے۔ لیکن وہ اظہار کے لیے کسی محتاط اور سلیقہ مند قلم کے منتظر تھے۔"[1]

شیخ التفسیر حضرت مولانا شمس الحق افغانی کا ارشاد گرامی ہے:

"صحت معانی کے علاوہ اندازِ بیان اور اسلوب تعبیر ایسا اختیار کیا گیا ہے جو دورِ حاضر کے لیے موزوں اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کو متاثر کرنے والا ہے اور مشکل ترین مطالب کو آسان کر دینے والا ہے۔"[2]

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

"اس ادارہ تفسیر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بلگرامی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے مستند بزرگوں کی تفسیر سے لیا ہے۔"[3]

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا ارشاد گرامی ہے:

"زبان شگفتہ، تعبیر دلکش، اسلوب جاذب، طباعت عمدہ، التعلیق

---

1 فیوض القرآن صفحہ ۴

2 ایضاً صفحہ ۳

3 ایضاً صفحہ ۵

بہت خوبصورت، نہ تشریح نہ اتنی طویل کہ طبیعت اکتا جائے نہ اتنی مختصر کہ تشنگی باقی رہے۔ اختلاف قابلِ اعتنا، نہ مسلک سلف صالحین کی عقیدے کی پابندی۔ نہ آزادی نہ آزاد خیالی[1]

نمونے کے لیے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ اور تفسیر ذیل میں درج ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ (تمام تعریفیں قولی، فعلی، حالی اللہ ہی کے لیے ہیں کہ جو کچھ ہے وہ اس کی شانِ ربوبیت کا مظہر ہے۔ ہر نعمت اور ہر چیز اور ہر کیفیت کا عطا کرنے والا وہی ہے۔ خواہ بلا واسطہ عطا فرمائے یا بالواسطہ)

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ بے حد مہربان، نہایت رحم والا (جو تعلق خالق کو مخلوق سے ہے وہ "رَحْمٰن" میں اور جو مخصوص محبت کرنے والوں سے ہے وہ "رَحِیْم" میں مضمر ہے۔ رحمٰن دنیا اور رحیم آخرت میں یا ہر دو صیغے مبالغے پر دال ہیں۔ ہر دو جگہ اس کی رحمت کا ذکر ہے۔ اس کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے)

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ (وہی) روزِ جزا کا مالک ہے (تجلیات کے دن کا مالک ہے۔ "لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّارِ" اسی دن کے لیے ہے۔ وہاں اللہ ہی اللہ ہے)۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ (اے اللہ) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ (تو ہمارا رب ہے ہم تیرے بندے ہیں۔ تیرے فرمانبردار ہیں، تیری مدد کے خواستگار ہیں۔ اللہ کی رحمانیت و رحیمیت دیکھو کہ بندے کو سکھا رہا ہے کہ تو جتلا کہ ہم تیری عبادت

---

[1] فیوض القرآن صفحہ ص

کرتے ہیں۔ اپنی قابلیت ایمان کو جتلا۔ اسی کو تقویت دے۔ دونوں "نَعۡبُدُ" و "نَسۡتَعِيۡنُ" کا اصل مانگ۔

اس آیت میں "نَعۡبُدُكَ و نَسۡتَعِيۡنُكَ" کی جگہ "اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ" (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔) کہہ کر شرک کی جڑ ہی کاٹ دی گئی ہے۔ ترجمہ میں تو دونوں جگہ "ہی" کا اضافہ کر کے اس نکتہ کو واضح کر دیا گیا ہے لیکن تفسیر میں بیان میں اتنا زور پیدا نہیں ہو سکا اس کی طرف قارئین کو خاص طور پر متوجہ کرنا ضروری تھا۔

تفسیر جواہر القرآن[1]

از

مولانا حسین علیؒ

تفسیر "جواہر القرآن" دراصل حضرت مولانا حسین علیؒ المتوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء کے تفسیری نکات پر مشتمل قرآنی معارف اور تفسیری فوائد کا بیش بہا خزینہ ہے۔ جس کی ترتیب و تدوین کا کام ان کے تلمیذ خاص حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ صاحب نے ابو احمد سجاد بخاری صاحب کی مدد سے انجام دیا۔

حضرت مولانا حسین علیؒ کا تعلق ضلع میانوالی کے ایک گاؤں واں بھچراں سے تھا۔ انھوں نے اپنے آبائی گاؤں سے چار میل دور اپنی زرعی زمین پر فروکش ہو کر زندگی بھر کھیتی باڑی کا کام کیا اور اسی کو اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے ذریعہ معاش بنایا۔ عمر بھر کسی نے ایک پائی کا سوال نہیں کیا اور ساٹھ برس تک جنگل میں رہ کر توحید و سنت اور علوم دین کی لوجہ اللہ اشاعت

---

[1] تفسیر جواہر القرآن۔ افادات حضرت مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ۔ شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان رحمۃ اللہ۔ شائع کردہ کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ مارکیٹ۔ راولپنڈی۔ ۱۳۹۹ھ

تک اور دم آخر تک یہ چشمۂ فیض جاری رہا۔

حضرت مولانا حسین علیؒ علم قرآن میں صرف تین واسطوں سے حضرت الامام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ المتوفی (۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی (ف ۱۳۰۲ھ) سے فیض حاصل کیا تھا۔ وہ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ (ف ۱۲۶۲ھ) کے تلمیذ تھے اور شاہ صاحب اپنے نانا حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۲۳۹ھ) کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے علمی مرتبہ اور دینی خدمات سے کون واقف نہیں ہے۔ آج برصغیر میں دینی علوم خصوصاً علوم قرآنی، حدیث و تفسیر کی جو سلسبیل جاری ہے وہ کلیتاً ان ہی دونوں بزرگوں کا فیضان ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے قرآنی علوم و معارف حضرت مولانا حسین علی صاحب کو اپنے شیوخ کے وساطت سے وراثت میں ملے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت اور فہم و فراست کو کام میں لاکر بہت کچھ حاصل کیا۔ انھوں نے اکل حلال اور صدق مقال کو اپنا شعار بنایا اور اتباع شریعت اور تقویٰ کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر قرآنی اسرار و رموز کی مزید راہیں کھول دیں اور قرآن فہمی میں ان کو ایسی بصیرت اور ایسا ملکہ عطا فرمایا جو ان کے کسی معاصر کو حاصل نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے حضرت مولانا حسین علیؒ کو قرآن کی معنوی تحریف کے اس دور میں محض قرآن کی خدمت و حمایت کے لیے پیدا فرمایا تھا۔ جن باتوں کا وہ تفسیر میں خاص خیال فرماتے تھے ان میں سے چند ذیل میں درج ہیں۔

(۱) ہر سورت کا ایک محور اور مرکزی موضوع ہوتا ہے اور سورت کی باقی آیات بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے گرد گھومتی ہیں۔

(۲) سورتوں کی ترتیب اتفاقی یا اجتہادی نہیں بلکہ توقیفی ہے اور ہر سورت اپنے ماقبل و مابعد کے ساتھ باقاعدہ مربوط ہے۔ اسی طرح ہر سورت کی آیات بھی سلسلۂ نظم و ضبط میں منسلک ہیں۔

(۳) آیات کا وہی مفہوم راجح ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم سے بسند صحیح منقول ہو۔

(۴) حتی المقدور آیت کا ایسا مطلب بیان کیا جائے جس میں حذف و تقدیر کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

(۵) حتی الوسع آیت کا ایسا مفہوم بیان کیا جائے جس پر سرے سے کوئی خارجی اعتراض اور شبہ وارد ہی نہ ہو۔

حضرت مولانا حسین علی کا سب سے زیادہ زور توحید پر ہے۔ وہ اس معاملہ میں کسی اونچ نیچ یا مداہنت کے قطعی روادار نہیں تھے۔ شرک و بدعت کے خلاف تیغ بے نیام تھے۔ اس وقت جبکہ ان کے اردگرد پیروں سجادہ نشینوں اور بدعتیوں کا زور تھا اور بہت کم لوگوں کو ان کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت ہوتی تھی، انھوں نے نہایت دلیری سے ان سب کا مقابلہ کیا، نتیجہ یہ کہ وہ نہ صرف شدت پسند مشہور ہو گئے بلکہ وہابی کے لقب سے نوازے گئے۔ لیکن انھوں نے کسی کی پروا نہیں کی اور اعلانیہ ان سب کی مخالفت کی۔ ان کی تفسیر میں بھی سب سے زیادہ زور توحید پر ہے جس کی وجہ سے جہاں اہل بدعت اور پیر پرست ان کی مخالفت پر کمربستہ رہے، وہاں علمائے حق نے ان کی تعظیم و تکریم میں کوتاہی نہیں کی۔ بلکہ دل کھول کر آپ کے کاموں کی تعریف کی اور آپ کی حق پرستی کو سراہا۔ چنانچہ ایک وقت مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوری نے فرمایا:

"حضرت مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت بلند پایہ الہامی

تھے۔ وہ فنا فی التوحید تھے اور قرآن مجید کے حرکات و سکنات سے بھی اللہ تعالیٰ کی توحید ثابت کرتے تھے۔"

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے صاحبزادے اور جانشین مولانا عبید اللہ انورؒ ایک مرتبہ مری جاتے ہوئے دارالعلوم راولپنڈی میں تھوڑی دیر کے لیے تشریف لائے تو انھوں نے اپنے والد بزرگوار کا یہ قول بیان فرمایا:

"انجمن خدام الدین کے جلسوں میں میں دیگر علمائے کرام کو اس لیے بلاتا ہوں تاکہ عوام ان سے مستفید ہوں لیکن حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور مولانا حسین علیؒ کو اس لیے بلاتا ہوں تاکہ علمائے کرام ان سے استفادہ کریں۔"

چونکہ حضرت مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ کا پورا زور توحید پر تھا اور شرک جلی یا خفی کو وہ کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تفسیر کا انداز دکھانے کے لیے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی جو تفسیر انھوں نے بیان کی ہے اس کا کچھ حصہ یہاں پیش کر دیا جائے۔ لکھتے ہیں:

تفسیر: سورۂ فاتحہ میں یہ آیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں اِیَّاکَ مفعول کو نَعْبُدُ فعل پر مقدم کیا گیا ہے تاکہ حصر کا فائدہ دے اور مطلب یہ ہو کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے اور اس کے سوا کسی پیغمبر، فرشتہ یا ولی کی عبادت اور پکار نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہ سارے خود اللہ کے حکم سے اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی طرح اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں فائدہ حصر کے لیے مفعول کو فعل پر مقدم کیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ

مدد صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیے۔ اور اس کے سوا کسی پیر یا پیغمبر سے اور کسی فرشتہ یا ولی سے مافوق الاسباب امور میں مدد نہیں مانگنی چاہیے۔ امام ابن کثیر بعض بزرگوں سے نقل فرماتے ہیں کہ سارے قرآن کا مرکزی حصہ سورہ فاتحہ ہے۔ اور سورہ فاتحہ کا مرکزی حصہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہے وہ لکھتے ہیں: اَلْفَاتِحَۃُ سِرُّ الْقُرْاٰنِ وَسِرُّھَا ھٰذِہِ الْکَلِمَۃُ (اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ)۔ (ابن کثیر ص ۲۵ جلد ۱)

حضرت مولانا حسین علی کا ارشاد ہے کہ عبادت کے مفہوم میں دو چیزیں داخل ہیں ایک غایت تذلل یعنی انتہائی عاجزی اور ذلت دوم غایت تعظیم لیکن اس اعتقاد اور شعور کے ساتھ کہ معبود کو مافوق الاسباب تصرف اور قدرت حاصل ہے جس سے وہ نفع نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کیونکہ معبود صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں دو صفتیں موجود ہوں (۱) یہ کہ وہ عالم الغیب ہو، کائنات کا ذرہ ذرہ اس پر منکشف ہو اور زمین و آسمان کی ساری مخلوق کے ظاہر و باطن و سر و اعلانیہ کو وہ اچھی طرح جانتا ہو (۲) یہ کہ وہ مالک و مختار متصرف فی الامور اور اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں اپنے لیے استحقاق عبادت کو بیان کر ذکر فرمایا ہے وہاں اپنی انہی دونوں صفتوں کو اس کی علت قرار دیا ہے۔ اور جہاں کہیں غیر اللہ سے عبادت و پکار کی نفی کی ہے وہاں غیر سے دونوں صفتوں کی نفی فرمائی ہے۔ کہیں دونوں صفتوں کی نفی ہے اور کہیں صرف ایک کی۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے وَرَبُّکَ یَخْلُقُ ..... اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (قصص ع ۷ تا ۷۰)

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ یہاں بھی مفعول کو فعل پر اسی لیے مقدم کیا تاکہ حصر کا فائدہ حاصل ہو۔ مطلب یہ کہ جس طرح عبادت صرف اللہ ہی کے لیے

ہونی چاہیے اسی طرح استعانت (مدد طلب کرنا) بھی صرف اسی سے ہونا چاہیے۔ نہ کسی اور سے۔ استعانت (یعنی حاجات و مشکلات میں پکارنا اور مدد مانگنا) چونکہ عبادت کی سب سے بڑی اور اہم شاخ ہے اس لیے عبادت کے بعد خصوصیت سے اس کا ذکر فرمایا۔ ہر آدمی جو کسی معبود کی عبادت کرتا ہے دنیوی زندگی کے اعتبار سے اس کی عبادت کا مقصد اور لب لباب یہی ہوتا ہے کہ اس کی تمام حاجتیں پوری ہو جائیں اور اس کی تمام مشکلیں آسان ہو جائیں۔ اسی لیے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعا (پکار) عبادت کا مغز اور لب لباب ہے۔ اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ۔ یعنی پکارنا ہی اصل عبادت ہے۔ قرآن مجید میں بھی لفظ عبادت بمعنی دعا اور پکار وارد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ۔ المومن ع ۶ آ ۶۰

تفسیری حاشیہ قرآن[1]

مولانا احمد علی لاہوری

یہ حاشیہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر کیا ہے۔

اردو زبان میں قرآن کریم کی تفسیر لکھنے والوں کی برصغیر میں ایک بڑی جماعت دکھائی دیتی ہے لیکن یہ اعزاز صرف ان ہی کو حاصل ہے کہ مفسر ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔

مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے قرآنی تعلیم اتنے بڑے

۱۔ اَلْقُرْآنُ الْحَكِیْمُ مع تفسیری حاشیہ۔ مترجم و محشی سنہ ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) شائع کردہ ناظم شعبہ تالیف و اشاعت انجمن خدام الدین۔ دروازہ شیرانوالہ۔ لاہور۔

پیدا نہیں ہوئی کہ برصغیر کا کوئی گوشہ ان کے فیض سے محروم اور خالی نہیں رہا۔
۲ رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۸۸۷ء کو جمعہ کے دن شہر
جلال ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ والد محترم کا اسم گرامی شیخ حبیب اللہ تھا
جو سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے۔

حضرت مولانا احمد علیؒ نے مولانا عبدالحق اور مولانا عبید اللہ سندھی سے
دینی تعلیم حاصل کی۔ جب تعلیم سے فارغ ہو گئے تو مولانا عبید اللہ سندھی
ان کو اپنے ہمراہ دہلی لے گئے اور وہاں اپنی جانشینی کی سند عطا کی۔ ۱۹۱۷ء میں
دہلی سے واپسی ہوئی تو بیرون شیرانوالہ میں سکونت پذیر ہو گئے اور مسجد
سبحان خاں میں درس قرآن شروع کیا۔ ۱۹۲۱ء میں ہجرت کر کے کابل چلے گئے
لیکن کچھ عرصہ بعد وہاں سے واپس آ گئے اور پھر درس و تدریس میں مصروف
ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں انجمن خدام الدین کی بنیاد رکھی اور ۱۹۲۴ء میں مدرسہ
قاسم العلوم قائم کیا۔

قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو وہ
ملکہ عطا کیا تھا کہ نہ صرف برصغیر کے مختلف حصوں سے بلکہ بیرونی ممالک سے
طلبہ فیض حاصل کرنے کے لیے لاہور آتے تھے۔ یہاں تک کہ دارالعلوم
دیوبند سے فراغت کے بعد علماء مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور
ماہ رمضان میں دورۂ تفسیر پڑھ کر سند حاصل کرتے۔ تقریباً چار پانچ
ہزار طلبہ اور علماء نے حضرت مولانا سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ درس و تدریس
اور اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ انھوں نے جنگ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ
کر حصہ لیا اور اس سلسلہ میں سات مرتبہ قید فرنگ کی صعوبات برداشت
کیں۔ ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء کو داعی اجل
کو لبیک کہا۔

حضرت مولانا احمد علیؒ کا شمار علماء حق کے علاوہ شیوخ طریقت میں بھی ہوتا ہے۔ وہ علم و حکمت کے بلند مقام پر فائز تھے۔ اس کے باوجود سادگی و فروتنی کا ایک ایسا نمونہ تھے کہ کسی کو بھی آپ کے مرتبہ عالی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اسی سادگی کی وجہ سے ایک مرتبہ مولانا اشرف علی تھانوی بھی آپ کو پہچاننے میں دھوکا کھا گئے۔

واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت مولانا پہلی دفعہ مولانا اشرف علیؒ سے ملاقات کرنے کے لیے تھانہ بھون گئے تو چونکہ جمعہ کا دن تھا اور ریل گاڑی تقریباً ساڑھے بارہ بجے دوپہر میں تھانہ بھون پہنچتی تھی اس لیے آپ سیدھے مسجد پیر محمد والی میں جہاں حضرت مولانا تھانوی نماز جمعہ پڑھاتے تھے، پہنچ گئے اور جماعت میں شریک ہو گئے۔ آپ کا خیال تھا کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد مسجد میں ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ نماز سے فراغت کے بعد آپ صحن مسجد میں کھڑے ہو گئے اور جب مولانا مسجد سے باہر نکلنے لگے تو آپ نے آگے بڑھ کر مصافحہ کرنا چاہا۔ مولانا تھانوی صاحب نے کبھی آپ کو دیکھا نہیں تھا اور قاعدہ قرینہ کی بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے اس لیے ذرا سخت لہجہ میں کہا "دیہاتی معلوم ہوتا ہے۔ یہ کوئی طریقہ ہے ملاقات کرنے کا۔ ادب آداب سے بالکل بے بہرہ معلوم ہوتا ہے۔" مولانا احمد علیؒ وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔ ایک صاحب نے جو مولانا تھانوی کے ساتھ تھے اور آپ کو پہچانتے تھے چپکے سے کہا کہ "یہ مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوری ہیں۔" یہ سن کر مولانا تھانوی زیر لب مسکرائے اور کہنے لگے "چلو تبلیغ ہو گئی۔" اس کے بعد نہایت تپاک سے ملاقات کی اور آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔

حضرت مولانا احمد علی کے اخلاق و عادات اور علم و فضل کی بہت سے لوگوں نے تعریف کی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری جو اپنے شہرۂ آفاق
قرآن، اصلاحِ عقائد کے عظیم الشان کام، موثر و مقبول مواعظ
اور مخلصانہ دینی خدمتوں کی بنا پر پاکستان میں مقبول عام و
خاص تھے۔ اپنے زمانہ کے بہت بڑے شیوخ طریقت میں سے
تھے۔ قوت نسبت باطنی ادراک اور روشن ضمیری میں اس زمانہ
میں بڑے بڑے لوگ آتے رہیں گے۔ مگر احمد علی کم پیدا ہوں گے۔"

ڈاکٹر قاری فیوض الرحمن تحریر فرماتے ہیں:

"شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے ۲۰ ویں
صدی میں اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ انھوں نے تفسیر قرآن
کا درس بھی دیا اور تزکیہ قلوب کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ ان کے
تلامذہ اور متعلقین پاکستان اور بیرونِ ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
اور اعلیٰ علمی و روحانی خدمات انجام دے رہے ہیں۔"

مولانا اعجاز الحق قدوسی رقمطراز ہیں:

مولانا نے سندھ و پنجاب میں جو اسلام کی خدمات انجام دیں ان میں
اشاعتِ توحید، عشقِ رسول کریم، اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم اور اصلاحِ رسوم کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔"

مولانا سید ابو الحسن ندوی کا ارشاد ہے:

"پھر یہاں لاہور آکر مولانا احمد علی صاحبؒ سے قرآن مجید پورا
پڑھا۔ یہاں جس چیز نے متاثر کیا وہ ان کی قرآنی زندگی تھی۔
جس کو قرآن ناطق کہا جاتا ہے۔ اس سے قلب میں جلا محسوس
ہوتی تھی۔ مولانا کی زاہدانہ زندگی، درویشانہ معاشرت اور
عمل بالسنت کا مجھ پر وہ اثر پڑا جس کو برکت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔"

حضرت مولانا احمد علیؒ کا ترجمہ اور محشی قرآن مجید انجمن خدام الدین لاہور کی طرف سے پہلی بار ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اب تک اسکے کئی ایڈیشن نہایت خوبصورتی سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس ترجمہ کی خصوصیات میں سے عام فہم زبان میں اردو ترجمہ، ربط آیات اور آیات و رکوع کے خلاصے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ کئی جید علماء نے اس پر شاندار تقریظیں لکھی ہیں۔ ان میں قابلِ ذکر حضرات یہ ہیں۔ امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہؒ، مولانا قاری محمد شریف لکھتے ہیں:

"یہ حاشیہ قرآن پاک کی تفسیر ہے۔ مولانا مرحوم کو تفسیر قرآن پڑھانے کا جو ملکہ حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا علماء بخوبی واقف ہیں۔ ناظرین اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر علماء مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور رمضان المبارک میں دورہ تفسیر پڑھ کر سند لے کر جاتے تھے۔"

عبدالواحد سندھی تحریر فرماتے ہیں:

"لاہور میں ایک اور انجمن ہے جس کا نام خدام الدین ہے۔ اس انجمن کا سب سے بڑا کام مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دینا ہے۔ اس انجمن نے قرآن پاک کا ایک ترجمہ اردو میں نہایت صحیح اور سلیس چھاپا ہے۔"

غرض حضرت مولانا احمد علیؒ لاہوری نے تعلیمات قرآن کی اشاعت اور اسکے مطابق عمل کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ علامہ علاؤالدین صدیقی کا یہ کہنا بجا اور درست ہے کہ:

"خدمت قرآن کے اعتبار سے اس زمانہ میں شاید کسی بزرگ نے اتنی شہرت پائی۔ استاذی کی شہرت علم و عمل، اتقاء کے عالم میں

تحلیل سے قبل

یہاں نمونے کے لیے سورۃ والضحیٰ اور سورۃ اَلَمْ نَشْرَحْ کا ترجمہ، تفسیر اور دونوں سورتوں کا ربط بیان کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اختصار کے باوجود مفسر علام نے ہر بات کو کس خوبی سے واضح کر دیا ہے۔ پہلے ترجمہ، پھر خلاصہ اور تفسیری حواشی، بعدہٗ موضح القرآن کی پیش کردہ صراحت اور پھر دونوں سورتوں کے درمیان ربط۔ ان سب باتوں کو دیکھ کر ہر قاری سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جو ہر چیز کے ماضی و مستقبل سے باخبر ہے۔ انسانی نفسیات اس سے پوشیدہ نہیں۔ اس کا کلام ایجاز و اختصار کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کلام کو اتنے اختصار کے باوجود مبہم یا ناقابلِ فہم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ معنویت و جامعیت کے ساتھ ساتھ اس میں علم و حکمت کا ایک خزانہ موجود ہے۔ جو ان کو ملتا ہے جن کو اس کی طلب اور تلاش ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ آیات اور سورتوں میں بے ربطی نہیں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام سورتیں موتیوں کی لڑیاں ہیں جو ایک دوسرے سے نہایت مضبوطی سے جڑی ہوئی ہیں۔ اب ان تمام خوبیوں کا جلوہ ان دو سورتوں میں دیکھیے۔

جو باتیں ان سورتوں میں بیان کی گئی ہیں ان کی بنیاد فترتِ وحی ہے۔ چند روز تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا سلسلہ منقطع ہوا تو کفار نے لعن و تشنیع شروع کر دی اور کہنے لگے کہ "دیکھ لیا، ان کی پیغمبری کا سلسلہ ختم ہوا۔ اب اللہ نے بھی ان کو چھوڑ دیا۔" آپ اسی قدر دل گرفتہ ہوئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ .... وَاَمَّا بِنِعْمَةِ
رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝ (۳۰ — ۹۳)

ترجمہ: قسم دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جاوے

نہ رخصت کیا تجھ کو تیرے رب نے۔ نہ بیزار ہوا ف ۱ جگہ دی ف ۲ اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ دی ف ۳ اور پایا تجھ کو مفلس، پھر محفوظ کیا ف ۴ سو جو یتیم ہو اس کو مت دبا۔ اور جو مانگتا ہو اس کو مت جھڑک۔ اور جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر۔

خلاصہ: زمانۂ فَتْرَةُ الْوَحْی فوائد ایمانیہ کے لیے موجبِ تکمیل ہے۔ ماخذ۔ آیت ۱، ۲، ۳، ۴۔

تفسیری حاشیہ: (۱، ۲) یہ چیزیں (یعنی دھوپ چڑھنے وقت کی اور رات) اس امر پر گواہ ہیں (۳) کہ آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ بیزار ہی ہوا ہے۔ (۴) وحی بند ہونے کے بعد دوبارہ جب وحی نازل ہوگی تو (وہ حالت) آپ کے لیے پہلے سے بہتر ہوگی۔ (۵) آپ کو اللہ تعالیٰ اجر عطا فرمائے گا تب آپ بڑے خوش ہوں گے۔ (۶ تا ۸) کیا ان مصائب میں اللہ تعالیٰ نے پہلے کبھی آپ کا ساتھ چھوڑا (ہرگز نہیں)۔ (۹، ۱۰) فترۃ الوحی کے وقت ان مساکین کی خدمت کیجیے۔ واللہ عالم (۱۱) اور نعمت رب (یعنی قرآن) انہیں پڑھ سنائیے۔ واللہ عالم۔

موضح القرآن: ف ۱ حضرت کو کئی دن وحی نہ آئی۔ دل تنگ رہا۔ تہجد کو نہ اٹھے۔ کافروں نے کہا۔ اس کو چھوڑ دیا اس کے رب نے۔ تب یہ نازل ہوا۔ پہلے قسم فرمائی دھوپ روشن کی اور رات اندھیری کی۔ یعنی ظاہر میں بھی اللہ کی دو قدرتیں ہیں اور باطن میں بھی۔ کبھی چاندنا ہے کبھی اندھیرا ہے۔ دونوں اللہ کے ہیں۔ اللہ سے دور کبھی نہیں۔ ف ۲ حضرت کا باپ مر گیا۔ پیٹ میں چھوڑ کر۔ دادے

پالا۔ وہ مرگیا آٹھ برس کا چھوڑ کر۔ چچا نے پالا جب تک جوان ہوئے۔
ف ۳ جب حضرت جوان ہوئے قوم کی رسم و راہ سے بیزار تھے۔ اور اپنے پاس کوئی رسم و راہ نہ تھی۔ اللہ نے دینِ حق نازل کیا۔
ف ۴ حضرت خدیجہ اپنی قوم میں اشرف تھیں اور مالدار۔ ان سے نکاح ہوا۔ سب مال انھوں نے حاضر کیا۔

ربطِ آیات۔ سُوْرَةُ الْاِنْشِرَاح۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ...... وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

(۹۴ - ۳۰)

ترجمہ: کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ ...... اور اپنے رب کی طرف دل لگا۔

تفسیرِ حاشیہ: (۱) اللہ تعالیٰ آپ سے (خدانخواستہ) بیزار کیسے ہو۔ بلکہ اس نے تو آپ کو شرحِ صدر عطا فرمائی ہے (۲ و ۳) اور علاوہ اس کے یہ انعام بھی کیا کہ اصلاحِ امت کے لیے جس قابلیت کی ضرورت تھی وہ عطا فرما کر آپ کا بوجھ اتار دیا (۴) اور آپ کا ذکرِ خیر شرطِ ایمان میں سے ہے۔ (۵ و ۶) آپ نہ گھبرائیں۔ عسر کے بعد یسر لازمی ہے (۷، ۸) تبلیغِ رسالت سے فراغت کے وقت یہ کام کیا کیجیے۔

ترجمان القرآن[1]

مولانا ابو الکلام آزاد

ضروری تفسیر کے ساتھ اردو زبان میں یہ قرآن حکیم کے مطالب کا مجموعہ

---

[1] ترجمان القرآن جلد اوّل (سورہ فاتحہ سے سورہ انعام تک) از مولانا ابو الکلام آزاد مقدمہ اللہ ۔ اسلامی اکادمی۔ اردو بازار۔ لاہور۔

پورا مجموعہ تین جلدوں میں منقسم ہے۔ پہلی دو جلدیں مولانا ابو الکلام آزاد کے غور و فکر کا نتیجہ ہیں جو ان کی زندگی ہی میں مرتب و مدون ہو کر منظر عام پر آچکی تھیں۔ تیسری جلد ان کے معتقدین مولانا غلام رسول مہر وغیرہ نے مولانا کا غیر مرتب و غیر مطبوعہ مواد ان کے بعد جمع کر کے ترتیب دی اور شائع کی۔ لیکن مجموعہ مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ اس تیسری جلد میں وہ بات نہیں ہے جو پہلی اور دوسری جلدوں کا وصفِ خاص ہے۔ کاش جلد سوم بھی خود مولانا شائع کر جاتے کہ پہلی دو جلدوں کی طرح یہ بھی ایک منفرد شے اردو زبان میں ہوتی۔ لیکن مولانا نے جلد اول کے شروع میں جو پیش لفظ شامل کیا ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جن حالات میں وہ یہ کام کر گئے وہ بھی کرامات اور معجزہ سے کم نہیں۔ جن سوانح اور رکاوٹوں سے دو چار ہونا پڑا وہ اتنے ہمت شکن تھے کہ اگر تائید ایزدی شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ مواد بھی ضائع ہو جاتا۔ بہر حال اب بھی جو کچھ موجود ہے وہ اردو زبان میں دینی ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ مولانا آزاد کی ہوئی آخری سپاروں بالخصوص سورہ فاتحہ کی تفسیر قرآن کریم کے مطالب و معانی کا بے بہا گنجینہ ہونے کے علاوہ ادبِ عالیہ میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اردو تفاسیر میں اس کا مقام کافی بلند ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد، رواں صدی کی نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ایک تھے۔ ۱۷ اگست ۱۸۸۸ء میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں رسم بسم اللہ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بلد الامین میں رہتے ہوئے حاصل کی۔ ۱۸۹۸ء میں ہندوستان آگئے اور اسی وقت سے شاعری کا آغاز ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں شادی ہو گئی۔ اسی سال ہفتہ وار المصباح جاری کیا۔ ۱۹۰۳ء میں درس نظامی کی تکمیل کی۔ اس کے بعد سے باقاعدہ صحافتی اور سیاسی

زندگی کا آغاز ہوا۔ اتنی کم عمر میں ان کی ان سرگرمیوں کو دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں جب انھوں نے ماہنامہ "لسان الصدق" جاری کیا تو خواجہ الطاف حسین حالی جیسے کہنہ مشق مصنف اس کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور جب ۱۹۰۴ء میں وہ مولانا آزاد سے ملے تو ان کو ابوالکلام کا بیٹا سمجھ کر ان کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ لیکن جب انھیں پتا چلا کہ وہ خود ابوالکلام آزاد ہیں تو انھیں یقین نہ آیا۔ اسی طرح مولانا شبلی کے ساتھ ہوا۔ ان سے خط و کتابت تو ۱۹۰۲ء سے جاری تھی۔ لیکن پہلی مرتبہ ملاقات ۱۹۰۴ء میں بمبئی میں ہوئی۔ مولانا شبلی نے بھی یہی سمجھا کہ یہ ابوالکلام آزاد کے بیٹے ہیں۔ چنانچہ کہنے لگے "آپ کے باپ کے فضل و کمال کے کیا کہنے ہیں" مگر جب پتہ چلا کہ یہ خود ابوالکلام ہیں تو حیران رہ گئے۔[1]

۱۹۱۲ء میں الہلال جاری ہوا تو پورے ملک میں مولانا کی دھاک بیٹھ گئی۔ ۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کے بعد الہلال بند ہو گیا اور ۱۹۱۵ء میں "البلاغ" جاری ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں حکومت کے خلاف مضامین لکھنے کی وجہ سے مولانا کو بنگال سے نکال دیا گیا اور "البلاغ" بھی بند کر دیا گیا۔ مولانا رانچی چلے گئے اور وہیں نظربند ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی سرگرمیاں اتنی بڑھیں کہ کئی مرتبہ وہ اسیر فرنگ رہے۔ آخری مرتبہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء کے آخر تک احمد نگر کے قلعہ میں قید رہے۔ کبھی یار انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ آزادیِ ہند کے بعد وہ بھارت کی کابینہ میں بحیثیت وزیر تعلیم کام کرتے رہے۔ آخر کار ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور جامع مسجد دہلی کے سامنے اردو پارک میں دفن ہوئے۔

---

[1] غبارِ خاطر، مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ۔ ۱۳۲ اے۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ صفحات ۲۸۔۳۰

مولانا ابو الکلام آزاد کو قدرت نے دل و دماغ کی جو خوبیاں اور صلاحیتیں عطا کی تھیں وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ علم و ادب کا کون سا گوشہ تھا جو آپ کی دسترس سے باہر تھا۔ تمام علوم سے قطع نظر اگر ان کی قرآن فہمی کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا تھا کہ وہ اس بحر ناپیدا کنار کے بھی بڑے اچھے شناور تھے۔ ساتھ ہی انھیں اردو تحریر پر بھی بڑی قدرت تھی۔ اپنی ان دونوں صلاحیتوں سے کام لے کر انھوں نے قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کرنے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ اس کا آغاز انھوں نے ۱۹۱۳ء میں کر دیا تھا لیکن ان کے اس ارادہ نے ۱۹۳۰ء میں عملی جامہ پہنا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

"۱۹۱۳ء میں جب "البلاغ" کے صفحات پر ترجمان القرآن اور تفسیر البیان کا اعلان کیا گیا تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک ایسے کام کا اعلان کر رہا ہوں جو سترہ برس تک التوا و انتظار کی حالت میں معلق رہے گا۔ اور جو ملک کے شوق و انتظار کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ اور میرے ارادوں کی ناکامیوں کے لیے ایک درد انگیز مثال ثابت ہوگا۔"

لیکن واقعات کی رفتار نے بہت جلد بتلا دیا کہ صورت حال ایسی ہی تھی۔ لکھتے ہیں:

"۱۹۱۵ء میں جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا تو بہ یک وقت تین چیزیں پیش نظر تھیں۔ ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ۔ تفسیر میں میں نے خیال کیا تھا کہ یہ تین کتابیں قرآن کے فہم و مطالعہ کی تین مختلف صورتیں پوری کریں گی۔ عام تعلیم کے لیے ترجمہ، مطالعہ کے لیے تفسیر، اہل علم و نظر کے لیے مقدمہ۔

"البلاغ میں جب ترجمہ اور تفسیر کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے تو ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا۔ تفسیر سورہ آل عمران تک مکمل ہو چکی تھی۔ اور مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلمبند تھا۔ اس خیال سے کہ تھوڑے وقت کے اندر زیادہ سے

زیادہ کام انجام پا جائے۔ میں نے تحقیق کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح سال بھر کے اندر ترجمہ مکمل بھی ہو جائے گا اور چھپ بھی جائے گا۔ نیز تفسیر کی بھی کم از کم پہلی جلد شائع ہو جائے گی۔ ہر سات دن کی مشغولیت میں نے یوں تقسیم کر دی تھی کہ تین دن البلاغ کی ترتیب میں صرف کرتا تھا۔ دو دن ترجمے میں اور دو دن تفسیر میں۔[1]

بہر حال اس وقت کی مہربان حکومت کی درا ندازیوں کی بدولت یہ ڈیڑھ سال کی مدت اسی طرح گزر گئی۔ اور خدا خدا کر کے ۱۹۳۰ء میں پہلی جلد شائع ہو سکی۔ اس سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں:

"بہر حال کام شروع ہو گیا۔ اور اس خیال سے کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ترجمہ کے لیے بھی ضروری تھی۔ سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر ترجمہ کی ترتیب شروع کی۔ حالات اب بھی موافق نہ تھے۔ صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ سیاسی مشغولیت کی آلودگیاں بدستور خلل انداز تھیں۔ تاہم کام کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا۔ اور ۲ جولائی ۱۹۳۰ء کو آخری سورت کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہو گیا۔"

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم[2]

ویسے تو مولانا کا کیا ہوا تمام ہی ترجمہ و تفسیر زبان و بیان اور صحت کے لحاظ سے گرانقدر ہے۔ تاہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر اپنی ادبی لطافتوں کی وجہ سے اردو زبان کا ادب پارہ اور خاصے کی چیز ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مولانا نے آیت

1۔ ترجمان القرآن جلد اول صفحات ۳۰۳

2۔ ترجمان القرآن جلد اول ص ۱۸

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ ایمان میں پختگی پیدا کرنے اور توحید پر یقین کو کمال تک پہنچانے میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ البتہ مختصر ترجمہ اور تشریح میں اس کو شامل کیا ہے اور چند الفاظ میں اس آیت کی روح پیش کر دی ہے۔ یہاں نمونہ کے لیے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔۔۔۔۔۔۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ (۱-۷)

(ترجمہ و تشریح) ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے۔ جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے۔ جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا۔ خدایا! ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے اپنی ساری احتیاجوں میں مدد مانگتے ہیں۔ (خدایا!) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے۔ وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا۔ ان کی نہیں، جو پھٹکارے گئے۔ اور نہ ان کی جو راہ سے بھٹک گئے[1]

تفہیم القرآن[2]

سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ تفسیر جو چھ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی لکھی ہوئی ہے۔ کچھ لوگ اس کے مداح ہیں اور کچھ سخت مخالف۔ جو مداح

---

[1] ترجمان القرآن جلد اول ص ۲۲۶

[2] تفہیم القرآن جلد اول تا ششم، مکتبہ تعمیر انسانیت۔ لاہور

ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر موجودہ دور کے انسانوں کے اعتراضات دور کرنے اور ان کو مطمئن کرنے کے لیے جدید انداز سے لکھی گئی ہے اور اس لیے جدید نسل کو [illegible] اپیل کرتی ہے۔ جو مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ مولانا مودودی کسی دارالعلوم کے فارغ التحصیل نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ وہ عربی کے مزاج سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں اور نہ ان کا اپنا مزاج دینی ہے۔ اسی لیے انھوں نے علمائے دین اور سلف صالحین کی روش سے ہٹ کر اور جدت پسندی کو کام میں لاکر اپنی رائے سے یہ تفسیر لکھی ہے۔ اسی لیے دین کی روح سے خالی ہے۔ ایسی صورت میں کسی غیر جانبدار کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں کن لوگوں کی رائے صحیح ہے۔ ہر چیز کے دو رخ ہوتے ہیں۔ یہ کلیہ اس معاملے میں بھی کارفرما ہے۔ لہٰذا یہی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں فریق اپنے اپنے نقطۂ نظر سے صحیح ہیں۔ حق کس طرف ہے اس کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔

اس تفسیر کے محرکات کو جاننے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجمل طور پر مفسر کے حالات زندگی بیان کیے جائیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کا جدی وطن دہلی تھا۔ ان کے والد بزرگوار سید احمد حسن جو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ اورنگ آباد (دکن) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ وہیں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو جمعہ کے دن مودودی صاحب کی ولادت ہوئی۔ چونکہ ان کا شجرۂ نسب چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ خواجہ قطب الدین مودود چشتی سے ملتا ہے اس لیے ان بزرگ کی نسبت سے لفظ مودودی، نام کا ایک جز بن گیا۔ خاندان کے ایک اور بزرگ کے نام پر اصلی نام ابوالاعلیٰ قرار پایا۔ اور چونکہ ددھیال کی طرف سے سید تھے اس لیے پورا نام سید ابوالاعلیٰ مودودی ہوا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ریاست حیدرآباد کے نئے نظامِ تعلیم کے تحت مودودی صاحب نے محض ۱۴ سال کے سن میں مولوی کا امتحان دے کر یونیورسٹی سے میٹرک کی سند حاصل کی۔ مولوی کے نصاب میں میٹرک کے تمام مضامین کے ساتھ ساتھ عربی زبان، فقہ، حدیث اور منطق کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے حیدرآباد (دکن) میں دارالعلوم کالج کی جماعت مولوی عالم میں داخلہ لیا۔ لیکن ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ ان کے والد پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ اور وہ اپنا سلسلۂ تعلیم ختم کر کے سب سے بڑے بھائی سید ابوالخیر کے پاس بھوپال چلے گئے اور وہاں اپنے والد صاحب کی تیمارداری کرتے رہے۔ لیکن وہ اس مہلک مرض سے جانبر نہ ہو سکے اور ۱۹۲۰ء میں فوت ہو گئے۔

والد کے انتقال کے بعد مولانا مودودی نے ذاتی مطالعے سے اپنی قابلیت میں اضافہ کیا۔ انھوں نے اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی میں اتنی استعداد بہم پہنچالی کہ عربی اور انگریزی میں روانی سے بولنے اور لکھنے لگے۔ چنانچہ عرب ممالک میں پہنچ کر وہ عربی میں تقریریں کرتے تھے۔ اور نومبر ۱۹۷۰ء میں استقبالی تقریر انھوں نے انگریزی میں کی۔

سترہ سال کی عمر میں مودودی صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ مدینہ بجنور، ہفت روزہ تاج، روزنامہ الجمعیۃ وغیرہ کے ادارۂ تحریر سے منسلک رہے۔ اور جب انھیں مالی مشکلات سے کسی قدر نجات ملی تو انھوں نے تصنیف و تالیف کی جانب توجہ کی۔ سب سے پہلی اور معرکۃ الآرا کتاب "الجہاد فی الاسلام" تھی جو انھوں نے بعمر ۲۴ سال ۱۹۲۷ء میں لکھی۔

۱۹۲۹ء میں انھوں نے الجمعیۃ سے علیحدگی اختیار کر لی اور حیدرآباد

دکن چلے گئے۔ وہاں ۱۹۳۷ء تک مقیم رہے۔ وہیں سے ۱۹۳۲ء میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" جاری کیا جو ابھی تک جاری ہے۔ اسی دوران رسالہ دینیات لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں شادی ہوئی۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کے مشورہ سے پٹھان کوٹ میں مقیم ہو گئے اور دارالعلوم قائم کیا۔ لیکن دسمبر ۱۹۳۸ء سے جون ۱۹۴۲ء تک لاہور میں قیام کرنے کے بعد پھر پٹھان کوٹ چلے گئے۔ اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی وجود میں آئی۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئے۔ یہاں رہ کر شروع میں تو حکومت سے دستور کا مطالبہ کرتے رہے پھر خود سیاست میں شریک ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی بار قید ہوئے۔ ایک دفعہ ۱۹۵۳ء میں پھانسی کی سزا بھی سنا دی گئی۔ جو بعد میں معاف ہو گئی۔ ان شدائد کے باوجود اسلامی آئین کے لیے جدوجہد کرتے رہے[1] اور ۱۹۷۹ء میں فوت ہو گئے۔[2] مگر اسلامی آئین کے نفاذ کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مولانا نے پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ لیکن تفہیم القرآن آپ کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ اس تفسیر کے لکھنے کی ضرورت مولانا کو کیوں پیش آئی جبکہ کئی اچھی اچھی تفسیریں پہلے سے موجود تھیں؟ صاف ظاہر ہے کہ مولانا داعی اسلام بن کر اٹھے تھے اور انھوں نے شروع سے اسی نیک کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی دنیوی مفادات کو اس مقصد پر قربان کر دیا تھا۔ جب وہ حیدرآباد دکن میں مقیم تھے اس وقت ان کو وہاں آٹھ سو روپے مشاہرہ پر گزٹیڈ عہدہ پیش

---

1 مولانا مودودی کی تقاریر۔ حصہ اول۔ جلد اول۔ از ثروت صولت۔ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور۔ سال اشاعت ۱۹۷۶ء، صفحات ۹ تا ۹۰۔

2 یاد رفتگاں، مصنفہ صابر براری، مطبوعہ ادارہ فکر نو کراچی فروری ۱۹۸۷ء

جامعہ عثمانیہ میں رکھا جا رہا تھا لیکن انھوں نے سو روپے ماہوار پر اسلام کی خاطر کام کرنے کو ترجیح دی اور حیدر آباد جیسی پُر رونق جگہ کو چھوڑ کر پٹھان کوٹ جیسی دور افتادہ بستی میں جا پڑے۔ اس سلسلے میں ان کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی لکھتے ہیں:

"(مولانا مودودی) نے حیدر آباد کی اس سستے زمانے کی آٹھ سو روپے ماہوار کی معقول تنخواہ کی اچھی زندگی کو ترک کر کے پر دیس کے ایک گاؤں میں سو روپے کی آمدنی کو قبول کر لیا، صرف اس لیے کہ وہ اپنے مقصدِ حیات اور پیغام کی خدمت کر سکے۔ آپ خود دیکھیے کہ ہم میں کتنے فیصد اور کتنے فی ہزار نہیں بلکہ فی لاکھ لوگ یہ قربانی دے سکتے ہیں۔ ابوالاعلیٰ کا یہ ایثار آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔"[1]

(سید ابوالاعلیٰ مودودی از ایوآئی ق، صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸)

سید ابوالخیر مودودی صاحب کی اس تحریر کی تصدیق مولانا مناظر احسن گیلانی کے ایک مکتوب سے بھی ہوتی ہے۔

ان بیانات کی روشنی میں یہ بتانا مقصود ہے کہ بہت تھوڑی عمر میں مولانا مودودی نے نظامِ اسلام کے احیاء اور نفاذ کے لیے کوشش کرنے کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ انھیں اس بات کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ اسلام صرف چند رسوم و رواج کی ادائیگی کا نام نہیں بلکہ وہ پوری دینی اور دنیوی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کا اصل سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کا رابطہ قرآن سے کائم کیا جائے۔ عربی زبان سے ناواقفیت عام ہو چکی ہے لہٰذا مسلمانان برصغیر کے لیے خاص کر اردو زبان کو ذریعہ بنایا جائے۔ اس کے لیے مولانا نے ضروری سمجھا کہ عام فہم اردو زبان

[1] مولانا مودودی کی تقاریر، جلد اول۔ ص ۱۶

میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ عقلیت پسندی کا دور ہے اور پہلے کے بیشتر تراجم و تفاسیر کی بنیاد عقیدت پر رکھی گئی ہے۔ اور جدید تعلیم اور سائنس نے عقیدہ کو کسی حد تک متزلزل کر دیا ہے لہٰذا موجودہ نسل کو قرآنی تعلیم کو ان ہی کی اصطلاحوں میں سمجھایا جائے اور مغرب سے درآمد شدہ گمراہ کن نظریات کی کاٹ خود ان ہی کے ہتھیاروں سے کی جائے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد انھوں نے خود کتاب ہدایت کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ چالیس سال سے کم عمر ہی میں انھوں نے اس عظیم کام کا آغاز کر دیا۔ تفہیم القرآن جلد اوّل کے دیباچہ کے اختتام پر مولانا خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس کتاب کو میں نے محرم ۱۳۶۱ھ مطابق فروری ۱۹۴۲ء میں شروع کیا تھا۔ پانچ سال سے زیادہ مدت تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ سورہ یوسف کے آخر تک ترجمانی اور تفہیم تیار ہو گئی۔ اس کے بعد پے در پے ایسے اسباب پیش آتے چلے گئے کہ مجھے نہ تو آگے کچھ لکھنے کا موقع مل سکا اور نہ اتنی فرصت ہی میسر آسکی کہ جتنا کام ہو چکا تھا اسی کو نظرثانی کر کے اس قابل بنا سکتا کہ کتابی صورت میں شائع ہو سکے۔ اب اسے حسن اتفاق کہیے یا سوء اتفاق کہ ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو یکایک مجھے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور یہاں مجھ کو وہ فرصت بہم پہنچ گئی جو اس کتاب کو پریس میں جانے کے قابل بنانے کے لیے درکار تھی۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ جس غرض کے لیے میں نے یہ محنت کی ہے وہ پوری ہو اور یہ کتاب قرآن مجید کے فہم میں بندگان خدا کے لیے واقعی مددگار ثابت ہو سکے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔"[1]

---

1. تفہیم القرآن جلد اوّل، ص ۱۲

مولانا نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ گھر میں یا جیل میں بیٹھ کر تفسیر لکھ دی بلکہ اپنے بعض بیانات کی وضاحت کے لیے ان مقامات کو بچشم خود دیکھنا بھی ضروری سمجھا، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اپنی اس خواہش کو مولانا نے ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں پورا کیا۔ اس سلسلہ میں مولانا مودودی کی تقاریر کے مرتب جناب ثروت صولت صاحب فرماتے ہیں:

"مولانا مودودی نے مشرقِ وسطیٰ کا دوسرا سفر ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں اس وقت کیا جب پاکستان میں مارشل لا لگا ہوا تھا وہ ۳۰ نومبر ۱۹۵۹ء کو کراچی سے روانہ ہوئے اور ۵ فروری ۱۹۶۰ء کو واپس آگئے۔ یہ ان کا تحقیقی سفر تھا جس کے دوران میں انھوں نے سعودی عرب، اردن، فلسطین، شام اور مصر کے ان آثار کا مشاہدہ کیا جن کا قرآن مجید میں تذکرہ ہے۔"[1]

مولانا کے اس سفر کی مکمل روداد ان کے رفیق سفر محمد عاصم صاحب نے "سفرنامہ ارض القرآن" کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر دی ہے۔ اس سفر میں اگرچہ ان کو ان تمام ممالک کی حکومتوں کا تعاون حاصل رہا جن ممالک کا انھوں نے سفر کیا تھا۔ اس کے باوجود بعض مقامات پر ایسی دشواریاں پیش آئیں کہ اگر تائید ایزدی شامل حال نہ ہوتی تو شاید سفر میں سے کسی کا بھی وجود باقی نہ رہتا بلکہ کوئی اس نقصان عظیم کی اطلاع دینے والا بھی نہ ہوتا۔[2] سچ پوچھئے تو مفسرین میں مولانا کے علاوہ کوئی ایک ہستی بھی ایسی نہیں دکھائی دیتی جس نے اس نیک کام میں ایسی

---

[1] مولانا مودودی کی تقاریر جلد اول صفحات ۹۱، ۹۲

[2] سفرنامہ ارض القرآن۔ مرکزی مکتبہ اسلامی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور اشاعت سوم ۱۹۷۰ء صفحات ۲۲۸، ۲۲۹

صعوبات برداشت کی ہوں گی۔

اس سفر میں جو تحقیقات ہوئی تھیں اور آثار کے جو فوٹو لیے گئے تھے وہ سب مع بعض نقشہ جات تفہیم القرآن میں شامل کر دیے گئے ہیں جن کی وجہ سے اس تفسیر کو اردو کی جملہ تفاسیر میں منفرد حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ مولانا نے تفسیر بیان کرنے میں نہ آنکھ بند کر کے اپنے پیش روؤں کی تقلید کی اور نہ تجدد پسندوں کی الٹی سیدھی باتوں کو سراہا۔ بلکہ دلائل و براہین کو کام میں لا کر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً بعض مفسرین نے بائبل کے اس بیان پر کہ حضرت نوح کی کشتی کوہستان آرمینیا کی بلند ترین چوٹی ارارات سے جا کر لگی تھی۔ اس چوٹی کو قرآن میں مذکور جبل جودی قرار دے دیا مگر مولانا مودودی نے دریائے دجلہ کے کنارے واقع جبل الجودی کو جودی بتایا ہے۔ ان کی اس بات کی تصدیق نینوا کے مقام پر پائی جانے والی بعض تختیوں سے بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے خلیج سویز اور خلیج عقبہ کے نقطہ اتصال کی جگہ نیل ابیض اور نیل ازرق کے سنگم کو "مجمع البحرین" قرار دیا ہے۔ تاہم ضروری نہیں ہے کہ مولانا کی ہر بات کو حتمی سمجھا جائے۔ سہو اور غلطی کا امکان بہر حال یہاں باقی رہتا ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا نہ نرے مقلد ہیں اور نہ تجدد پسند۔

ذیل میں ان کی تفسیر کے دو ایک نمونے درج ہیں:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

ترجمہ: "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔"

تفسیر: "یعنی تیرے ساتھ ہمارا تعلق محض عبادت ہی کا نہیں ہے بلکہ استعانت کا تعلق بھی ہم تیرے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ساری کائنات کا رب تو ہی ہے اور ساری طاقتیں

تیرے ہی ہاتھ میں ہیں۔ اور ساری نعمتوں کا تو ہی اکیلا مالک
ہے۔ اسی لیے ہم اپنی حاجتوں کی طلب میں تیری طرف ہی رجوع کرتے
ہیں۔ تیرے ہی آگے ہمارا ہاتھ پھیلتا ہے اور تیری مدد ہی پر ہمارا
اعتماد ہے۔"

اس مختصر تفسیر سے انھوں نے ہر طرح کے شرک کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔
اب قرآن کریم کی وہ آیت لیجیے جس کی بنیاد پر تجدد پسند حضرات نے روس
اور امریکہ کے بے پیر خلا نوردوں کی کوششوں کو عین اطاعتِ خداوندی
قرار دیا ہے۔ مولانا نے اس آیت کا جو ترجمہ اور تفسیر بیان کی ہے وہ اس سے
کتنی مختلف ہے۔ ملاحظہ ہو:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ الخ

ترجمہ: "اے گروہ جن و انس تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر
بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لیے بڑا
زور چاہیے۔"

تفسیر: زمین اور آسمانوں سے مراد ہے کائنات یا بالفاظ دیگر خدا کی
خدائی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی گرفت سے بچ نکلنا تمہارے
بس میں نہیں ہے۔ جس بازپرس کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے اس کا
وقت آنے پر تم خواہ کسی جگہ بھی ہو، بہرحال پکڑ لائے جاؤ گے۔ اس سے
بچنے کے لیے تمہیں خدا کی خدائی سے بھاگ نکلنا ہوگا۔ اور اس کا
بل بوتا تم میں نہیں ہے۔ اگر ایسا گھمنڈ تم اپنے من میں رکھتے ہو تو
اپنا زور لگا کر دیکھ لو۔"[1]

۱۔ تفہیم القرآن جلد پنجم صفحات ۲۶۳، ۲۶۴

اب ذرا تجدد پسندوں کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔ "مولوی اور ملا آیت کا مطلب کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس میں جو لفظ "سلطان" آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں راکٹ۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ اے جنوں اور انسانوں! ویسے تو تم کائنات کے آر پار جا نہیں سکتے اس لیے کہ اس میں بڑی طاقت چاہیے لہذا اگر تم اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ میں نفوذ کرنا چاہتے ہو یا اس کے پار نکلنا چاہتے ہو تو ایک راکٹ بنا لو۔ پھر تمہیں کائنات سے نکل بھاگنے میں سو فیصد کامیابی ہو جائے گی۔ مسلمان بیچارے تو قَالَ اللہُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ ہی پڑھتے رہے لہذا اس آیت کا مطلب کیا سمجھتے۔ امریکہ والوں نے اس کا مطلب بھی سمجھ لیا اور اس کو عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ چاند تک تو پہنچ ہی گئے اب کائنات کے پار پہنچنے میں تھوڑی سی کسر اور رہ گئی ہے۔ جلد ہی خدا کی خدائی سے نکل کر اپنی خدائی کا اعلان کر دیں گے۔"

تفسیر صغیر[1]

مرزا بشیر الدین محمود احمد

جیسا کہ سرورق کی عبارت سے ظاہر ہے تفسیر صغیر قرآن مجید کا اردو بامحاورہ ترجمہ مع مختصر تفسیر ہے۔ مترجم و مفسر قادیانی جماعت کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کے صاحبزادے اور خلیفۃ ثانی المسیح مرزا بشیر الدین محمود احمد ہیں۔ اور ناشر ادارۃ المصنفین ربوہ ضلع جھنگ ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود سالہا سال قادیانی جماعت کے سربراہ رہے اور انھوں نے بانی مسلک کے کام کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ و اشاعت کا کام بھی بہت

---

[1] تفسیر صغیر۔ اردو بامحاورہ ترجمہ مع مختصر تفسیر از مرزا بشیر الدین محمود احمد ناشر ادارۃ المصنفین ربوہ ضلع جھنگ ص ۲

سند میں سے انجام دیا۔ ان کا دوسرا اس لحاظ سے کافی اہم ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کی وجہ سے اس جماعت کا مرکز قادیان کے بجائے ربوہ بنا۔ اور ان کو از سر نو جماعت کی تنظیم اور اپنے مستقر کی تعمیر و تشکیل کرنی پڑی۔ الغرض یہ دونوں کام بڑی ذمہ داری کے تھے تاہم جماعت کی یکجہتی اور اس مسلک کے ماننے والے بعض سربرآوردہ اشخاص کے تعاون سے انہوں نے اس ذمہ داری کو احسن وجوہ پورا کیا۔ اس نقل مکانی میں ان کی جماعت کو ان مصائب و شدائد سے نہیں گزرنا پڑا جن سے مسلمانوں کے سواد اعظم کو دوچار ہونا پڑا۔

ربوہ کے مرکز سے مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے مسلک سے متعلق لٹریچر شائع کرنے کے علاوہ قرآن کریم کا ترجمہ اور اس کی تفسیر بھی شائع کی اس میں کئی جگہ مسلمانوں کے مسلک اور عقیدہ کے خلاف باتیں لکھ دی گئی ہیں۔ مثلاً خاتم النبیین کی جو تفسیر و تاویل بیان کی گئی ہے اس کو سواد اعظم کے نقطۂ نظر سے نہ صرف منطقی مغالطہ بلکہ کج بحثی سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن تفسیر کے اس نسخہ میں بعض ایسی خوبیاں بھی موجود ہیں جن کا اعتراف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کو شایان شان طریقہ پر نہایت اچھے آرٹ پیپر پر شائع کیا گیا ہے۔ شروع میں سیپاروں اور سورتوں کی فہرست ہے۔ سیپاروں کے صفحات کے نمبر الگ دیئے گئے۔ سورتوں کے الگ۔ ہر سورت کے رکوع اور آیات کی تعداد بھی الگ الگ کالموں میں بتا دی گئی ہے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ مختلف سورتوں کا آغاز کس کس سیپارے میں ہوتا ہے۔

سب سے بڑھ کر اس تفسیر کا یہ وصف ہے کہ شروع میں مضامین قرآن کریم کا ایک جامع انڈیکس دے دیا گیا ہے۔ یہ انڈیکس تقریباً سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں چھ کالم بنائے گئے ہیں۔ پہلے کالم میں حروف تہجی کے اعتبار سے اردو

میں مختصر الفاظ میں مضامین ہیں۔ دوسرے کالم میں مضمونات کے نمبر ہیں۔ تیسرے کالم میں ان سورتوں کے نام ہیں جن میں وہ مضامین بیان ہوئے ہیں۔ چوتھے کالم میں آیتوں کے نمبر ہیں۔ پانچویں کالم میں ان حاشیوں کے نمبر ہیں جن میں بعض مضامین کی وضاحت کے سلسلے میں دیے گئے ہیں۔ اور چھٹے کالم میں ان مضامین سے متعلق آیاتِ قرآنی دی گئی ہیں۔ غرض یہ جامع انڈیکس دیگر قارئین کے لیے بڑی سہولتیں پیدا کر دیتا ہے۔ اور ترجمہ اور تفسیر پر غور و فکر کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

ترجمہ الفاظ کے تھوڑے بہت رد و بدل سے وہی ہے جو دوسرے مترجم و مفسر بیان کرتے ہیں۔ البتہ تفسیر میں مفسر نے پوری آزادی کے ساتھ اپنے اور دورِ جدید کے تقاضوں کا پورا خیال رکھا ہے اور نہایت عجیب و غریب تشریح و تاویل پیش کی ہے۔ مثلاً

(۱) إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

ترجمہ: "اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔"[1]

تفسیر: جب خدا تعالیٰ کی قدرتِ خاص کے مظاہر دنیا میں ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں تو خدا تعالیٰ انسان کے قریب ہو جاتا ہے اور سعید طبع لوگوں کو خدا تعالیٰ نظر آنے لگ جاتا ہے اور ایک نیا ایمان ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ پس غائب خدا ان کو حاضر نظر آنے لگتا ہے اور وہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کہہ اٹھتے ہیں اور رؤیت درحقیقت انبیاء کے زمانہ میں

---

[1] تفسیر صغیر از بشیر الدین محمود احمد

اور انبیاء کے قریب زمانہ میں حاصل ہوتی ہے۔ یعنی جبکہ کثرت
سے لوگ اس قسم کی معیت[1] اور عبودیت کا مقام حاصل کرتے ہیں۔
اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انبیاء سے بعید زمانہ میں بھی
جاکر کچھ لوگ اس قسم کے رہتے ہیں سوائے اس قلیل عرصہ کے
جو کسی آنے والے موعود سے پہلے کا ہوتا ہے۔ جبکہ دنیا سعیدوں
سے تقریباً خالی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ لوگ جو زمانہ نبوت سے
بعد پر پیدا ہوتے ہیں اس مقام کے حاصل کرنے والے
لوگ ان میں اتنے تھوڑے ہوتے ہیں کہ خدا سے ان کا تعلق
انفرادی تعلق کہلا سکتا ہے۔ اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ
نَسْتَعِيْنُ میں نَعْبُدُ کا "نون" اور نَسْتَعِيْنُ کا نون
بتاتا ہے کہ یہاں اس جماعت کا ذکر ہے جو کہ اجتماعی حیثیت
رکھتی ہے جس میں کثرت سے خدا تعالیٰ کے قرب کو پانے والے
اور ان کے نشانات کو دیکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔
قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی اسی مضمون کی طرف یوں اشارہ
فرمایا گیا ہے کہ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ
(سورۃ واقعہ آیت ۱۴-۱۵) مفسرین نے غلطی سے اس کے
یہ معنی کر لیے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ
میں زیادہ اور بعد میں کم حالانکہ یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا
ہے کہ زمانہ رسالت اور اس کے قریب کا زمانہ میں یہ مقام جو حاصل
کرنے والے کثرت سے ہوتے ہیں اور جب زمانہ نبی سے دور ہو جاتا
ہے تو یہ لوگ تھوڑے رہ جاتے ہیں اور ان کی حیثیت انفرادی
رہ جاتی ہے۔ جماعتی حیثیت نہیں رہتی۔

---

[1] تفسیر کبیر ص ۳

ترجمہ اور تفسیر کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ تو عوام وخواص سب کے لیے قابلِ فہم ہے لیکن تفسیر صرف مخصوصین کے لیے ہے عام آدمی کو ترجمہ سے جو کچھ سمجھ لیتا ہے، تفسیر پڑھنے کے بعد وہ بھی اس کے ذہن سے نکل جاتا ہے۔ کاش تفسیر بیان کرتے وقت بھی عوام کا خیال رکھا جاتا۔

سورہ احزاب کی درج ذیل آیت میں ترجمہ میں تھوڑی سی ترمیم کی کردی ہے اور پھر اسی تبدیلی کی روشنی میں عجیب انداز سے تفسیر بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ۟ (۳۳-۴۰)

ترجمہ: "(محمد) تم سے کسی مرد کے باپ تھے نہیں (نہ ہوں گے) لیکن اللہ کے رسول ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نبیوں کی مہر ہیں۔ اور اللہ ہر ایک چیز سے خوب آگاہ ہیں۔"

یہاں خاتم کے معنی مہر بتائے گئے ہیں اور اسی کی روشنی میں حسبِ ذیل تفسیر بیان کی گئی ہے۔

تفسیر: یعنی آپ کی تصدیق کے بغیر اور آپ کی تعلیم کی شہادت کے بغیر کوئی شخص نبوت یا ولایت کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ لوگوں نے نبیوں کی مہر کی جگہ آخری نبی کے معنی لیتے ہیں۔ اس سے بھی ہماری پوزیشن میں فرق نہیں آتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عروج کو مدِ نظر رکھا جائے تو انبیا اور تجربہ مطابق مسند الحدیث حنبلیا رح کو رہ پاتا ہے۔

یہ شجرہ اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ نو خانے بنا کر ان میں اہل زمین اور انبیاء کے مقام کو اس طرح متعین کیا ہے، سب سے نیچے خانے میں اہل زمین ہیں پھر نیچے سے اوپر کی طرف پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ، دوسرے پر حضرت عیسیٰؑ، تیسرے پر حضرت یوسفؑ، چوتھے پر حضرت ادریسؑ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ، ساتویں پر حضرت ابراہیمؑ اور آٹھویں خانہ میں سدرۃ المنتہیٰ پر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس شجرہ کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے۔ "ختم نبوت کے یہ معنی ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام سب نبیوں سے افضل ہے۔"[1]

(۳) اب سورۃ الناس کی آخری مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ ہو:

ترجمہ: خواہ وہ فتنہ پرداز مخفی رہنے والی ہستیوں میں سے ہو، خواہ عام انسانوں میں سے ہو۔

تفسیر: اس جگہ جِنَّةِ کا لفظ مخفی رہنے والی ہستیوں کے متعلق استعمال ہوا ہے اور النَّاسِ کا لفظ عام انسانوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وسوسے پیدا کرنے والے لوگ کبھی تو غیر ممالک کے ہوں گے مگر چھپ کر کام کرتے ہوں گے اور کبھی ملکی عامۃ الناس ہوں گے جو اپنے نعروں سے مومنوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کریں گے۔[2]

---

۱ تفسیر صغیر۔ ص ۵۵۰ اور ۵۵۱

۲ ایضاً ص ۸۵۳

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

ڈاکٹر حافظ قاری فیوض الرحمٰن نے اپنی قابل قدر تالیف لغات قرآن" میں "تدبر قرآن" پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔

"یہ ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر "تدبر قرآن" کے ذیل میں ہے۔ عام فہم ہے تفسیر کا انداز بھی پیارا ہے۔"[1]

جہاں تک "تدبر قرآن" کا تعلق ہے یہ اردو میں لکھی جانے والی بہترین تفاسیر میں سے ایک ہے۔ اس پر یہ سرسری سا ایک سطری تبصرہ مجھے عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ دو باتوں کا اعتراف خود ڈاکٹر صاحب کو بھی ہے۔ انھوں نے ترجمہ کو عام فہم اور تفسیر کے انداز کو پیارا بتایا ہے لیکن ان دونوں چیزوں پر مکمل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس تفسیر کا بغور مطالعہ نہیں کیا اور ایک آدھ جگہ سے تھوڑی سی عبارت پڑھ کر ترجمہ کے عام فہم ہونے اور تفسیر کے پیارے انداز کا تو پتہ لگا لیا، لیکن اس کی تمام خوبیوں کا احاطہ نہیں کر سکے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اسلامی تحریک کے ایک متحرک کارکن پچاس سال کے دوران میں اسلام کا داعی رہے اور انھوں نے ڈوب کر قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ مولانا حمید الدین فراہی کے خاص شاگرد ہیں اور کافی عرصہ تک جماعت اسلامی کے نہایت اہم رکن رہ چکے ہیں۔ مولانا مودودی کی طرح اپنی صاف گوئی کی بدولت انھیں بھی خان لیاقت علی خان کے دور میں

---

[1] لغات قرآن ص ۲۳۸

میں اٹھارہ مہینے تک ملتان جیل میں رہنا پڑا۔ وہ پورے صبر و سکون سے جیل کی چہار دیواری کے اندر گزار کر باہر آ گئے اور بلطفہ تعالیٰ آج تک باہر ہی ہیں لیکن یہ بات آج تک معمہ بنی ہوئی ہے کہ "اس وقت مولانا مودودی کو تو اس وجہ سے نظر بند کیا گیا تھا کہ انھوں نے کشمیر کی جنگ کو جہاد نہیں کہا تھا۔ مگر مولانا اصلاحی کو کس لیے ان کے ساتھ متہم کر دیا گیا تھا؟" بہرحال "دستورِ مملکت خویش خسروان دانند" کے زریں اصولوں کو سامنے رکھ کر اس معاملہ سے قطع نظر اتنا بتا دینا ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی دین کی خدمت حکومت سے باہر رہ کر کرنے کے قائل ہیں۔ لہٰذا جب جماعت اسلامی میدانِ سیاست میں آ گئی تو انھوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنی زندگی کو قرآنی تعلیمات کی اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ مولانا حمید الدین فراہی سے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں انھوں نے جو فیض حاصل کیا تھا وہ دوسروں کی طرف منتقل کرنے کی غرض سے اس کو تحریری شکل میں مرتب و مدون کرنا شروع کر دیا۔ تدبر قرآن (تفسیر تدبر قرآن) ان کی اسی کوشش و کاوش کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے بیانِ واقعہ کے طور پر لکھا ہے کہ

"یہ کتاب میری چالیس سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔"[1]

"تدبر قرآن" کئی جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی جلد ستمبر ۱۹۶۷ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس کے شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے جس میں مصنف نے قرآن کریم کی ادبی خوبیوں اور اس کے زبان و بیان کے بارے تشفی بخش باتیں بتائی ہیں۔ اس مقدمہ کو انھوں نے اس طرح شروع کیا ہے:

---

[1] تدبر قرآن جلد اول شائع کردہ دار الاشاعت الاسلامیہ، امرت ... کرشن نگر لاہور۔ بار اول ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۲۲

اس کتاب پر میں کوئی مقدمہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اب سے
بہت پہلے میں نے "تدبر قرآن" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔
جس کے غالباً دو تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ کتاب میں نے اسی
مقصد کے لیے لکھی تھی کہ یہ میری تفسیر کے لیے مقدمے کا کام
دے گی۔ چنانچہ ارادہ یہ تھا کہ اسی کو تفسیر کے شروع میں لگا دیا
جائے گا۔ لیکن اب جب اس نگاہ سے اس کو دیکھا تو معلوم ہوا
کہ بہت پہلے لکھے جانے کی وجہ سے اس میں بعض کمیاں بھی رہ
گئی ہیں اور اس کے بعض مقامات میں غیر ضروری طوالت بھی
ہے۔ اگر اسی کو بعینہٖ کتاب کے ساتھ جوڑ دیا گیا تو یہ اس
کتاب کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ چنانچہ دوسرے ضروری کاموں
کو نظر انداز کر کے مجھے اس مقدمہ کے لیے قلم سنبھالنا پڑا
وَبِیَدِ اللّٰہِ التَّوْفِیْق[1]

جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے مفسر نے اپنی پہلی کتاب "تدبر قرآن"
کو چھوڑ کر تفسیر کے لیے مقدمہ از سر نو لکھا ہے اور اس کے مضمون کو بڑی
حد تک بدل دیا ہے۔ چنانچہ مقدمہ کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب مذکورہ
بالا کا ابتدائی حصہ ترک کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم سے فیض حاصل
کرنے کے لیے وہ ایک اہم بلکہ اہم ترین نکتہ ہے۔ غیر مسلم اور بعض روشن
خیال مسلمان بھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن جب خدا کا کلام اور
ہدایت کا سرچشمہ ہے تو پھر اس سے ہر شخص کو ہدایت کیوں نہیں ملتی۔

---

[1] تدبر قرآن جلد اول، شائع کردہ دار الاشاعت اسلامیہ، الہرٹ روڈ
کرشن نگر، لاہور۔ بار اول ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۱

اصلاحی صاحب نے ایسے لوگوں کو شروع میں بتا دیا تھا کہ "جب تم قرآن کا مطالعہ کرو تو اس کو اس نیت سے شروع کرو کہ تمہیں اس سے ہدایت حاصل کرنا ہے۔ اسی صورت میں یہ تمہارے لیے ہدایت کا سرچشمہ ثابت ہو گا۔ لیکن اگر تم اسے تنقیدی نظر سے پڑھو گے یا یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ موجودہ دور کے نظریات کی تائید کرتا ہے یا ہماری خواہشات کو جائز قرار دیتا ہے یا نہیں، تو پھر اس سے تمہیں کبھی بھی ہدایت حاصل نہ ہو گی۔"[1]

مقدمہ میں ابھی فہم قرآن کے سلسلہ میں بڑی مفید باتیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی چیز فہم قرآن کے داخلی اور خارجی مسائل کی تفصیلی بحث ہے۔ اس کے تحت بہت سے ذیلی عنوانات آگئے ہیں جن میں قرآن کی زبان کو اولیت کا درجہ دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اول تو قرآن کی زبان عربی ہے۔ پھر وہ زبان اتنی فصیح و بلیغ ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی زمانہ میں بھی کوئی کلام پیش نہیں کیا جا سکا۔ ترجموں کے ذریعہ اس کی ان خوبیوں کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اس کی خوبیوں اور لطافتوں کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ براہِ راست عربی زبان سیکھی جائے اور اس زبان کا ذوق پیدا کیا جائے۔ جب تک یہ ذوق پیدا نہیں ہو گا قرآن کے مشاء کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ یہ کام اگرچہ دشوار گزار ہے تاہم ایک اعلیٰ مقصد کے لیے دشواری کو گوارا کرنا پڑتا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا مسئلہ نظم قرآن کا ہے۔ چونکہ اس کلام

---

[1] تدبر قرآن کے مقدمہ میں یہ بات بعد میں بیان کی گئی ہے۔ دیکھیے تدبر قرآن جلد اول ص "ش"

کے مخاطب اول خود عرب تھے جو اپنی زبان کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے وہ تو اس نظم کو سمجھ لیتے تھے۔ لیکن دوسروں کے لیے یہ کام بہت دشوار ہے۔ تاہم کلام الٰہی سے پوری طرح مستفید ہونے کے لیے اس نظم کو سمجھنا ضروری ہے۔ لہٰذا اس میں بھی پورے غور و فکر اور تدبر سے کام لینا چاہیے۔ تاکہ اس نظام زندگی کا ایک واضح اور مربوط خاکہ ذہن میں آجائے جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔ "نظم کی قدر و قیمت" کے عنوان کے تحت اصلاحی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"نظم کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض علمی لطائف کے قسم کی ایک چیز ہے جس کی قرآن کے اصل مقصد کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک تو اس کی اصل قدر و قیمت یہی ہے کہ قرآن کے علوم اور اس کی حکمت تک رسائی اگر ہو سکتی ہے تو اسی کے واسطے سے ہو سکتی ہے۔ جو شخص نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن کو پڑھے گا وہ زیادہ سے زیادہ جو حاصل کر سکے گا وہ کچھ منفرد احکام اور منفرد قسم کی ہدایات ہیں۔" [1]

آگے چل کر اصلاحی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے اس تفسیر میں چونکہ نظام کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے۔ بلکہ اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور

---

[1] تدبر قرآن جلد اول ص "ج"

جوڑنا پڑتا ہے۔ کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف واحتمالات میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ صحیح بات اس طرح منقح ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ آدمی اگر بالکل اندھا "بہرا" متعصب نہ ہو تو اپنی جان تو قربان کرسکتا ہے لیکن اس سے انحراف برداشت نہیں کرسکتا۔[1]

ان وضاحتوں کے بعد عالمی وسائل پر بحث کی گئی ہے اور مختلف عنوانات کے تحت ان پر الگ الگ روشنی ڈالی گئی ہے جیسے سبب احتواء وشہور، احادیث و آثار صحابہ، شانِ نزول، کتب تفسیر قدیم آسمانی صحیفے، تاریخ عرب۔

آخر میں قرآن کے طالبوں کے لیے چند ہدایات دی گئی ہیں۔ اس حصہ میں مذکورہ کتاب تدبر قرآن کا خلاصہ بیان کردیا گیا ہے۔ اس میں پہلی ہدایت "نیت کی پاکیزگی" کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ "آدمی قرآن مجید کو صرف طلب ہدایت کے لیے پڑھے، کسی اور غرض کو سامنے رکھ کر نہ پڑھے۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے۔ تیسری ہدایت یہ کہ قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم۔ چوتھی ہدایت یہ کہ اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دعاء۔

یہ ہدایات دینے کے بعد چند حروف خاص اس تفسیر سے متعلق بیان کیے گئے ہیں اور پھر ترجمہ و تفسیر کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

قرآن کو بجا طور پر کتاب ہدایت کہا جاتا ہے۔ اور یہ چشمہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے مومن کی اس دعاء کے جواب میں جاری کیا ہے جو وہ سورہ

---

[1] تدبر قرآن جلد اول ص "ی"

فاتحہ کی تلاوت کرتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (اے اللہ! سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت فرما۔) اللہ تعالیٰ نے بندۂ مومن کی دعا قبول کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ؕ

(اے بندے اگر تو واقعتہً ہدایت چاہتا ہے تو اس کے لیے ہم تجھے یہ نسخۂ کیمیا دے رہے ہیں:۔ اس کو پڑھ، سمجھ اور عمل کر۔ وہ نسخہ یہ کتاب ہے۔ اس کتاب میں کوئی شک و شبہ کی بات نہیں ہے۔ لیکن اس میں ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ ان لوگوں کے لیے جو غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

تدبر قرآن میں اسی چیز پر زور دیا گیا ہے کہ قرآن کا مطالعہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے کیا جائے، کسی اور غرض سے نہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

"آدمی قرآن مجید کو صرف طلب ہدایت کے لیے پڑھے کسی اور غرض کو سامنے رکھ کر نہ پڑھے۔ اگر طلب ہدایت کے سوا آدمی کے سامنے کوئی اور غرض ہوگی تو وہ نہ صرف قرآن کے فیض ہی سے محروم رہے گا بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دور وہ اب تک رہا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ دور ہٹ جائے۔"[1]

مفسر موصوف کے اس صائب مشورہ کی روشنی میں ضروری معلوم ہوتا ہے

کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی انھوں نے جو تفسیر بیان کی ہے نمونہ کے لیے وہی پیش کر دی جائے۔ وہ کہتے ہیں:

تفسیر: اِھْدِنَا کا مطلب صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا دے بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی ہے کہ اس راستہ کی صحت پر ہمارے دل مطمئن کر دے۔ اس پر چلنے کا ہمارے اندر ذوق و شوق پیدا کر دے۔ اس کی مشکلیں ہمارے لیے آسان کر دے اور اس پر چلا دینے کے بعد دوسری پگڈنڈیوں پر بھٹکنے سے ہمیں محفوظ رکھ۔ یہ سارا مضمون یہاں صلہ کو حذف کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پر الف لام عہد کا ہے۔ اس سے مراد وہ سیدھا راستہ ہے جو بندوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کھولا ہے جو دین اور دنیا دونوں کی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے جس پر چلنے کی دعوت نبیوں اور رسولوں نے دی ہے۔ جس پر ہمیشہ خدا کے نیک بندے چلتے ہیں۔ جو قریب تر اور سہل تر ہے۔ جس کے ادھر ادھر سے گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں نے بہت سی پیچ کی راہیں نکالی ہیں لیکن وہ [illegible] اور خدا تک پہنچنے والے اسی پر چل کر خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسی سیدھے راستہ کو حضورؐ نے ایک مرتبہ اس طرح سمجھایا کہ زمین پر ایک سیدھا خط کھینچا پھر اس کے دائیں بائیں آڑے ترچھے خطوط کھینچ دیے پھر فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے اور یہ آڑے ترچھے خطوط پگڈنڈیاں ہیں اور ان میں ہر پگڈنڈی کی طرف کوئی نہ کوئی

شیطان بلا رہا ہے

تفسیر القرآن

مولانا سید ظفر حسن امروہوی

یہ تفسیر نہایت اہتمام سے شمیم بک ڈپو ناظم آباد کراچی نے شائع کی ہے مفسر حضرت ادیب اعظم الحاج مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی ہیں جو دو صد سے زائد کتابوں کے مصنف اور جامعہ امامیہ کے بانی ہیں۔ معاونین کی تعداد پینتیس ہے۔ جن میں مرد و خواتین دونوں شامل ہیں۔ اور یہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان سب باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جملہ تفاسیر میں اس تفسیر کا کتنا اونچا مقام ہو سکتا ہے۔ مفسر چونکہ ادیب اعظم ہیں اس لیے انھوں نے ترجمہ اور تفسیر میں ادبیت کا پورا خیال رکھا ہے۔ تفسیر کو ہر شخص کے لیے دلچسپ بنانے کی غرض سے موقع کی مناسبت سے انداز بیان اختیار کیا ہے۔ کہیں لہجہ عامیانہ ہے کہیں عالمانہ کہیں سنجیدگی کا عنصر غالب ہے کہیں طنز و ظرافت کی چاشنی۔ غرض مفسرین کی عام روش سے ہٹ کر ترجمہ اور تفسیر دونوں میں روانی، ادبیت اور دلچسپی کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (فرقان ۲۲) کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے:

جس دن یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن گنہگاروں کو کچھ خوشی نہ ہوگی۔ اور فرشتوں کو دیکھ کر کہیں گے "دور دفان"

حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کے ترجمہ کے طور پر جو عامیانہ محاورہ "دور دفان" استعمال کیا گیا ہے اس کی بلاغت کو اہل ذوق حضرات ہی سراہ سکتے ہیں۔

یہ تو ترجمہ کا حال ہے جہاں انسان بڑی حد تک پابند ہوتا ہے۔ تفسیر میں پوری آزادی ہوتی ہے۔ اس لیے وہاں فصاحت و بلاغت کے اس سے بھی زیادہ اعلیٰ نمونے بکثرت دکھائی دیں گے۔

"تفسیر القرآن" پانچ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ جلد چہارم پارہ "وَقَالَ الَّذِينَ" ۱۹ سے پارہ "فَمَنْ أَظْلَمُ" ۲۴ تک ہے۔ ان ہی پاروں کے درمیان سورۂ احزاب میں شامل آیت تطہیر "إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا" بھی آگئی جس کو جامع قرآن نے اس مصلحت سے کہ اس کا مرجع ازواج رسولؐ کو بنائیں اس کو پارہ "وَمَن يَقْنُتْ" کی ان ابتدائی آیات کے بیچ میں شامل کر دیا ہے۔ جن میں ازواجِ محترمات کو کچھ تنبیہ کی گئی ہے۔ جامع قرآن نے یہ تحریف تو کر ڈالی مگر چونکہ خالص عرب ہونے کے باوجود عربی زبان کے قواعد سے ناواقف تھے۔ اس لیے اس آیت میں جو دو جگہ جمع مذکر کی ضمیر "کُمْ" [عَنكُمُ اور يُطَهِّرَكُمْ] آئی ہے اس کی جگہ جمع مونث کی ضمیر استعمال نہ کرسکے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ چودہ سو سال سے یہ غلطی (؟) اسی طرح چلی آرہی ہے مگر آج تک کسی کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا۔ مفسر علام مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ چونکہ ادیب اعظم بھی ہیں اس لیے انھوں نے جامع قرآن کی اس غلطی کو فوراً پکڑ لیا اور نہایت قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ سنا دیا کہ "آیت تطہیر کا ٹکڑا کہیں اور کا ہے۔"

اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لیے سورۂ احزاب کی ان ہی آیات کا ترجمہ اور ان کی تفسیر ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"وَمَن يَقْنُتْ مِنكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ ....

.... إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ۝

ترجمہ: "تم میں سے جو بی بی خدا اور اس کے رسول کی تابعداری
اور اچھے اچھے کام کرے گی تو ہم اس کو دوہرا ثواب عطا کریں گے
اور ہم نے اس کے لیے جنت میں عزت کی روزی تیار رکھی ہے۔
اے نبی کی بیبیو تم معمولی عورتوں جیسی نہیں ہو اگر تم کو پرہیز گاری
منظور ہے (تو اجنبی آدمی سے) بات کرنے میں نرم نرم (لگی
لپٹی) بات نہ کرنا کہ جس کے دل میں (بدکاری کا) مرض ہے
وہ کچھ اور آرزو تم سے نہ کرے اور بعنوان شائستہ بات کیا کرو
اور اپنے گھروں میں قرار سے رہا کرو اور زمانۂ جاہلیت کی
طرح اپنا بناؤ سنگھار دکھاتی نہ پھرو۔ پابندی سے نماز پڑھا
کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت
کرو۔ اے اہل بیت خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ہر قسم کی
برائی سے دور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا
پاک و پاکیزہ رکھے۔ اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں
اور عقل و حکمت کی باتیں پڑھی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو بیشک
خدا بڑا باریک بین اور واقف کار ہے۔"

تفسیر: ازواج مطہرات کو جو کچھ تنبیہ ان آیات میں کی گئی ہے
ان کے متعلق کچھ لکھنا گستاخی ہوگی۔ رسول کے گھر کا معاملہ ہے،
رسولؐ جانیں اور ان کی ازواج جانیں۔[1]

۱؎ سچ کہا حضرت ادیب اعظم الحاج مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ نے
کہ "رسولؐ کے گھر کا معاملہ ہے، رسولؐ جانیں اور ان کی ازواج جانیں۔"
ہمیں ادیب اعظم کو ان کے گھر کے معاملے سے کیا واسطہ۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کہا جاتا ہے کہ کسی گناہ کے متعلق تنبیہ نہ تھی بلکہ ان کو بتایا جانا تھا کہ تم کو بحیثیت عمل تمام مسلمان عورتوں کے لیے نمونۂ عمل بننا چاہیے۔ بے شک جو ناگواری ہوا ہے لیکن قرآن مجید تو یَا نِسَآءَ النَّبِيِّ کی خلاف ورزی اور آیہ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ (۶۶/۴ تحریم) کا نزول اس خیال پر ٹھہرنے نہیں دیتا۔

ان آیات کے بیچ میں جو ازواج محترمات کے متعلق ہیں ہم کو آیت تطہیر جو نظر آرہی ہے۔ بہت کچھ غور کے بعد کسی پر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آیہ تطہیر کے اوپر اور نیچے جو آیات ہیں ان کو اس تطہیر سے کیا نسبت ہے۔ اوّل و آخر تنبیہ اور بیچ میں ان کی انتہائی تعریف کہ اظہار کرنے جو طرز بات ہے۔[۱] آیۂ تطہیر کے اوپر جتنے افعال آئے ہیں وہ سب جمع مؤنث کے صیغے ہیں جیسے اِنِ اتَّقَيْتُنَّ۔ فَلَا تَخْضَعْنَ۔ قُلْنَ۔ لَا تَبَرَّجْنَ۔ اَقِمْنَ۔ اٰتِيْنَ۔ اَطِعْنَ۔ اس کے بعد یکایک جمع مذکر حاضر کی ضمیر عُمّا استعمال ہونے لگیں۔ عَنْكُمْ۔ يُطَهِّرَكُمْ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) واسطہ ہوگا تو ان لوگوں کو ہوگا جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا) اور اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (یعنی نبی تمام اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں) کہ وہ تو یقیناً اس طرح کی بے بنیاد کبھی نہیں برت سکتے۔

[۱] اگر اسی قسم کی بے جوڑ بات تو اس آیت میں بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

پھر جمع مونث کے بجائے جمع مذکر کے صیغے آنے لگے وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ

اگر آیۂ تطہیر میں ازواجِ رسولؐ شامل ہوتیں تو بجائے

مذکر کے اس آیت میں بھی جمع مونث حاضر کی ضمیریں ہوتیں۔

ایسی بے ربطی تو فصیح و بلیغ انسانوں کے کلام میں بھی نہیں پائی

جاتی۔ چہ جائیکہ ملک علّام کے کلام میں۔ سیاق و سباق سے

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آیت تطہیر کا ٹکڑا کہیں اور کا ہے۔ جو

یہاں جامع قرآن نے مصلحتاً لاکر رکھا ہے[1] اس آیت کا

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) کہی گئی ہے "یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ"

(اے نبی کی بیبیو تم معمولی عورتوں جیسی نہیں ہو)۔ کیا اس فقرے سے ازواجِ

رسولؐ کی فضیلت کا اظہار نہیں ہوتا؟

[1] جامع قرآن نے ایک اور موقع پر بھی ایسا ہی عمل کیا ہے۔ سورۂ ھود

میں جہاں یہ ذکر ہے کہ وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی

(اور دیکھو ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوشخبری لیے ہوئے پہنچے)۔ جب

ان فرشتوں نے حضرت ابراہیم کی زوجہ (حضرت سارہ) کو اسحٰقؑ کی اور

اسحٰق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی تو انھوں نے کہا

کہ میرے یہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے جبکہ ہم دونوں

بوڑھے پھونس ہیں۔ اس پر فرشتوں نے اس کے جواب میں کہا "قَالُوْٓا

اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَکٰتُهٗ عَلَیْکُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ

(سورہ ۱۱: آیت ۷۳) (فرشتوں نے کہا "اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟

اے اہلِ بیت، تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں")۔ یہاں

سیاق و سباق سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

مصداق تو وہ گروہ ہونا چاہیے جس میں اکثریت مردوں کی ہو۔ چنانچہ جن کی شان میں یہ آیت ہے ان میں چار مرد ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام، امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور ایک عورت بھی ہے یعنی حضرت فاطمہؑ۔ پس بقاعدہ تغلیب یعنی مردوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ضمیر جمع مذکر حاضر عَنْكُمْ و يُطَهِّرَكُمْ میں لائی گئی۔

دراصل اہل بیت کا لفظ عموماً بیویوں کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے اردو زبان میں بھی عام محاورہ یہی ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص کسی دوسرے سے پوچھتا ہے کہ "گھر والی کا کیا حال ہے؟" تو مراد ہوتی ہے کہ آپ کی بیوی کیسی ہے؟ "لفظ گھر والے" بیویوں کے علاوہ عزیزوں اولاد اور بن بیاہی لڑکیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پھر ہر زبان کا یہ بھی محاورہ ہے کہ اس موقع پر جمع مذکر کی ضمیریں اور جمع مذکر کے صیغے کلام میں لائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی جہاں جہاں اہل بیت کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں جمع مذکر کی ضمیریں اور جمع مذکر کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ ساری بحث کج بحثی کے سوا کچھ نہیں۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) تخاطب صرف حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ حضرت سارہ سے ہے۔ لیکن ایک ہی آیت میں ان کی اکیلی ذات کے لیے ایک جگہ مونث کا صیغہ (اتعجبین) استعمال کیا گیا ہے اور دوسری جگہ مذکر کی ضمیر (علیکم)۔ معلوم نہیں یہاں بھی جامع قرآن نے کسی مصلحت کی بنا پر صیغے بدل دیئے ہیں یا ان کی طرح فرشتے بھی عربی زبان کے قواعد سے نابلد تھے۔

تفسیر فصل الخطاب

مولانا السید علی النقوی مجتہد

تفسیر فصل الخطاب جو ادارۂ ترویج علوم اسلامیہ کراچی (پاکستان) نے شائع کیا ہے الحاج سید العلماء مولانا السید علی نقی النقوی مجتہد (لکھنؤ) کی تصنیف لطیف ہے۔ وہ فرقہ امامیہ کے ایک جید اور متبحر عالم ہیں۔ ان کا تعارف ایک فاضل شخص جناب سید محمد باقر شمس نے "مختصر حالات" کے عنوان کے تحت لکھا جو اس جلد اول کے شروع میں شائع کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مفسر موصوف غفران مآب مولانا سید دلدار علی صاحب مجتہد العصر کی اولاد میں ہیں اور پانچویں پشت میں ان کا شجرہ مولانا دلدار علی صاحب سے مل جاتا ہے۔

مولانا سید علی نقی النقوی کی ولادت ۲۳ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۱ ستمبر ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ابھی ان کی عمر تین اور چار سال کے درمیان تھی کہ والد بزرگوار سید ابوالحسن صاحب مجتہد کو تکمیل علوم کے لیے عراق جانا پڑا۔ وہ تمام متعلقین کو بھی ساتھ لے گئے۔ وہیں سید علی نقی صاحب کی بمقام نجف اشرف تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ اور دو سال کی قلیل مدت میں انھوں نے ابتدائی قاعدہ، قرآن مجید، فارسی کی دو کتابیں ختم کر کے عربی علم الصرف کی تحصیل شروع کر دی تھی۔ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں جب سن شریف تقریباً ۱۰ سال تھا اس وقت پورے خاندان نے ہندوستان کی جانب مراجعت کی اور مولانا علی نقی نے لکھنؤ میں رہتے ہوئے سلسلۂ تعلیم جاری کیا اور عالم فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ شعبان ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں خود بغرض تکمیل علوم

نجف اشرف کا سفر اختیار کیا اور وہاں پانچ سال قیام کر کے بہت سے علماء سے فیض حاصل کیا اور بہت سی اسناد حاصل کر کے ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں وطن واپس آ گئے (یہی مغربی آبادی میں لکھیں)۔ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات میں عربی اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ ۱۹۵۹ء تک اسی حیثیت میں کام کیا۔ بعدہٗ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں صدر شعبۂ شیعہ دینیات ہو کر چلے گئے اور چند سال بعد ریڈر کے عہدے پر کمر بچے میں اور ڈین آف شعبۂ تھیالوجی کے منصب پر فائز ہو کر ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہو گئے۔ ۱۹۷۹ء میں پاکستان تشریف لے آئے اور مجالس اور تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد تفسیر قرآن لکھنی شروع کی جس کی پہلی جلد جو پہلے دو پاروں پر مشتمل ہے ۱۹۸۵ء میں چھپی اور اس کی اشاعت کا بیڑا انہی کے ممتاز مخیر بزرگ حاجی سید علی اکبر صاحب رضوی نے اٹھایا[۱]

تفسیر فصل الخطاب جلد اول نہایت اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ درجہ کی، کاغذ بڑھیا، گیٹ اپ شاندار، مضمون کے اعتبار سے بھی نہایت میانہ روی سے کام لیا گیا ہے۔ زبان نہایت صاف، شستہ اور رواں ہے۔ غرض ہر لحاظ سے اس کو اچھی کوشش و کاوش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مفسر علام نے تفسیر شروع کرنے سے پہلے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں قرآن سے متعلق ہر طرح کی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مثلاً لفظ قرآن کی لغوی تشریح۔ قرآن اور حدیثِ قدسی میں فرق۔ حدیثِ نبوی

---

[۱] تفسیر فصل الخطاب جلد اول صفحات "ک" "یا" "ل"

اور حدیث قدسی، قرآن کے اصطلاحی معنی، کلام الٰہی کے معنی اور قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا معرکہ وغیرہ۔ ان میں دو موضوعات بہت اہم ہیں جن پر مفسر نے خاص توجہ دی ہے ایک جمع و تدوین قرآن اور دوسرا لفظی تحریف۔

جمع و تدوین قرآن کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ قرآن بذریعہ وحی نازل ہوا۔ جب کوئی حصہ نازل ہوتا اور کوئی لکھنے والا آجاتا یا پہلے سے موجود ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے کاغذ یا چمڑے یا درخت کی چھال جو کچھ ملتا اس پر لکھوا دیا کرتے تھے۔ ساتھ ہی صحابہ حفظ بھی کر لیتے تھے۔ لیکن نہ تو سارے کی تحریریں ایک جگہ جمع تھیں اور نہ سوائے حضرت علیؑ کے کسی کو سارا قرآن حفظ تھا۔ لہٰذا رحلت رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ نے تو تنزیلی ترتیب کے ساتھ سارا قرآن ایک جگہ جمع کر دیا۔ مگر جب اسے آپ نے ارباب اقتدار کے سامنے پیش کیا تو وہاں اسے رد کر دیا گیا۔ اور کہا گیا، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ خاموشی کے ساتھ اپنے اس جمع کردہ مصحف کو واپس لائے اور اپنے ذخیرۂ خاص میں محفوظ کر دیا۔[1]

جہاں تک اہل اقتدار کا تعلق ہے شروع میں تو ان کی پوری توجہ بدامنی کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی طرف رہی۔ جب اس سے فرصت ہوئی اور ان لڑائیوں میں حفاظِ قرآن کی کثیر تعداد قتل ہو گئی ..... تو اس وقت جمع قرآن کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اور اس خدمت کو زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا۔ جو رسالت مآبؐ کے آخری زمانہ کے کم عمر صحابہ میں سے ایک فرد تھے اور حفظ قرآن شوق و ذوق سے کیا تھا۔ انھوں نے بڑی

1۔ تفسیر فصل الخطاب جلد اول ص ۴۶

جانفشانی و عرق ریزی کے ساتھ کچھ اپنے حافظہ کی مدد سے اور کچھ اصحاب کے پاس سے متفرق طور پر تھوڑے تھوڑے اجزا جو تھے ان سب کو سامنے رکھ کر اور دوسرے صحابہ سے پوچھ کر قرآن مجید کو حکومت وقت کے زیر سایہ جمع کیا۔[1]

حکومت نے سیاسی اقتضا پورے کر لئے اور انہیں یا پھر ملنے کے بعد قرآن جمع تو کر لیا مگر ترتیب تنزیل کے مطابق نہ ہو سکی۔ اب یہ قرآن مجید کے اسلوب کا ایک معجزہ تھا کہ غیر مرتب شکل میں یکجا ہونے کے بعد بھی اس کی آیات کی افادیت برقرار رہی۔

...... اس کے ساتھ چونکہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے اس کے بالمقابل اپنے جمع کردہ قرآن کی اشاعت کرنا ضروری نہیں سمجھی (غالباً رفع شر کے خیال سے ایسا کیا گیا) اس سے یقینی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ موجودہ صورت سے جو کتاب جمع ہوئی اس میں کوئی فروگذاشت ایسی نہیں ہوئی ہے جس سے اس کی حقانیت کو صدمہ پہنچا ہو۔ اس طرح واقعی و حقیقی اجماع ہو گیا اس قرآن کی حقانیت پر جو بین الدفتین موجود ہے جس میں کسی اسلامی فرقہ کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔[2]

اس کے بعد نفی تحریف کے سلسلہ میں مفسر موصوف فرماتے ہیں: "اگر حضرت امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب اس قرآن کی اشاعت پر جو اس زمانہ حکومت کی جانب سے مرتب کیا گیا تھا صرف سکوت اختیار فرماتے تو بھی وہ اس کی حقانیت کی دلیل ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت نے اس پر

---

[1] تفسیر فصل الخطاب جلد اول ص ۶۵
[2] ایضاً ص ۶۵

سکوت ہی نہیں فرمایا بلکہ اپنے کلمات میں گویا اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔[1]

بعد ازاں تحریف کے متعلق علمائے شیعہ کے تصریحات بیان کرتے ہوئے مفسر موصوف رقمطراز ہیں کہ شیخ ابو علی طبرسی تفسیر مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

"قرآن میں زیادتی کا ہونا تو باجماع باطل ہے اور کمی کے متعلق کچھ شیعہ اور سنی ظاہر بین محدثین نے روایات نقل کر دیے ہیں کہ اس قرآن میں کچھ تغیر و تبدل اور نقصان ہوئے ہیں[2]۔ لیکن ہمارے علماء میں جو صحیح مذہب ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ اور یہی حق ہے جیسے جناب مرتضیٰ قدس اللہ روحہ نے ثابت کیا ہے"۔

نمونہ کے لیے ایک آیت کا ترجمہ اور تفسیر پیش کی جاتی ہے:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

ترجمہ: "تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہیں مدد مانگتے ہیں"

تفسیر: عبادت کے معنی ہیں اظہار تذلل یا حکم کی تعمیل جو کسی کو خدا

---

[1] تفسیر فصل الخطاب جلد اول ص ۷۶

[2] اس تمام بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مفسر موصوف محض اس تحریف کے تو صرف قائل ہیں کہ قرآن کی ترتیب نزول قائم نہیں رکھی گئی بلکہ حکومت نے بعض سیاسی تقاضے پورے کرنے کے لیے ترتیب اپنی مرضی کے مطابق کر لی جو ابتک قائم ہے۔ البتہ کمی کے متعلق کچھ شیعہ اور سنی ظاہر بین محدثین نے روایات نقل کر دیے ہیں اور غالباً انھیں روایات کی بنیاد پر سلسبیل فصاحت کے مرتب نے یہ تک لکھ دیا ہے کہ "مسلمانوں کا ایک جتھا جو بظاہر اسلام کا مدعی تھا وہ یہی چاہتا تھا کہ قرآن میں تحریف ہو۔ چنانچہ اس نے تحریف سے کام لیا۔ تحریف کمی، زیادتی، تغیر و تبدل اور تقدیم و تاخیر پر مشتمل ہے اور ہر طرح کی روایات کتب اسلام میں ملتے ہیں جن کے راویوں کی بھی تصدیق ائمہ نے فرمائی ہے"۔

یا خدا کا اوتار مان کر اختیار کی جائے۔ مطلق تعظیم جیسے کسی کو دیکھ کر کھڑا ہو جانا یا سلام کو جھکنا یا ہاتھ چومنا یا آستان بوسی کرنا عبادت نہیں ہے۔ نہ مطلق حکم کی تعمیل عبادت سمجھی جا سکتی ہے۔

دوسرا فقرہ "تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرے مقابل میں اور تجھ سے بے نیاز ہو کر کسی کو ہم مددگار نہیں سمجھتے

نَعْبُدُ اور نَسْتَعِیْنُ میں جمع کے صیغے "تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں" اور "تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں" اس احساس اجتماعیت کے تحفظ کے لیے ہیں جس کے لیے نماز میں انفرادی سے زیادہ جماعت کو پسند کیا گیا ہے۔ پھر نماز اگر انفرادی بھی ہو تو الفاظ زبان پر یہی ہونا ضروری ہیں گویا ہر بندہ اس صورت سے یہ چاہتا ہے کہ اول تو بارگاہ میں اکیلا حاضر نہ ہو بلکہ سب کے ساتھ مل کر آئے۔ اور اگر اکیلا آتا بھی ہے تو عرض معروض فقط اپنی ذات کی طرف سے نہ کرے بلکہ تمام بنی نوع کا نمائندہ بن کر جو عرض معروض کرے سب کی طرف سے کرے اور جو مانگے سب کے لیے مانگے۔

دوسرا مقام ہوتا تو "ہم" کی لفظ سے تخاطب میں عظمت کی شان پیدا ہوتی تھی مگر خدا کی بارگاہ میں اپنی ضرورت پیش کرنے کے موقع پر "میں" کی لفظ انانیت کا اظہار کرتی ہے۔ "ہم" کے استعمال میں یہ پہلو بھی ہے کہ یہ خود اپنی ہستی کو افراد اور اس کے خدمات کو قابل تذکرہ ہی نہیں سمجھتا اس سے انانیت اور خود غرضی دونوں باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

اردو میں لکھی جانے والی دیگر تفاسیر

مذکورہ بالا تفاسیر کے علاوہ اور بھی بہت سی مختصر اور مفصل تفسیریں اردو زبان میں لکھی گئیں۔ ان میں سے چند کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

جامع التفاسیر

نواب قطب الدین خان دھلوی

یہ اردو میں ساتویں منزل کی تفسیر اور مختلف تفسیروں کا خلاصہ ہے۔ اس کے لکھنے والے نواب قطب الدین خان دہلوی تھے جو ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۸۹ھ میں فوت ہوئے۔ شاہ محمد اسحٰق دہلوی کے شاگرد تھے اور فقہ، حدیث اور تفسیر میں کامل تھے۔ یہ تفسیر ۱۲۹۲ھ میں مطبع مرتضوی دہلی میں طبع ہوئی۔[1]

اعظم التفاسیر

مولانا رحیم بخش

مولانا رحیم بخش نے یہ تفسیر لکھی۔ اس کی سات جلدیں ہیں جو دہلی میں مسعود پریس سے ۱۳۱۱ھ سے ۱۳۱۷ھ کے درمیان شائع ہوئی ہے۔
تعارف قرآن میں بتایا گیا ہے کہ:

---

[1] تعارف قرآن ص ۲۲۹

• جناب مولانا رحیم بخش صاحب دہلوی۔ آپ بہت بڑے عالم فاضل، محقق ہیں۔ آپ کی تصانیف سے "اعظم التفاسیر" نہایت عمدہ تفسیر ہے۔ خوب صراحت اور تفصیل کے ساتھ ہر ایک مضمون کو لکھا ہے۔ اردو میں کوئی تفسیر میں نے ایسی نہیں دیکھی۔[1]

تفسیر اکسیر اعظم

قاضی احتشام الدین مراد آبادی

قاضی احتشام الدین مراد آبادی کی تصنیف ہے۔ مفسر موصوف مراد آباد کے مشہور عالم اور فقیہ تھے۔ انھوں نے ابتدائی کتب اپنے وطن میں پڑھ کر قاضی بشیر الدین عثمانی قنوجی اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے تکمیل علوم کی۔ ان کی یہ تصنیف کئی جلدوں میں ہے۔ ۱۳۱۳ھ میں انتقال ہوا۔[2]

تفسیر مواہب الرحمٰن

مولانا سید امیر علی

اس ترجمہ اور تفسیر کے مصنف مولانا سید امیر علی ہیں۔ اردو میں نہایت مفصل، مستند اور دلچسپ تفسیر ہے۔ پہلے ہندوستان میں شائع ہوئی پھر مکتبہ رشیدیہ لاہور نے نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ ان کے علاوہ پاکستان میں بعض اور ناشروں نے بھی اسے چھاپا۔[3]

---

1. تعارف قرآن ص ۳۰۴
2. نزہتہ الخواطر جلد ۸ ص ۱۵ بحوالہ تعارف قرآن ص ۲۳۶
3. تعارف قرآن ص ۲۰۹

احسن التفاسیر

سید احمد حسن دہلوی

احسن التفاسیر از سید احمد حسن دہلوی کئی ضخیم جلدوں میں ہے۔ مولانا حافظ عبدالرحیم کلاچوی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"احسن التفاسیر از سید احمد حسن صاحب وظیفہ خوار سرکار حیدر آباد دکن، مطبوعہ اردو تفسیروں میں سب سے زیادہ اچھی تفسیر ہے۔ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔"[1]

نزہۃ الخواطر از حکیم سید عبدالحئی سے پتہ چلتا ہے کہ مفسر سید احمد حسن دہلوی کا انتقال ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں ہوا۔[2]

تفسیر فوائد القرآن

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی

یہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے ترجمہ قرآن پر نہایت تحقیقی اور فاضلانہ حاشیہ ہے۔ جو ان کے شاگرد رشید علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء تا ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) نے تحریر کیا۔ اس تفسیری حاشیے کی تعریف بہت سے علماء نے کی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"ان کے تصنیفی اور علمی کمال کا نمونہ اردو میں ان کے قرآنی حواشی ہیں۔ جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ترجمہ کے ساتھ چھپے ہیں۔"

---

[1] لباب المعارف العلمیہ لاہور جلد ۱ ص ۱۰۱ بحوالہ تعارف قرآن ص ۲۵۴

[2] نزہۃ الخواطر جلد ۸ ص ۴۴ بحوالہ تعارف قرآن حاشیہ ص ۲۵۴

علامہ خالد محمود کی رائے ہے:

"مصنف نے سمندروں کو کوزے میں بند کر دیا ہے"۔[1]

ڈاکٹر حافظ قاری فیوض الرحمن کا کہنا ہے:

"اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں اور محاسن کے اعتبار سے اب تک کے تمام شائع شدہ حواشی میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں"۔[2]

اس حاشیہ کی خوبی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ:

"حکومت افغانستان نے اپنے سرکاری مطبع سے قرآنی متن کے ساتھ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ اور مولانا شبیر احمد صاحب کے حواشی کو افغانی علماء اور عوام کے فائدے کے لیے فارسی میں ترجمہ کر کے چھاپا ہے"۔[3]

تفسیر معارف القرآن

مولانا حافظ محمد ادریس کاندھلوی

اس نام کی تفسیر مفتی اعظم محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ہے جس کے بارے میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ معارف القرآن نام کی یہ دوسری تفسیر مولانا حافظ محمد ادریس کاندھلوی (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء ـ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء) کی لکھی ہوئی ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے دار العلوم دیوبند

---

[1] یادِ رفتگاں ص ۲۹۷

[2] ایضاً ص ۲۵۷

[3] یادِ رفتگاں۔ شائع کردہ مجلس نشریات اسلام، ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن ناظم آباد ۱ کراچی ص ۳۹۸

میں پڑھ کر سند فراغ حاصل کی۔ وہ امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ
کے شاگرد تھے۔ بعد فراغت مدرسہ امینیہ دہلی، دارالعلوم دیوبند
حیدرآباد دکن اور جامعہ عباسیہ بہاولپور میں درس و تدریس کے
فرائض انجام دیے۔ ۲۴ سال جامعہ اشرفیہ لاہور میں بطور شیخ الحدیث
تدریس پر مامور رہے۔ ۱۹۷۴ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ حضرت
مولانا جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت متقی اور پرہیزگار
انسان تھے۔ زندگی نہایت سادہ تھی۔ زہد و ورع اور فروتنی
اور کسرِ نفسی آپ کی نہایت نمایاں صفات تھیں۔ سالہا سال دار دیوبند
میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے کام کیا لہٰذا اس علم سے آپ کی طبیعت
کو خاص مناسبت تھی۔ اسی مناسبت کی بنا پر آپ نے یہ عظیم کام
انجام دیا۔ لیکن یہاں بھی اسی عجز و انکسار کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:
"اس تفسیر میں جو کچھ بھی علم ہے وہ سب کا سب خسروانِ علم و حکمت
کے دسترخوان کی بھیک ہے۔ میں نے ان در والوں کے نام بھی ظاہر
کر دیئے ہیں جہاں سے یہ بھیک ملتی ہے۔ تاکہ اگر کسی کو کچھ اور مانگنا
ہو تو براہِ راست وہاں سے مانگ لے۔"

تفسیر معارف القرآن میں ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا ہے
اور تفسیر میں متقدمین اور متاخرین کی کتب تفسیر کا خلاصہ ہے۔ کچھ جلدیں
حضرت مولانا نے خود شائع کی تھیں۔ باقی جلدیں آپ کے فرزند مولانا
مالک کاندھلوی نے مکمل کیں۔[1]

۱؎ معارف قرآن صفحات ۳/۱۶ ـ ۳/۱۷

معالم التنزیل

مولانا محمد علی صدیقی

یہ ترجمہ اور تفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے بھانجے مولانا محمد علی صدیقی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ وہ دارالعلوم شہابیہ سیالکوٹ کے بانی ہیں۔ انھوں نے "معالم التنزیل" کے نام سے اپنی مجوزہ تفسیر کی کئی جلدیں شائع کر دی ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے پیش نظر ایک بڑا منصوبہ ہے اس لیے ابھی یہ کام جاری ہے۔ خیال ہے کہ تکمیل کے بعد اس تفسیر کی تیس جلدیں ہوں گی۔[1]

تفسیر ہدایت القرآن

مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی

یہ تفسیر الگ پاروں کی صورت میں مکتبہ حجاز دیوبند سے شائع ہوتی ہے۔ مفسر مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی ہیں۔

مولانا ہاشمی کا انداز یہ ہے کہ وہ متن قرآن کے نیچے ترجمہ نہیں لکھتے۔ بلکہ متن کے اختتام پر تمام مشکل الفاظ کے معانی لکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد سامنے کے صفحہ پر ترجمہ اور مختصر تفسیر لکھتے ہیں۔ یہ انداز ان لوگوں کے لیے بے حد مفید ہے جو قرآن مجید کا ترجمہ سیکھنا چاہتے ہیں۔ ترجمہ عام فہم اور تفسیر مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے۔[2]

---

1. تعارف قرآن ص ۴۰۸
2. ایضاً ص ۴۱۰

تفسیر تیسیر القرآن

مولانا قاضی شمس الدین

یہ تفسیر مولانا قاضی شمس الدین نے لکھی ہے۔ قاضی صاحب کا وطنی تعلق ضلع اٹک سے ہے۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور وہیں سے سند فراغ حاصل کی۔ فراغت کے بعد گوجرانوالہ، دار العلوم دیوبند، پنڈی گھیب اور فیصل آباد میں درس و تدریس کا کام انجام دیا۔ ۱۹۶۰ء میں مدرسہ صدیقیہ گوجرانوالہ کی بنیاد رکھی اور وہاں دورہ حدیث و تفسیر کے طلبہ کو سالہا سال فیض پہنچایا۔ انھوں نے یہ تفسیر چار جلدوں میں لکھی ہے اور بہت خوب ہے۔[1]

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق کے مطابق اردو زبان میں تراجم و تفاسیر کی تعداد تین سو سے متجاوز ہے۔ الغرض دنیا کی زبانوں میں تنہا اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ موجودہ ذخیرۂ تفسیر کو دیکھ کر یہ کہنا شاید مشکل نہیں کہ ہند و پاک میں قرآن پر اس مختصر عرصہ میں خاصا کام ہوا ہے۔[2]

---

۱ تعارف قرآن ص ۳۲۲

۲ دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی ج ۶ ص ۵۳۵

تفاسیر کے اردو ترجمے

علماء نے قرآن کریم کی تفسیریں براہِ راست اردو میں لکھنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ دوسری زبانوں میں لکھی جانے والی تفاسیر کو بھی اردو میں منتقل کیا۔ چنانچہ تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ ترجموں کے ذریعہ بھی اردو کے تفسیری ادب میں کافی اضافہ ہوا ہے اور یہ سلسلہ دکنی اردو کے زمانے سے ہی جاری ہے۔ فارسی میں لکھی جانے والی تفسیر حسینی کا ترجمہ اب سے صدیوں پہلے ہو چکا تھا، چنانچہ اس کے حوالے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے جیسے اردو ادب میں اضافہ ہوتا رہا ویسے ویسے اہم تفاسیر کا ترجمہ بھی عربی اور فارسی سے اردو میں ہوتا رہا۔ بعد میں انگریزی میں لکھی جانے والی تفسیریں بھی اردو میں منتقل ہوئی ہیں۔ جیسے احمدیہ انجمن کے سربراہ مولانا محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر۔

اس وقت ان تفاسیر کی تعداد بھی کافی ہے جو ترجمہ کے ذریعہ مختلف زبانوں سے اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ذیل میں ان میں سے چند کے بارے میں لکھا جا رہا ہے۔

تفسیر ابن عباس

اردو ترجمہ مولانا عابد الرحمٰن صدیقی، مولانا عبد الحی فرنگی محلی

یہ ان تفاسیر میں سے ہے جو دورِ صحابہ میں کی گئیں۔ ان کے بیان کرنے والے خود صحابیِ رسول حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ ہیں۔ ان کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سے دوسری قرابت داری تھی۔ وہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے آپ کے چچا زاد بھائی بھی تھے اور ام المومنین حضرت میمونہؓ کی بہن لبابہ بنتِ حارث کے بطن سے ہونے کے سبب آپؐ کے بھانجے بھی تھے۔ ان کی ولادت اس زمانہ میں ہوئی جب حضورؐ مع صحابہ شعب ابی طالب میں محصور تھے۔ اور یہ زمانہ تین سال کا ہے۔ لہٰذا وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی پیدائش کے وقت شعب ابی طالب کے قیام کا کون سا سال تھا۔ اسی لیے مورخین کے درمیان ان کی عمر کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ صاحبِ مشکوٰۃ شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد "اکمال فی اسماء الرجال" میں بیان کرتے ہیں کہ "جب آنحضورؐ کی وفات ہوئی تو ان کی عمر ۱۳ سال کی یا ۱۵ سال کی تھی"[1] اس سے کچھ آگے وہ لکھتے ہیں "(وہ) امتِ محمدیہ کے بڑے عالم اور بہترین اشخاص میں سے تھے۔ آنحضورؐ نے حکمت، فقہ، تاویل قرآن کی ان کو دعا دی"[1] غلام احمد حریری مولف تاریخ تفسیر و مفسرین رقم طراز ہیں:

"ہمارے خیال میں عباس کی علمی شہرت و وسعت کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) ان کی سب سے بڑی وجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت دعا تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ

ترجمہ: اے اللہ اس کو دین کی فہم عطا کر اور اسے قرآن کی تفسیر سکھا دے۔

---

۱ اکمال فی اسماء الرجال (اردو) مولف صاحب مشکوٰۃ شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب رحمہم اللہ تعالیٰ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی ص ۵۰۲

دوسری روایت میں لوں ہے

اَللّٰھُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (ترجمہ) اے اللہ اسے کتاب وحکمت سکھا دے۔

جو شخص کتاب تفسیر بالماثور سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ ابن عباس سے جو روایات صحیح تفسیر کے سلسلہ میں منقول ہیں ان میں دعائے نبوی کی تاثیر صاف جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

(۲) ابن عباس خاندان نبوت میں پروان چڑھے اور آغاز طفولیت سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وابستہ قراک رہے۔ اس کے نتیجہ میں انھوں نے بہت کچھ آپ سے سنا اور ان احوال وحوادث میں بذات خود شریک ہوئے جن کے بارے میں قرآن نازل ہوا تھا۔

(۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابن عباس اکابر صحابہ کی صحبت میں رہ کر ان سے اخذ واستفادہ کرتے رہے۔

(۴) آپ عربی زبان اور ادب اور اس کے خصائص واسالیب کے یگانہ روزگار فاضل تھے۔ بسا اوقات عربی اشعار سے استشہاد فرماتے۔[1]

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آپ اپنی خالہ ام المومنین حضرت میمونہ کی وجہ سے عہد رسالت کے آخری دو تین سالوں میں زیادہ تر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے بلکہ کبھی کبھی

---

[1] تاریخ تفسیر ومفسرین۔ تالیف غلام احمد حریری۔ ملک سنز فیصل آباد ص ۲۹۶۔

رات بھی کاشانۂ نبوت میں گزارتے تھے اور آپ کے ساتھ نماز تہجد اور تلاوت کلام پاک میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ اس لیے ان کو حضور سے استفادہ کا کافی موقع ملا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل امین کو دیکھا بھی تھا۔[1]

حضرت عبد اللہ ابن عباس، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں بہت مقرب تھے۔ وہ ان کو اپنے نزدیک جگہ دیتے تھے اور جلیل القدر صحابہ کے ساتھ مشورہ دلرے میں ان کو بھی شریک فرمایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس آیت کی تفسیر دریافت کی

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا (الانبیاء ۔ ۳۰)

ترجمہ: کیا کفار نے دیکھا نہیں کہ آسمان و زمین بند تھے پھر ہم نے اس کو کھول دیا۔[2]

آپ نے کہا ابن عباس کے یہاں جاؤ اور جو تفسیر بیان کریں مجھے بتاتے جاؤ۔ ابن عباس نے فرمایا "اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ آسمان خشک تھا۔ اس سے بارش نہیں ہوتی تھی اور زمین بانجھ تھی اس لیے کچھ اگتا نہیں تھا۔ بارش کے طفیل یہ پودے اگانے لگی۔ گویا آسمان کا فتق (پھٹنا) بارش کے ساتھ ہے اور زمین کا پھل پودے اگانے سے" اس شخص نے جاکر یہ تفسیر حضرت ابن عمرؓ کو بتائی۔ انھوں نے یہ سن کر فرمایا "میں

1۔ اکمال فی اسماء الرجال ص ۴۲۳

2۔ ایضاً ص ۴۲۳

کہا کرتا تھا کہ ابن عباس کی یہ تفسیر قرآن میں جراُت مجھے پسند نہیں۔ مجھے اب پتہ چلا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے خصوصی علم ودیعت ہوا ہے۔[1]

چونکہ حضرت عباسؓ اور بعد میں حضرت ابن عباسؓ کا گھربار اور زمین جائیداد مکہ اور طائف میں تھی اس لیے ان کا قیام دورِ خلافت میں زیادہ تر مکہ میں رہا۔ اور وہاں وہ قرآن، تفسیر اور حدیث کا درس دیتے رہے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی ۶۸ھ میں جب ان کا قیام طائف میں تھا انھوں نے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

حضرت ابن عباس کے زمانہ میں تعلیم زبانی ہوتی تھی۔ اور علوم اسلامی تحریر میں نہیں آئے تھے اس لیے ان سے جو تفسیر منسوب ہے وہ بعد میں اہل علم نے ان کی مرویات سے لکھا ہے۔ اس لیے وثوق سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تفسیر الحاقات سے پاک صاف ہے۔ تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس میں بہت سا حصہ ان کا بیان کردہ ہے۔[2]

یہ تفسیر مصر سے کئی بار چھپ چکی ہے۔ اس کو ابو طاہر محمد بن یعقوب الفیروز آبادی شافعی نے جمع کیا ہے۔

تفسیر ابن عباس کا اردو ترجمہ تین جلدوں میں مولانا عبدالرحمٰن صدیقی نے کیا ہے۔ قرآنی آیات کے نیچے مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ دیا گیا ہے اور تفسیر کا ترجمہ اس کے بعد ہے۔[3] دوسرا ترجمہ محمد رمضان اکبر آبادی شاگرد مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا ہے۔

---

1 تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۷۰
2 تعارف قرآن ص ۹۴
تعارف قرآن ص ۳۴۳

جامع البیان فی تفسیر القرآن

چونکہ یہ عظیم مورخ و محدث ابن جریر طبری کی لکھی ہوئی تفسیر ہے اس لیے اس کو تفسیر طبری کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ مفسر علام کا پورا نام محمد بن جریر بن یزید طبری اور کنیت ابو جعفر ہے۔ وہ اپنے زمانے کے بڑے عالم اور مجتہد تھے۔ مختلف علوم پر ان کو دسترس حاصل تھی چنانچہ ہر علم پر ان کی نہایت ضخیم تصانیف تھیں لیکن اب ان میں سے صرف دو باقی ہیں۔ (۱) تفسیر قرآن (۲) تاریخ الامم والملوک۔ طبری کی ولادت ۲۲۴ھ میں علاقہ طبرستان میں ہوئی تھی۔ تحصیل علم کے لیے وہ مختلف دیار و امصار میں گھومتے پھرے اور آخر کار بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں اداروں کو تمام علمی کام کیے اور آخر کار شوال ۳۱۰ھ میں فوت ہو گئے۔ شروع کے دس سال وہ فقہ کے شافعی مسلک کو اختیار کیے رہے اس کے بعد اجتہاد سے کام لے کر خود اپنا جداگانہ مسلک قائم کیا جس کی وجہ سے خاص طور پر حنبلیوں سے تصادم ہوا مگر انھوں نے اپنے مسلک سے رجوع نہیں کیا۔ اس لیے ان کی جماعت کو فرقہ جریریہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ چونکہ ان کے فقہ میں بعض باتیں شیعہ مسلک کی بھی ہیں اس لیے بعض لوگ تو ان کو ایک شیعہ فرقہ کا سربراہ کہتے ہیں یا الزام لگاتے ہیں کہ "وہ شیعہ کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے"۔ بعض حضرات صرف اسی قدر کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ "آپ میں کسی حد تک تشیع پایا جاتا ہے۔" جو حیرت کا باعث نہیں۔ قطع نظر اس کے کہ کون سا صحیح ہے اور کون غلط، یہ بات باعث حیرت ہے کہ ان کے فقہ پر اب دنیا کے کسی حصہ میں عمل نہیں ہوتا۔ البتہ ان کی

لکھی ہوئی تاریخ اور تفسیر آج بھی دنیا میں قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔
جہاں تک "تفسیر قرآن" کا تعلق ہے وہ بھی ان کی دوسری تصانیف کی طرح ناپید ہو چکی تھی۔ لیکن اتفاق سے اس تفسیر کا ایک کامل مخطوطہ امرائے نجد میں سے امیر حمود بن عبد الرشید کے ذخیرۂ کتب میں سے مل گیا۔ اور تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد اس کو نقل کر کے چھپوا دیا گیا۔ اور اب یہ بہت سی جلدوں پر دستیاب ہے۔
تفسیر ابن جریر تیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اپنی صورت میں اگر اس کو تفسیر کی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بجا ہو گا۔ بہت سے علماء اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں
امام نودی کی رائے ہے کہ:۔
"اس امر پر ساری امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ تفسیر ابن جریر جیسی اور کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی۔ (الاتقان)
شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلی فرقہ کے امام ہونے کے باوجود فرماتے ہیں۔
"لوگوں میں جو کتب تفسیر متداول ہیں ان میں تفسیر ابن جریر ان سب سے صحیح تر ہے۔ اس میں علمائے سلف کے اقوال صحیح سند کے ساتھ مذکور ہیں۔ ابن جریر مقاتل بن سلیمان اور کلبی جیسے جھوٹے راویوں سے روایت نہیں کرتے۔"
(فتاوی ابن تیمیہ جلد ۲ ص ۱۹۲)
امام جلال الدین سیوطی رقم طراز ہیں:۔
"تفسیر ابن جریر جملہ کتب تفسیر سے اعظم و افضل ہے۔ اس میں تفسیری اقوال کی توجیہ و ترجیح، کلمات کی نحوی حالت، اعد

استنباط مسائل سے تعرض کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ تفسیر سابقہ کتب تفسیر پر فوقیت رکھتی ہے۔" (الاتقان جلد ۲ ص ۱۹۰)

علامہ احمد حریری اپنی تالیف "تاریخ تفسیر و مفسرین" میں لکھتے ہیں:

"ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تفسیر ابن جریر کو باقی کتب تفسیر کے مقابلہ میں دونوں قسم کا شرف التقدم حاصل ہے۔ چنانچہ یہ تفسیر زمانی سبقت و التقدم کی بھی حامل ہے اور فنی اعتبار سے بھی دیگر تفاسیر پر برتری رکھتی ہے۔ سبقت زمانی تو اس لیے کہ یہ اولین تفسیر ہے جو ہم تک پہنچی۔ اس سے قبل تفسیر کے سلسلہ میں جو کوششیں کی گئیں وہ گردش ایام کے ساتھ رخصت ہو گئیں اور ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں ماسوا ان اقوال کے جن کو ابن جریر نے اپنی کتاب میں سمو لیا ہے۔ جہاں تک اس تفسیر کی فنی برتری کا تعلق ہے اس کا مدار و انحصار اس کے اسلوب نگارش پر ہے جو مؤلف نے اختیار کیا ہے۔"

اتنی ضخیم کتاب کا ترجمہ کرنا ویسے بھی مشکل ہے پھر اس زمانہ میں اردو دان طبقہ میں کتنے فی صد لوگ ایسے ہوں گے جو اس کو پڑھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ ابھی تک اس پوری تفسیر کو اردو میں منتقل نہیں کیا جا سکا۔ صرف پہلے پارہ کا ترجمہ ہوا ہے جس کو بیت الحکمۃ دیوبند کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔

تفسیر القرآن العظیم ابن کثیر [1]

مترجم مولوی محمد

کتب تفسیر میں تفسیر ابن جریر کے بعد اس تفسیر کا درجہ ہے۔ اس کے

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مصنف حافظ ابن کثیر کا پورا نام عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر ہے۔ ان کا قدیم وطن شام کا قدیم شہر بصریٰ تھا۔ یہ وہی بصریٰ ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بارہ سال کے سن میں اپنے چچا کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ اور وہاں بحیریٰ راہب نے آپؐ کی ملاقات ہوئی تھی۔ ابن کثیر ۷۰۱ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کے انتقال کے بعد سات سال کے سن میں اپنے بھائی کی رفاقت میں دمشق چلے گئے وہاں بہت سے علماء سے علم حاصل کیا۔ ان میں ابن شحنہ آمدی، ابن عساکر، علامہ مزی کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ آخر میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے فیضیاب ہوئے۔ ان کا اثر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ مستقلاً ان سے تعلق قائم ہوگیا۔ اگرچہ بنیادی طور پر ابن کثیر کا فقہی مسلک شافعی تھا لیکن بہت سے مواقع پر انھوں نے حنبلی فقہ پر عمل کیا۔ چنانچہ طلاق کے مسئلہ میں ابن کثیر امام ابن تیمیہ کے مسلک کے مطابق فتویٰ دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن تیمیہ کی طرح ان کو بھی اذیتیں دی گئیں۔ ماہ شعبان ۷۷۴ھ میں فوت ہوئے اور مقبرہ صوفیہ میں اپنے استاد امام ابن تیمیہ کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

حافظ ابن کثیر کا علمی پایا نہایت بلند تھا۔ علماء نے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ علامہ داؤدی طبقات المفسرین میں لکھتے ہیں:

"آپ اپنے عہد و عہد کے یکتائے روزگار فاضل اور حافظ حدیث تھے۔ امام ذہبی اور سبکی کی وفات کے بعد مدرسہ اشرفیہ کے صدر المدرسین قرار پائے۔" (طبقات المفسرین داؤدی ص ۳۲۰)

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) لے تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس دہلی اور تفسیر ابن کثیر اردو شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

"ابن کثیر نے حدیث کے متون و رجال پر بنظر تحقیق مطالعہ کیا۔ تفسیر قرآن سے متعلق مواد فراہم کیا۔۔۔۔ تاریخ اسلام کے موضوع پر اپنی عظیم کتاب "البدایہ والنہایہ" مرتب کی"

علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ:

"ابن کثیر بڑے محدث، فقیہہ، مفسر اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے"

تفسیر ابن کثیر قرآن کریم کی تفسیر ماثورہ پر مشتمل کتب میں حد درجہ شہرت رکھتی ہے۔ یہ تفسیر چار ضخیم جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تفسیر ماثور میں جو اسرائیلی واقعات مندرج ہیں وہ اجمالاً اور بعض اوقات تفصیلاً اس پر نقد و جرح کرتے ہیں۔ مثلاً آیت کریمہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً (سورۂ بقرہ ۶۷) کی تفسیر کرتے ہوئے بنی اسرائیل کی گائے کا طویل قصہ ذکر کیا ہے۔ پھر اس میں سلف سے منقول روایات تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

ابوعبیدہ، ابوالعالیہ اور سدی سے جو روایات منقول ہیں ان میں اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ روایات بنی اسرائیل کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ بلاشبہ ان کو نقل کرنا درست ہے مگر ان کی تصدیق و تکذیب نہیں کی جاسکتی لہٰذا ان پر اعتماد کرنا درست نہیں ماسوا ان روایات کے جو اسلامی حق الحق سے لگا کھاتی ہوں"

تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ کئی جلدوں میں ہو چکا ہے مترجم مولوی محمد صاحب سابق مدرس و مہتمم مدرسہ محمدیہ و مالک و مہتمم اخبار محمدی

بارہ جلد در اردو دہلی ہیں۔ جلد اول میں پہلے چھ سیپاروں کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ ترجمہ نہایت رواں اور بامحاورہ ہے۔ غرض اس تفسیر کے ترجمہ سے اردو کے تفسیری ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

تفسیر جلالین[1]

مترجم غلام محی الدین مہدی اور مولانا محمد انور داد جبلی

جلالین لفظ جلال کا تثنیہ ہے جس کے معنی دو جلال ہیں۔ چونکہ یہ تفسیر جلال الدین نام کے دو بزرگوں نے لکھی ہے اس لیے اس کو تفسیر جلالین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پہلے بزرگ جنھوں نے اس کام کو شروع کیا جلال الدین محمد بن احمد بن محمد بن ابراہیم المحلی الشافعی تھے۔ دوسرے امام جلال الدین سیوطی۔

جلال الدین محلی ۷۹۱ھ میں مصر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جملہ علوم میں مہارت حاصل کی۔ وہ نہایت ذکی و فہیم، عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار انسان تھے۔ حق کے اظہار میں نہایت نڈر اور بے باک تھے۔ کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ حکومت کی جانب سے انھیں قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا گیا مگر انھوں نے قبول نہیں کیا بلکہ زندگی بھر تجارت سے اپنی روزی پیدا کی۔ ان کا انتقال یکم محرم ۸۶۴ھ کو ہوا۔

علامہ جلال الدین سیوطی ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام جلال الدین ابوالفضل عبدالرحمن بن ابوبکر سیوطی ہے۔ آپ شافعی المسلک تھے۔ پانچ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ باپ نے انتقال سے پہلے آپ کو چند لوگوں کی تحویل میں

---

[1] کمالین شرح اردو جلالین شریف۔ مکتبہ شرکت علمیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان شہر

دے دیا تھا۔ کچھ تو ان لوگوں کی توجہ سے اور کچھ اپنی ذاتی صلاحیت اور فطرت سلیم کی بدولت نیک راہ پر گامزن ہوئے اور جلد علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔ ان کے اساتذہ اور شیوخ کی تعداد اکیاون ہے۔ ان کا شمار کثیر التصانیف علماء میں ہوتا ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ پانچ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مؤلف تھے۔ جن میں سے الاتقان، الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، اور تاریخ الخلفاء کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تفسیر جلالین کی تکمیل آپ نے کی۔ ۹۱۱ھ میں فوت ہوئے۔

صاحب کشف الظنون حاجی خلیفہ کے بیان کے مطابق تفسیر جلالین کے پہلے پندرہ پارے سورہ بنی اسرائیل کے اختتام تک شیخ جلال الدین محلی نے مکمل کیے اور آخر کے پندرہ پاروں کی تفسیر جلال الدین سیوطی نے کی۔ اس میں سورہ فاتحہ کی تفسیر بھی شامل ہے۔

لیکن اس معاملہ میں صاحب کشف الظنون کو تسامح ہوا ہے۔ اس لیے کہ علامہ سیوطی خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ تفسیر سورہ بقرہ سے سورہ اسراء تک مکمل کی۔ جہاں سورہ الاسراء ختم ہوتی ہے وہاں تحریر کیا ہے کہ میں نے جو تفسیر کی تکمیل کرنی چاہی تھی یہ اس کا اختتام ہے (مقدمہ جلالین ج ۱، ص ۲۳۲)

حقیقت یہ ہے کہ امام جلال الدین المحلی نے تفسیر جلالین کا آغاز سورہ الکہف سے کر کے سورہ الناس پر اس کو ختم کیا۔ پھر سورہ الفاتحہ سے آغاز کیا۔ لیکن اس سورہ کی تفسیر ابھی ختم ہی کی تھی کہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ باقی کام امام جلال الدین سیوطی نے انجام دیا۔ انھوں نے سورہ البقرہ سے شروع کر کے سورہ الاسراء پر ختم کر دیا۔ سورہ الفاتحہ کی تفسیر چونکہ جلال الدین محلی کر چکے تھے اسی لیے ان کے کام کے ساتھ ملا دی

کے لیے اس کو سورہ الناس کے بعد لگا دیا۔[1]

تفسیر جلالین نہایت مختصر، دلکش اور عمیق عبارت میں ہے اس لیے ہر زمانہ میں نہایت مقبول ہوئی۔ اور نصاب میں داخل رہی، اس وقت بھی درس نظامی میں تفسیر کی بنیادی کتاب یہی قرار دی جاتی ہے۔ اس کی اسی مقبولیت و اہمیت کی وجہ سے اس پر بہت کام ہوا ہے۔ اردو میں بھی اس کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ ایک ترجمہ اور شرح کمالین کے نام سے استاد تفسیر دار العلوم دیوبند مولانا محمد نعیم صاحب نے کیا ہے جو مکتبہ شرکت علمیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان شہر سے شائع ہوا ہے۔ ترجمہ نہایت رواں اور شگفتہ ہے۔ اور تفسیر جلالین کے اختصار کی وجہ سے جو باتیں طلب کے لیے ناقابل فہم ہیں ان کی آسان زبان میں تشریح کر دی گئی ہے۔ غرض کمالین شرح اردو جلالین قرآن فہمی کے لیے نہایت مفید ہے۔

تفسیر جلالین کا ایک ترجمہ غلام محمد مہدی نے کیا ہے جو ۱۲۷۵ھ میں شائع ہوا تھا۔ ایک اور ترجمہ مولانا محمد ابوذر سنبھلی نے کیا تھا جو ۱۹۰۵ء میں اعجاز محمدی پریس آگرہ سے چھپا تھا۔

تفسیر مظہری[2]

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی

مترجم مولانا سید عبد الدائم جلالی

کسی ہندی نژاد کے قلم سے عربی زبان میں لکھی جانے والی غالباً یہ سب سے پہلی اور واحد تفسیر ہے جو اتنی تفصیلی، اس قدر جامع اور ایسی سادہ اور واضح ہے اور

۱۔ تاریخ تفسیر و مفسرین (غلام احمد حریری) ص ۳۸۹

۲۔ تفسیر مظہری اردو ترجمہ از مولانا سید عبد الدائم الجلالی، شائع کردہ ایچ ایم سعید کمپنی۔ ادب منزل پاکستان چوک۔ کراچی

اعتدادِ زمانہ کے باوجود جس کی شہرت و مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ یہ تفسیر حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی نے اب سے تقریباً دو سو سال پہلے لکھی تھی۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء اپنے زمانہ کے عظیم محدث اور مفسر تھے۔ قاضی صاحب پانی پت کے رہنے والے تھے۔ اتنے ذہین اور ذکی الطبع تھے کہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور سولہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے۔ حدیث کی سند امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی سے حاصل کی۔ سلسلہ طریقت میں اول شیخ محمد عابد سے استفادہ کیا۔ ان کی رحلت کے بعد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں سے بیعت ہو گئے۔ ان کے علو مرتبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اپنے انتہائی علم و فضل کے باوجود ان کو بیہقی وقت کہتے تھے اور خود ان کے شیخ طریقت مرزا مظہر جانِ جاناں ان کو علم الہدیٰ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔[1]

قاضی صاحب تقویٰ و دیانت میں نہایت ممتاز بلکہ بے مثال تھے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، کلام اور تصوف میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ یوں تو آپ نے مختلف علوم پر کئی کتابیں لکھی ہیں لیکن آپ کی زیادہ شہرت آپ کی تفسیر قرآن کی وجہ سے ہے۔ اس تفسیر کو قاضی صاحب نے اپنے مرشد مرزا مظہر کے نام معنون کرتے ہوئے اس کا نام تفسیر مظہری رکھا اور آج تک یہ اسی نام سے شائع ہوتی رہی ہے۔

---

[1] تعارف قرآن ۔۔۔ حواشی صفحات ۱۵۹، ۱۶۰

تفسیر مظہری کا اسلوب سادہ اور بے تکلفانہ ہے۔ قاضی صاحب نے امام جلال الدین سیوطیؒ کی تفسیر "در منثور" کا طرز اختیار کیا ہے یہی طرز سلف صالحین کا ہے۔ آپ ہر آیت کے مضمون کو احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال سلف سے واضح فرماتے ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر ایک حنفی فقیہہ ہیں۔ اس لیے آیات قرآنی سے فقہی مسائل اور شرعی احکام کا استنباط نہایت اچھے انداز سے کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی احناف و شوافع وغیرہ کے نظریاتی اختلافات بھی واضح کرتے ہیں۔ تفسیر مظہری میں تصوف کے بے شمار مسائل بکھرے پڑے ہیں۔ اور تاریخ ادبیات کے بیان کے مطابق اگر ان مسائل کو جمع کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب اعتقادی مرتب ہو سکتی ہے[۱]

اس تفسیر کی بے پناہ افادیت کو دیکھتے ہوئے ندوۃ المصنفین دہلی کے رکن مولانا عبد الدائم جلالی الاسپھدی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا اور ندوۃ المصنفین نے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۱ء تک کے عرصہ میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ دس جلدوں میں شائع کیا۔ پھر پاکستانی مسلمانوں کے فائدہ کے لیے سعید اینڈ کمپنی کراچی نے بارہ جلدوں میں چھاپ کر وقف عام کیا۔ چنانچہ کمپنی کے مالک محترم حاجی محمد زکی صاحب پہلی جلد میں عرض ناشر کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں۔

" اس اہم تفسیر کے گوناگوں فوائد اور دور حاضر کی اہم ضرورت کے پیش نظر الحمد للہ تعالیٰ ہم نے اس اہم کام کی اشاعت کی ہمت کی تھی۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ جولائی ۱۹۷۰ء تک

۱؎ ثقافت قرآن ص ۲۵۲

بعد بارہویں جلد کی اشاعت پر یہ تفسیر مکمل ہو گئی۔[1]

بیان القرآن[2]

مولانا محمد علی لاہوری

یہ ترجمہ و تفسیر مولانا اشرف علی تھانوی کی مشہور تفسیر بیان القرآن سے مختلف ہے۔ اس کے لکھنے والے لاہوری احمدیہ جماعت کے سرخیل مولانا محمد علی لاہوری ہیں اور اس کو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے شائع کیا ہے۔ مولانا محمد علی نے ابتداءً قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر انگریزی زبان میں کیا تھا۔ لیکن پھر اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی غرض سے اس کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ چونکہ اردو میں تفسیر کو زیادہ پھیلا کر بیان کیا گیا ہے اس لیے اس کی ضخامت کافی بڑھ گئی ہے۔ پہلی مرتبہ سہولت کے خیال سے اس کو تین جلدوں میں چھاپا گیا تھا۔ یہ ایڈیشن ۱۹۳۲ء تک کے عرصہ میں شائع ہوا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اس کے تین ایڈیشن ایک ایک جلد میں شائع ہوئے ہیں۔ یعنی ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۰ء میں اس کو نہایت اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ مترجم و مفسر خود تمہید فرماتے ہیں:

"وہ مقدس پیغام (قرآن کریم) ان لوگوں کی زبان میں نازل ہوا جنھوں نے دنیا میں اس کے حامل بننا تھا۔ مگر آج اس عالم کے مختلف اطراف و اکناف میں رہنے والے مسلمان اس زبان

۱؎ تفسیر مظہری شائع کردہ ایچ ایم سعید کمپنی، حرفِ ناشر ص ۲

۲؎ بیان القرآن اردو ترجمہ از مولانا محمد علی۔ شائع کردہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور ۱۴۰۱ھ۔

سے نا آشنا ہیں۔ اور بہت ہیں کہ اس پیغام کو پڑھتے ہیں مگر انہیں علم نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس پیغام کی غرض یہ تھی کہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں اور غلط راہوں کو چھوڑ کر، اپنی دینی اور دنیوی فلاح کا صحیح راستہ اختیار کریں، تو اس کا مطلب سمجھے بغیر وہ غرض حاصل نہیں ہوتی۔ میں نے جب تبلیغ اسلام کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے انگریزی میں اس پاک کلام کے ترجمہ اور مطلب کو بیان کیا تو بہت سے احباب نے یہ اصرار کیا کہ اردو زبان میں بھی اپنے اہلِ ملک کے فائدہ کے لیے اسے شائع کیا جائے۔ مگر یہاں کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اذسرِ نو یہ کام کرنا پڑا۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان قرآن کریم کو پڑھے اور اس کے مطلب سے آگاہ ہو کہ اپنی روزمرہ زندگی میں اور مشکلات پیش آمدہ میں اپنا ہادی اور رہنما بنائے۔ اس راہ کو اختیار کیے بغیر مسلمان کبھی موجودہ مشکلات سے باہر نہیں نکل سکتے۔"

آگے چل کر مترجم و مفسر جناب محمد علی فرماتے ہیں:

"اس ترجمہ اور ان حواشی میں ایک بات کی طرف بالخصوص توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ قرآن کریم سے اجنبیت نے جن دلوں میں یہ خیال پیدا کیا ہے کہ اس پاک کتاب کے مضامین میں کوئی ترتیب نہیں انھوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہے اور یہ ایک ابلغ اور محکم ترتیب ہے۔ مخالفین میں غور و خوض کی کمی نے بے ترتیبی کا خیال پیدا کیا یہاں تک کہ اس زمانہ میں ایک مسلمان نے بھی ان خیالات سے

متاثر ہو کر ایک ترتیب نزولی اپنے پاس سے بنا کر قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔"

غرض مترجم و مفسر نے سطور بالا میں جو خیالات پیش کیے ہیں وہ مسلمانوں کے سواد اعظم سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس میں مرزا بشیر الدین محمود کی تفسیر صغیر سے نمایاں فرق نظر آئے گا۔ اس فرق کو جاننے کے لیے مندرجہ ذیل آیات کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ کیجیے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۲۲، ۳۳ : ۴۰)

ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

تفسیر: خاتم النبیین کی تفسیر احادیث نبوی سے: خاتم النبیین کے معنی لغت سے اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ایک قوم ہیں اور کسی قوم کا خاتم یا خاتم ہونا صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے یعنی ان میں سے آخری ہونا۔ پس نبیوں کے خاتم کے معنی نبیوں کی مہر نہیں بلکہ آخری نبی ہیں۔ یہاں ان سب احادیث کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں جن میں خاتم النبیین کی تشریح کی گئی ہے یا جن میں آنحضرت صلعم کے بعد نبی کا نہ آنا بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ احادیث متواترہ ہیں جو صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہیں۔ اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد نبی نہیں۔[1]

---

[1] بیان القرآن — از مولانا محمد علی لاہوری، مطبوعہ (متن اور حاشیہ) ص ۱۱۰۲

ان کے علاوہ اور بہت سی مکمل اور نامکمل تفاسیر ہیں جو عربی یا فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) التفسیرات الاحمدیہ۔ اس کا پورا نام "التفسیرات الاحمدیہ فی بیان آیات الشرعیہ" لیکن تفسیر احمدی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مؤلف ملا جیون امیٹھوی (۱۰۴۷ھ تا ۱۱۳۰ھ) ہیں۔ اردو میں ترجمہ حکیم سید امیر حسن خاں صہبا نے کیا ہے۔

(۲) تفسیر عزیزی موسوم بہ تفسیر فتح العزیز۔ از شاہ عبد العزیز محدث دہلوی۔ سورۂ بقرہ حصہ اول ـــــــ شائع کردہ ایچ ایم سعید کمپنی۔

(۳) انوار الرحمٰن ترجمہ و تفسیر آل عمران۔ مترجم محمد عبد الصمد ـــــــ شائع کردہ ادارہ علمیہ لاہور۔

(۴) بستان التفاسیر اردو تفاسیر اردو ترجمہ تفسیر فتح العزیز (فاتحہ و بقرہ) ـــــــ مترجم محمد علی بجا تیلپوری۔ مطبوعہ مطبع نا فخری، دہلی۔

(۵) تفسیر ابن عربی۔ از شیخ اکبر محی الدین ابن عربی ـــــــ ترجمہ از امیر حسن خاں صہبا۔

(۶) انوار التنزیل ترجمہ تفسیر بیضاوی ابو الخیر عبد اللہ بن عمر البیضاوی متوفی (۶۸۵ھ) قاضی ناصر الدین مطبوعہ قاسمی پریس دیوبند۔

(۷) تفسیر فی ظلال القرآن (پارہ الم) از سید قطب شہید ـــــــ ترجمہ مولانا سعید الرحمٰن

منظوم تراجم و تفاسیر

(۱) ریاض دلکشا ـــــــ تفسیر سورۂ یوسف

(۲) تفسیر منظوم ـــــــ آغا شاعر قزلباش دہلوی۔

باب پنجم

مذکورہ بالا جائزہ سے نتائج کا استخراج اور اس پر تبصرہ

اردو میں تفسیر نگاری کے مکاتب فکر

اور

ان کے اسلوب و منہاج کا جائزہ

قرآن کریم یقیناً کتاب ہدایت ہے۔ جیسا اس کا نازل کرنے والا خود فرماتا ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ کتاب اسی شخص کو ہدایت دیتی ہے جو ان باتوں پر یقین وایمان رکھتا اور عمل کرتا ہو۔ یعنی وہ غیب پر ایمان رکھتا ہو، نماز ادا کرتا ہو اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہو اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو۔

راہ ہدایت کے متلاشی کو ہدایت پانے کے لیے تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس کو سمجھے اور تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس کے مطابق عمل کرے۔ یہ تینوں مرحلے صحیح طور پر طے ہونے چاہئیں۔ یعنی اس کتاب کی تلاوت صحیح ہونی چاہیے اس کی تفہیم صحیح ہونی چاہیے۔ اور اس کے اوامر ونواہی کی تعمیل صحیح ہونی چاہیے۔

اور تلاوت، تفہیم اور تعمیل کی صحت کی ضمانت صرف وہی ذات دے سکتی ہے جس پر یہ کتاب نازل ہوئی اور جو نوع بشر کے لیے ہادی بن کر مبعوث ہوئی۔ وہ ذات حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اگر قرآن کریم کتاب ہدایت ہے تو حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم ہادی برحق ہیں۔ لہٰذا ہادی برحق سے بڑھ کر صحیح ہدایت کون دے سکتا ہے۔ اور ہمارا صرف عقیدہ ہی نہیں ہے کہ ہدایت کے تینوں مرحلوں کی صحت کا حضورؐ نے پورا پورا اہتمام کیا۔ بلکہ اس کے لیے ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں جو ناقابلِ تردید ہیں اور جن کا اعتراف غیروں کو بھی ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ تو باری تعالیٰ نے خود یہ کہہ کر کیا ہے: "نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" (ہم ہی نے اسے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)۔ اس ذات نے اپنا وعدہ اس طرح پورا کیا کہ اس کتاب کا جتنا حصہ وہ نازل کرتا اتنا حصہ حضورؐ کے لوحِ قلب پر محفوظ ہو جاتا۔ پھر آپؐ اس کی حفاظت کا یہ انتظام کرتے کہ جو صحابی اس وقت آپؐ کے پاس موجود ہوتا اس کو وہ حصہ لکھوا دیتے اور زبانی یاد کرا دیتے۔ اس طرح کلام پاک سفینہ اور سفینہ دونوں میں محفوظ ہو جاتا۔ اس اعلیٰ انتظام کی کسی قدر تفصیل ایک غیر مسلم سے سنیئے۔ وہ کہتا ہے:

"تمام ذرائع اس بات پر متفق ہیں کہ جب قرآن کا کوئی جزو نازل ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خواندہ صحابہ میں سے کسی ایک کو بلاتے اور اس وحی کا اس کو املا کرا دیتے اسی وقت اس بات کی بھی نشاندہی فرما دیتے تھے کہ جو کچھ

پہلے نازل ہو چکا ہے اس متن کے کس مقام پر اس نئے جز
کو درج کیا جائے۔۔۔۔۔۔۔ روایات سے پتہ چلتا ہے
کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کاتبوں سے ارشاد
فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ ان کو املا کرایا ہے اس کو آپؐ کے
سامنے پڑھ کر سنائیں۔ تاکہ اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو آپؐ
اسے درست فرما دیں۔ ایک اور مشہور روایت یہ بھی ہے
کہ ہر سال ماہِ رمضان المبارک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم پورا قرآن مجید (جتنا نازل ہو چکا ہوتا) حضرت جبرئیلؑ
کو پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ
وسلم کی رحلت سے پہلے کے مہینے میں حضرت جبرئیلؑ نے
آپؐ سے دو مرتبہ پڑھوا کر سنا تھا۔۔۔۔۔ یہ بات معلوم
ہے کہ کس طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ
سے مسلمان ماہِ رمضان کے دوران شب بیداری کرتے
اور عام نمازوں کے علاوہ تمام قرآن کی تلاوت کرنے
کے عادی ہو گئے ہیں۔ کئی ذرائع سے مزید انکشاف ہوتا
ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کاتب حضرت
زیدؓ متنوں کے آخری مرتبہ جمع کرنے کے موقع پر موجود تھے۔
دوسری جگہ بہت سی دوسری شخصیتوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔
لیکن اس کے ساتھ ہی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے
مومنین کو یہ بھی ہدایت فرمائی تھی کہ وہ قرآن کریم کو حفظ
کریں۔ چنانچہ اگر پورا نہیں تو اس کا کچھ حصہ جس کی قرأت
نمازوں میں کی جاتی تھی خود حفظ کر لیتے تھے۔ اس طرح

ایسے حفاظ کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جن کو تمام قرآن یاد تھا اور اس کو وہ حضرات دُور افتادہ مقام پر پھیلاتے تھے۔ متن کو دو طریقوں پر یعنی تحریر اور حفظ کے ذریعہ محفوظ کرنے کا یہ قاعدہ بے انتہا مفید ثابت ہوا۔[1]

یہ تو عہدِ رسالت میں قرآن کریم کی حفاظت کا انتظام تھا۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ میں اس کی صحت کا پورا خیال رکھا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھوائے ہوئے نسخہ کی نقل کرائی اور بقول ماریس بوکائیے خلیفہ ثانی کی تحریک پر زیدؓ نے مدینہ میں جتنی بھی معلومات فراہم ہو سکتی تھیں حاصل کیں۔ حفاظ کی شہادت مختلف چیزوں پر افراد کی بھی طرح پر لکھی ہوئی الکتاب کی نقلیں سب کچھ اس مقصد کے لیے تھا کہ نقل کر لے میں تمام ممکنہ غلطیوں سے بچا جا سکے۔ اس طرح قرآن کی ایک بے انتہا قابلِ اعتماد نقل تیار ہو گئی۔[2]

یہ قابلِ اعتماد نقل حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے پاس محفوظ رہی اور انھوں نے اپنی وفات کے وقت اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سپرد کی۔[3]

---

[1] بائیبل، قرآن اور سائنس مصنفہ موریس بوکائیے (اردو) ناشر ادارہ القرآن والعلوم الاسلامیہ ۴۳۰/ ڈی۔ گارڈن ایسٹ نزد سبیلہ چوک کراچی ۵
سنہ اشاعت فروری ۱۹۸۱ء ص ۱۶۲
[2] ایضاً ص ۱۶۲، ۱۶۳ [3] ایضاً ص ۱۶۳

حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت تک پہنچتے پہنچتے فتوحات کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔ بہت سے وہ عرب قبائل جو دُور دراز کے علاقوں میں آباد تھے، مسلمان ہوئے تو انھوں نے قرآن کریم کو اپنے لہجہ اور قرأت میں پڑھنا شروع کر دیا۔ اور غیر عربوں میں اسلام پھیلا تو چونکہ عربی زبان ان کے لیے اجنبی تھی اس لیے وہ صحیح قرأت کے ساتھ قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان قباحتوں کی وجہ سے اختلافات اور تنازعات شروع ہو گئے۔ جب اس کی اطلاع حضرت عثمان غنیؓ کو ہوئی تو صحابہ کے مشورے سے آپ نے سب مسلمانوں کو ایک قرأت پر جمع کرنے کی تدبیر کی۔ چونکہ قرآن کریم کے مخاطب اول قریشی تھے اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے تھا۔ لہٰذا قریش کی قرأت کو ترجیح دی گئی اور خلیفۂ ثالث نے اسی کے مطابق کی نقلیں کرا کر ایک ایک نقل ہر صوبہ کے والی کے پاس بھجوا دی اور یہ حکم جاری کیا کہ سب مسلمانوں کو اسی کے مطابق قرأت کرنے کے لیے کہا جائے تاکہ پوری اسلامی دنیا میں یکسانیت رہے اور کلام پاک جس شکل میں نازل ہوا ہے اسی میں قائم و برقرار رہے۔ اس سلسلہ میں موریس بوکائیے کا بیان بھی قابل توجہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

"ممکن ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں یہ بات پیدا ہو کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے پہلے تین خلفا، خصوصاً حضرت عثمانؓ کو قرآن کریم جمع کرنے اور متن پر نظرثانی کرنے کی جانب مائل کیا۔ وجوہات فی الحقیقت نہایت سادہ ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ابتدائی دہائیوں میں اسلام کی اشاعت بہت تیزی سے ہوئی۔ اور یہ ان قوموں میں پھیلا

جن کی مادری زبان عربی نہیں تھی۔ اس صورت میں یہ بات ضروری تھی کہ ایک ایسا متن تیار کیا جائے جس میں انتہائی صحت سے قرآن ہو۔ یہ حضرت عثمانؓ کے نظر ثانی کرانے کا بنیادی مقصد تھا۔[1]

ابتداً قرآن کریم میں نقطے اور اعراب نہیں تھے۔ عربوں کو اس کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی لیکن غیر عربوں میں صحت کو برقرار رکھنے کے لیے اس چیز کو ضروری سمجھا گیا۔ اور نقطے اور اعراب لگا کر قرآن کریم کی موجودہ شکل دے دی گئی۔ اور یہ سب کام پہلی صدی ہجری ہی میں مکمل ہو گیا۔ ان سب تدابیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا تھا اور الکتاب آج تک اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ تا قیامت رہے گا۔ یہاں بھی موریس بوکائیے کی شہادت ملاحظہ ہو:

"حضرت عثمانؓ سے جن نسخوں کو منسوب کیا جاتا ہے وہ تاشقند اور استنبول میں موجود ہیں۔ نقل کرنے میں ایک آدھ ممکنہ سہو سے قطع نظر اس وقت جو قدیم ترین نسخے معلوم ہیں اور پوری اسلامی دنیا میں دریافت ہوئے ہیں وہ بالکل ان ہی جیسے ہیں۔ یہی بات ان نسخوں پر بھی صادق آتی ہے جو یورپ میں محفوظ ہیں (پیرس کی نیشنل لائبریری میں ایسے پارے موجود ہیں جو ماہرین کی تحقیقات کے بموجب آٹھویں اور نویں صدی عیسوی یعنی دوسری اور تیسری صدی ہجری تک کے ہیں)۔"[2]

1۔ بائبل، قرآن اور سائنس ص ۱۱۳
2۔ ایضاً ص ۱۲۴

قرآن کریم کے متن کی صحت کے بارے میں اس قدر تفصیل سے لکھنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کتاب ہدایت کی حفاظت کا وعدہ اللہ رب العزت نے کس کس طرح پورا کیا ہے۔ چودہ سو سال سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد بھی اس میں ایک لفظ اور ایک شوشہ کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دنیا کی کوئی کتاب بھی اس معاملے میں قرآن کریم کی سہیم و شریک نہیں ہے۔ دوسرے ان لوگوں کو توجہ دلانا مقصود ہے جو خود کو مسلمان کہلانے کے باوجود اس بات کے مدعی ہیں کہ قرآن میں ہر طرح کی تحریف ہوئی ہے۔ ان کو خدا کا خوف کرنے کی ضرورت ہے کہ اس طرح وہ اللہ کے اس ارشاد کے علی الرغم "إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ" وہ اس کے وعدہ کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ ساتھ ہی انھیں اس بات پر شرمانا چاہیے کہ ایک غیر مسلم نہایت وثوق سے کہہ رہا ہے کہ "اس وقت جو قدیم ترین نسخے معلوم ہیں اور پوری اسلامی دنیا میں دریافت ہوئے ہیں وہ یکساں ہیں۔ یہی بات ان نسخوں پر بھی صادق آتی ہے جو یورپ میں محفوظ ہیں۔"

بہر حال یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ قرآن کریم نزول کے وقت سے اب تک اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے۔ لہٰذا تلاوت کی صحت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اور اس صحیح متن کی روشنی میں جو تفسیر کی جائے گی وہ بھی صحیح ہوگی۔ اور اس کے مطابق جو عمل کیا جائے گا وہ بھی عین منشاء الٰہی کے مطابق ہوگا۔

جیسا کہ صدر میں بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم کے مخاطب اول عرب تھے جن کی زبان عربی تھی اور قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لیے اس کے معانی و مطالب سمجھنے میں تو انھیں کوئی دقت نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ چونکہ خالق دوجہاں کا کلام ہونے کی وجہ سے اس میں ایجاز و اختصار اور بیان و بلاغت کسی بھی انسان کے کلام سے بدرجہا فائق و برتر ہے۔ اس لیے اس کے

مقصود اصلی تک پہنچنا ہر عرب کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ اور بہت سے مقامات ایسے تھے جہاں انھیں بھی صناحت و صراحت کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اس ذات سے زیادہ بہتر طریقہ پر کون کر سکتا تھا جس کے قلب مطہر پر اس کا نزول ہو رہا تھا۔ چنانچہ احادیث صحیحہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جہاں ضرورت پڑتی تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تفسیر فرما دیتے تھے اور جن مواقع پر صحابہ کرام کو وضاحت درکار ہوتی تھی وہاں وہ خود دریافت کر لیتے تھے اور حضور توضیح و تشریح فرما دیتے تھے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث مل جائے تو وہ تفسیر کا بہترین ماخذ سمجھی جائے گی۔ لیکن جس طرح اور مسائل میں موضوعات کی کثرت ہے اسی طرح تفسیری روایات میں بھی بہت سی ایسی ہیں جو قابل اعتماد نہیں سمجھی جائیں۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی الاتقان میں فرماتے ہیں:

"(تفسیر کا ایک ماخذ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا جاتا (ہے) اور یہ سب سے بہترین ماخذ ہے۔ لیکن ضعیف اور موضوع روایت سے پرہیز لازم ہے کیونکہ اس طرح کی بہت زیادہ روایتیں آئی ہیں اور اسی لیے امام احمد نے کہا ہے کہ: "تین قسم کی روایتیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے": مغازی، ملاحم اور تفسیر امام ممدوح کے اصحاب میں سے محققین نے کہا ہے کہ "اس قول سے امام صاحب کی مراد یہ ہے کہ بیشتر صورتوں میں ان امور کی صحیح اور متصل سندیں نہیں پائی جاتی ہیں۔ ورنہ یوں تو اس کے متعلق اکثر صحیح روایتیں بھی آئی ہیں جیسے سورہ الانعام کی آیت میں لفظ "ظلم" کی تفسیر "شرک" کے ساتھ حِسَابًا يَسِيرًا کی "عرض" کے

ساتھ اور قولہٖ تعالیٰ "وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" میں لفظ "قُوَّةٍ" کی تفسیر "تیر اندازی" کے ساتھ بہ صحت مروی ہے۔[1]

میں کہتا ہوں کہ تفسیر کے متعلق صحیح روایتیں فی الواقع بہت ہی کم ہیں بلکہ اس قسم کی روایتوں سے اصل مرفوع احادیث حد درجہ قلت کے ساتھ پائی گئی ہیں۔ اور ان شاء اللہ میں اسی کتاب کے آخر میں ان سب روایتوں کو بھی بیان کروں گا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں وہ تفسیر اعلیٰ و افضل سمجھی جائے گی جو صحابہ کرامؓ سے منقول ہو۔ اس لیے کہ انہی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست اخذ فیض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخ تفسیر و مفسرین میں علامہ احمد حریری تحریر فرماتے ہیں:

"صحابہ قرآن کی وہی تفسیر بیان کرتے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے یا جس آیت کا سبب نزول انہوں نے خود ملاحظہ کیا ہوتا۔ یا جو چیز بطریق اجتہاد و استنباط ان پر منکشف ہوتی۔"[2]

علامہ جلال الدین سیوطی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"(تفسیر کا دوسرا ماخذ) صحابی کے قول سے اخذ کرنا ہے۔ کیونکہ ان کی تفسیر علماء کے نزدیک بمنزلہ اس روایت کے ہے جو نبی کریم

---

[1] الاتقان حصہ دوم (اردو) ترجمہ مولانا محمد حلیم انصاری، ناشر نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی ص ۵۷۶

[2] تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۶۵

صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوعاً ہو۔ جیسا کہ حاکم نے اپنی مستدرک میں کہا ہے۔ اور ابوالخطاب حنبلی نے کہا ہے کہ "جب ہم یہ کہیں کہ صحابی کا قول حجت نہیں ہے تو اس سے احتمال ہوتا ہے کہ اسکی طرف رجوع نہ کرنا چاہیے۔ مگر درست وہی پہلا قول ہے۔ یعنی صحابیؓ سے اخذ کرنا چاہیے کیونکہ صحابی کا قول روایت کی قسم سے ہے نہ کہ رائے کے باب سے"۔[1]

امام جلال الدین سیوطی کے حوالہ سے غلام احمد حریری نے مشہور مفسر صحابہ کے حسب ذیل اسماء گرامی تحریر کیے ہیں:

(۱) حضرت ابوبکرؓ　　(۲) حضرت عمرؓ
(۳) حضرت عثمانؓ　　(۴) حضرت علیؓ
(۵) حضرت ابن عباسؓ　　(۶) حضرت ابن مسعودؓ
(۷) حضرت ابی بن کعبؓ　　(۸) حضرت زید بن ثابتؓ
(۹) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور (۱۰) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ[2]

لیکن جب علامہ سیوطی تفسیری روایات کے بارے میں قطعیت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں۔

"میں کہتا ہوں کہ تفسیر کے متعلق صحیح روایتیں فی الواقع بہت ہی کم ہیں۔ بلکہ اس قسم کی روایتوں سے اصلی مرفوع احادیث حد درجہ قلت کے ساتھ پائی گئی ہیں"۔

تو کیا آثار صحابہ کے بارے میں یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں بھی بہت سے

---

[1] الاتقان حصہ دوم (اردو) ص ۵۷۶
[2] تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۶۵

جعلی اور وضعی ہیں۔ خود علامہ احمد حریری نے الاتقان کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ

"ابن الحکم کا قول ہے کہ میں نے امام شافعی کو یہ فرماتے سنا۔
ابن عباس سے تفسیر کے سلسلے میں تقریباً ایک سو احادیث ثابت ہوئی ہیں۔"[1] (الاتقان جلد ۲ - ص ۱۸۵)

اس کے بعد حریری صاحب اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اگر یہ بات واقعی امام شافعی نے فرمائی ہو تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو تفسیر ابن عباس کی جانب منسوب ہے اس میں واضعین نے کس عظیم جسارت سے کام لیا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں دلیل یہ ہے کہ اس تفسیر میں ابن عباس سے جو اقوال نقل کیے گئے ہیں اس میں کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے۔"[2]

اسی طرح تفسیر کے متعلق اپنی معلومات کے سلسلے میں حضرت علیؓ سے جو بیانات کتابوں میں درج ہیں وہ ان کے اپنے نہیں معلوم ہوتے بلکہ بعد کے لوگوں کے ہیں جو حضرت علیؓ کی جانب منسوب کر دیے گئے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی تعلی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ہونا ممکن نہیں ہے۔

"تم لوگ مجھ سے سوال کرو کیونکہ واللہ تم جو بات دریافت کرو گے میں تم کو اس کی خبر دوں گا۔ ہاں مجھ سے کتاب اللہ کی نسبت پوچھو اس لیے کہ واللہ کوئی آیت ایسی نہیں جس کی بابت مجھ کو علم نہ ہو خواہ وہ رات کو اتری ہو یا دن کو، پست ہموار میدان میں نازل ہوئی ہو یا پہاڑ میں۔"[3]

---

[1] تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۸۶ [2] ایضاً ص ۸۶

[3] رسالہ فہم القرآن از ڈاکٹر عبدالرشید استاد شعبۂ علوم اسلامی جامعہ کراچی ناشر جامعہ سٹر... کراچی ص ۲۸

یا بقرہ ——— " فرمایا۔ اگر میں چاہوں تو سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کو لاد دوں تو میں کر سکتا ہوں ۔" [1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاندین نے جس طرح احکام اور نواہی اور تاریخی واقعات کے سلسلے میں احادیث نبوی اور آثار صحابہ میں موضوعات کے انبار لگا دیے ہیں اسی طرح تفسیری روایات میں بھی خواہ وہ احادیث کے نام سے ہوں یا آثار صحابہ کی قسم سے بہت کچھ جعل سازی سے کام لیا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں بڑی احتیاط اور تحقیق سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ لیکن جب یہ تصدیق ہو جائے کہ وہ صحیح ہیں تو پھر ان پر نہ صرف یہ کہ اعتماد کرنا چاہیے بلکہ ان دونوں کو تفسیر کے اعلیٰ ترین ماخذ میں شمار کرنا چاہیے۔

امام جلال الدین سیوطی نے تیسرا ماخذ تفسیر مطلق لغت کو اور چوتھا ماخذ کلام کے معنی مقتضی اور شریعت کو قرار دیا ہے۔

ان چار ماخذات کی نشاندہی کرنے سے پہلے علامہ سیوطی نے علماء کے حوالے سے مفسرین کے لیے جو طریقۂ کار بتایا ہے وہ نہایت مدلل اور معقول ہے۔ اور اسی کے مطابق عمل کرنا مناسب ہے یہ ضرور ہے کہ ہر زمانہ میں لوگوں کی عقل اور سمجھ بوجھ کو دیکھتے ہوئے بات کہی جائے لیکن ان حدود سے تجاوز کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ اپنی رائے سے کوئی بات کہنا یا قرآن کو اسرائیلیات، فلسفۂ قدیم، مسائل تصوف یا جدید سائنس کے نظریات سے گرانبار کر دینا یا ان کا ترجمان قرار دینا یقیناً

---

[1] وسائل فہم القرآن از ڈاکٹر عبد الرشید۔ استاد شعبۂ علوم اسلامی جامعہ کراچی ناشر طاہر سنز اردو بازار کراچی صفحہ ۲۰۸

گمراہ ہوا ہے۔ قرآن کریم کتاب ہدایت ہے اور اس کو ہدایت کا سر چشمہ سمجھ کر ہی پڑھا جائے اور اس کی تفسیر کی جائے۔

علامہ سیوطی نے مفسرین کے لیے حسب ذیل طریقہ کار بتایا ہے اور یہی صحیح ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"علماء نے کہا کہ "جو شخص کتاب اللہ کی تفسیر کا ارادہ کرے وہ پہلے قرآن شریف کی تفسیر قرآن ہی میں تلاش کرے اسلیے کہ قرآن شریف میں جو چیز ایک جگہ مجمل ہے اسی کی دوسرے مقام پر تفسیر کر دی گئی ہے۔ اور جو شے ایک جگہ مختصر کر کے بیان ہوئی ہے وہی شے قرآن شریف کے اندر دوسرے مقام پہ تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے۔ (ابن جوزی نے تو ایک خاص کتاب ہی ان امور کے بیان میں لکھی ہے جو کہ قرآن کریم میں ایک جگہ اجمالاً بیان ہوئے ہیں اور دوسری جگہ اسی میں ان کی تفسیر کر دی گئی ہے۔ میں نے ایسی باتوں کی چند مثالوں کی طرف مجمل کتاب میں اشارہ کر دیا ہے) پھر جب وہ مفسر قرآن شریف کی تفسیر قرآن ہی سے نہ کر سکے تو اسے لازم ہے کہ (اس کے بعد) قرآن کریم کی تفسیر کو سنت (صحیحہ) سے تلاش کرے کیونکہ سنت (حدیث) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی شارح ہے اور اس کو واضح کر تی ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی باتوں کا بھی حکم دیا ہے وہ سب احکام ایسے ہی ہیں جن کو آپ نے قرآن کریم سے ہی سمجھا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۔ (فی ایات اخرٰی

ترجمہ: ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ تم خدا کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات فیصل کرو۔ (یعنی ان ہدایت کے مطابق جو بعینہٖ آیات میں بیان کی گئی ہیں۔) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "آگاہ رہو بے شک مجھ کو قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے مطابق ایک اور چیز بھی اس کے ساتھ عطا ہوئی ہے یعنی سنت) اور اگر سنت سے بھی تفسیر کا پتہ نہ چلے تو اب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقوال کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ بلاشبہ وہ لوگ قرآن کے بہت بڑے عالم تھے کیونکہ انھوں نے تمام قرآن اور احوال نزول کے وقت دیکھے تھے۔ اور یوں بھی کہ وہ لوگ کامل سمجھ، صحیح علم اور عمل صالح کی صفات سے متصف تھے۔"

(الاتقان حصہ دوم ۵۵۶)

تفسیر قرآن کے لیے ان ماخذات کے بعد تابعینؒ اور تبع تابعین سے رجوع کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ شانِ نزول یا اسبابِ نزول سے بھی مدد لینی چاہیے۔ لیکن اس معاملہ میں افراط سے کام نہ لیا جائے۔ یعنی ہر آیت کے لیے شانِ نزول کی جستجو میں نہ رہا جائے کیونکہ ایسے واقعات بہت محدود تعداد میں ہیں جو کسی آیت کے نزول کا سبب بنے اسی طرح تفسیر بالرائے سے حتی الوسع پرہیز کیا جائے اس لیے کہ اس کے لیے بڑی سخت وعید ہے۔ البتہ جو لوگ عربوں کے اسلوب کلام، عربی الفاظ اور ان کے وجوہ دلالت سے بخوبی آگاہ ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اشعار جاہلی، اسباب نزول، ناسخ و منسوخ اور ان امور سے

نابلد نہ ہوں۔ جو مفسر محض اپنے اندازے اور قیاس کا سہارا لیتے ہیں، ان کے لیے اپنی رائے سے تفسیر کرنا ناجائز ہے۔ ایسے لوگوں کو اصحاب الرائے کہا جاتا ہے۔

شروع میں تفسیر بہت سادہ اور مختصر ہوتی تھی، بعض اوقات تو صرف اشارے ہی ہوتے تھے۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ مغضوب علیہم کون لوگ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "یہود"۔ کہا گیا، اور "الضالین" یہ کون ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "نصاریٰ"۔

اسی طرح عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا کی تلاوت فرمائی تو میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے کیا معنی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص زیادہ عقلمند ہوگا وہی تم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کی ہوئی چیزوں سے بہت پرہیز کرے گا۔ اور اطاعت الٰہی میں بہت زیادہ عمل پیرا ہوگا۔

جیسے جیسے آغازِ اسلام سے دوری ہوتی گئی ویسے ویسے تفسیر کی ضرورت بھی بڑھ گئی اور اس میں تفصیل بھی پیدا ہوتی گئی۔ ویسے بھی عرب لوگ "مَا قَلَّ وَدَلَّ" کے قائل ہیں۔ عجمی مزاج تفصیل کا طالب ہے۔ چنانچہ جب علوم اسلامی کی اشاعت کا کام عجمیوں نے اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے دیگر علوم کی طرح تفسیر میں بھی تفصیلات بھر دیں۔ ابن جریر طبری پہلے مفسر ہیں جن کی تفسیر "جامع البیان فی تفسیر القرآن" نہایت تفصیلی ہے۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے سے تفسیر قرآن میں اسرائیلیات بھی شامل ہونا شروع ہو گئیں۔ بعض یہودی جو دائرہ اسلام

میں داخل ہوئے تو انھوں نے قرآن کریم کے مجمل بیانات کی تفسیر بائیبل میں درج تفصیلات سے کی۔ پھر یہ دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اور یہود و نصاریٰ کے اثر سے بائیبل کی بہت سی من گھڑت داستانیں بھی تفسیر میں شامل ہو گئیں۔ اور اب وہ عام مسلمانوں کے لیے جزو ایمان کا درجہ حاصل کر گئی ہیں۔

نزول قرآن کے وقت بعض ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے کوئی نہ کوئی قرآنی آیت نازل ہوئی۔ چونکہ یہ واقعات صحابہ کے علم میں ہوتے تھے اس لیے جب وہ ایسی آیات کی تفسیر بیان کرتے تو ان واقعات کو اسباب نزول یا شان نزول کے طور پر پیش کرتے تھے۔ ان اسباب سے ان آیات کے مطالب سمجھنے میں مدد ملتی تھی۔ آج بھی ایسی آیات کی تفسیر کو بہتر طریقہ پر سمجھنے میں ان کی شان نزول سے کافی مدد ملتی ہے۔ مثلاً یہ آیت بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی جس کی وجہ سے ایسے موقعوں کے لیے حکم خداوندی معلوم ہو گیا تھا۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (الانفال ۸ : ۶۷) (ترجمہ: کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو۔ حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے)۔

اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں مگر محدود تعداد میں۔ جن کی طرف آیات قرآنی اشارہ کر رہی ہیں۔ ایسے واقعات کا علم و حقیقت آیات قرآنی کے معنی سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ اس طرح شان نزول

کی تلاش و جستجو ضروری ہے تاکہ آیت کا محل نزول صحیح معلوم ہو جائے۔
شاہ ولی اللہؒ نے بھی "فوز الکبیر" میں اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی ہے
مگر بعض مفسرین نے اس معاملہ میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ جیسے
محمد ابن اسحاق کلبی۔ اس نے اسباب میں اتنی زیادتی کی ہے کہ ہر آیت کے تحت
ایک قصہ نقل کر دیا ہے۔

خلافتِ عباسیہ کے زمانہ میں جب یونان سے فلسفہ در آمد ہوا تو ہر چیز
کو فلسفہ کے رنگ میں رنگا جانے لگا۔ اسی کی مدد سے مسلمانوں میں ایک
نئے علم "علم الکلام" کا اضافہ ہوا۔ شروع میں اس کا مقصد نیک اور
درست تھا۔ اس لیے کہ مخالفین و معاندین کو ان ہی کی دلائل سے خاموش
کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بعد میں اس کی لے اتنی بڑھی کہ قرآن کریم کی تفسیر بھی
کلیتہً یا بہت کچھ اسی کی روشنی میں کی جانے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتابِ
ہدایت فلسفہ کی کتاب معلوم ہونے لگی۔ اس معاملہ میں معتزلہ نے بہت
شدت برتی۔ اور اس کی وجہ سے بحث و مباحثہ اور مناظروں کی گرم بازاری
شروع ہو گئی اور دین کی حرارت سرد پڑ گئی۔ جار اللہ زمخشری کی "الکشاف"
اور امام فخر الدین رازی کی "تفسیر کبیر" اسی نوع کی تفسیریں ہیں۔ اول الذکر
اگرچہ ادبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے لیکن اعتزال کے توسط سے اس میں
فلسفہ کا رنگ آ گیا ہے۔

چھٹی ساتویں صدی ہجری میں "تصوف" کو کافی فروغ حاصل ہوا
اور حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے اثر سے توحید وجودی یا وحدت الوجود
کے نظریہ کو اتنی مقبولیت نصیب ہوئی کہ قرآن کریم کی تفسیر تصوف کی اصطلاحات
میں کی جانے لگی۔ اور حضرت ابن عربیؒ نے تفسیر قرآن پر توحید وجودی کا
اتنا گہرا رنگ چڑھایا کہ شریعت اور شرعی مسائل پس منظر میں جا پڑے

اور معلوم ہونے لگا کہ قرآن کریم التصوف کی کتاب ہے۔

موجودہ زمانہ میں سائنس اور سائنسی ایجادات کا بہت زور ہے۔ اور سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے اقوام عالم کی قیادت ان ہی قوموں کے ہاتھ میں ہے جو سائنس کو ترقی دے رہی ہیں۔ اس کی بنا پر ہمارے بعض دانشوروں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ قومیں ترقی کے میدان میں ہم سے اس لیے آگے ہیں کہ انھوں نے قرآنی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے اپنی توجہ کو سائنسی علوم پر مرکوز کر دیا ہے۔ ہم مسلمان تو صرف نماز روزے کے چکر میں پڑ گئے ہیں اور انھوں نے مقصد تخلیق آدم کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر اس کام کو اپنا لیا ہے جو دنیا میں ترقی و سربلندی کا موجب ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و کبریائی اور اس کی قدرت و خلاقیت کو سمجھنے کے لیے کائنات کی مختلف اشیاء پر غور و تدبر کرنے کے لیے جو ہدایت دی گئی ہے اس کو ان مرعوب ذہنیت کے دانشوروں نے سائنسی ایجادات و اختراعات کی جانب اشارات قرار دے کر مسلمانوں کو مشورہ دینا شروع کر دیا ہے کہ اب بھی اگر تم دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہو تو قرآن کے ان اشاروں کو سمجھو اور ان کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ سائنسی ایجادات کرو۔ بعض حضرات نے اس سلسلہ میں کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جیسے دو قرآن، سائنٹفک قرآن، تجلیاتِ قرآن وغیرہ۔ ان کے علاوہ آئے دن اس موضوع پر مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن سائنس کی کتاب ہے اور اس کی تفسیر سائنس ہی کی روشنی میں ہونی چاہیے۔ اور اسی کے مطابق ہمارا نظام زندگی مرتب ہونا چاہیے۔ علامہ اقبال کے اس مصرعہ کے مصداق یہی لوگ ہیں۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

اس سلسلہ میں ایک غیر مسلم کی رائے سن لیجیے۔ بائبل قرآن اور سائنس کے مصنف موریس بوکائے اپنے ایک لیکچر میں جس کا عنوان "قرآن اور جدید سائنس" ہے۔ واضح الفاظ میں کہتے ہیں:

"تاہم ان سائنسی مباحث سے ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ قرآن مجید خاص طور پر ایک مذہبی کتاب ہے اور اس سے یہ توقع ہرگز نہیں رکھی جا سکتی کہ اس کا مقصد بنیادی طور پر سائنسی معلومات فراہم کرنا ہے۔ جب انسان کو تحقیق سے متعلق امور اور متعدد قدرتی حوادث پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس طرح کی مثالوں کو سامنے رکھ کر اس مقصد کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کی ربوبیت پر زور دینے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ حقیقت کہ اس غور و خوض میں ہی ہمیں سائنسی معلومات سے متعلق جو حوالے مل جاتے ہیں وہ یقیناً خدا کا ایسا انعام ہیں جن کی قدر و قیمت اس دور میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب سائنس پر مبنی دہریت اس کوشش میں ہے کہ الوہیت پر ایمان و عقیدہ کو ختم کر کے وہ اپنا استحکام کر دے لیکن قرآن کو اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی فوق الفطرت باتوں کو منوانے کے لیے اس طرح کی غیر معمولی خصوصیات کو کام میں لائے۔ اس قسم کے سائنسی بیانات در اصل وحی و الہام کا حرف ایک خصوصی پہلو ہے۔"[1]

---

[1] قرآن اور جدید سائنس از موریس بوکائے (اردو ترجمہ) مقام اشاعت: پاک کویت اکیڈمی متصل مسجد قدیمہ، اورنگ آباد، ناظم آباد کراچی ۱۹۸۰ء ص ۱۹

طنطاوی جوہری کی تفسیر "الجواہر فی تفسیر القرآن الحکیم" سائنسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔

زمانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے نظریات و عقائد میں تبدیلیوں کی وجہ سے قرآن کریم کی تفسیریں مختلف نہج پر لکھی گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفسیروں کی کئی اقسام ہو گئیں۔ سب سے پہلی اور افضل ترین قسم تو دراصل وہ ہو گی جو ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہو۔

اس کے بعد صحابہؓ سے منقول تفسیری روایات ہیں۔ لیکن چونکہ صحابہ کرام بھی عموماً وہی باتیں کہتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو پہنچی ہیں۔ علاوہ ازیں نزولِ قرآن کے زمانہ میں وہ موجود تھے اور اکثر آیات کے اسباب اور مواقع سے بھی وہ آگاہ تھے اس لیے بعض حضرات ان کی تفسیری روایات کو بھی احادیث کی طرح سمجھ کر دونوں پر مشتمل تفاسیر کو ایک ہی قسم میں شمار کرتے ہیں۔

کچھ حضرات تو اس قسم کو تفسیر بالماثور کا نام دیتے ہیں۔ اور کچھ تفسیر بحسب الآثار کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

برصغیر سے باہر لکھی جانے والی عربی تفاسیر کی حسب ذیل اقسام ہیں۔

(۱) تفسیر بالماثور یا تفسیر بحسب الآثار
(۲) تفسیر بحسب اللغۃ
(۳) تفسیر بحسب المذاہب الفقہیہ
(۴) تفسیر بحسب المذاہب الکلامیہ
(۵) تفسیر بحسب العلوم العمرانیہ
(۶) تفسیر بحسب العلوم الکونیہ
(۷) تفسیر بحسب الصوفیہ

(۱) تفسیر بالماثور یا تفسیر بحسب الآثار

اس قسم میں وہ تفاسیر شامل ہیں جو احادیث نبوی، آثار صحابہ اور اقوال تابعین کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں جو کتابیں اس انداز میں لکھی گئی ہیں ان میں سے چند ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس مولف ابو طاہر فیروز آبادی مطبع الازہریہ

(۲) جامع البیان فی تفسیر قرآن " ابن جریر طبری " الامیریہ

(۳) تفسیر القرآن العظیم " عماد الدین ابن کثیر " التجاریہ

(۴) الجواہر الحسان " عبدالرحمن ثعالبی " الجزائر

(۵) الدر المنثور " جلال الدین سیوطی " میمنیہ

(۲) تفسیر بحسب اللغتہ

جس تفسیر میں قرآن پاک کی تشریح و توضیح کی جاتی ہے اور زمانۂ نزول قرآن کے اشعار اور خطبوں سے استشہاد کیا جاتا ہے وہ تفسیر بحسب اللغتہ کہلاتی ہے۔ اس انداز پر لکھی جانے والی چند تفاسیر کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) مجاز القرآن مولف ابو عبیدہ

(۲) معانی القرآن " فراء

(۳) الکشاف " محمود بن عمر جار اللہ زمخشری

(۳) تفسیر بحسب المذاہب الفقہیہ

جو تفسیر فقہی اور احکامی مسائل کے استنباط کی بنیاد پر لکھی جائے۔

وہ اس ذیل میں آتی ہے۔ اس نوع کی تفاسیر کی تعداد کثیر ہے۔ ان میں سے چند کتابوں کے نام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) احکام القرآن، مولفہ احمد بن علی رازی ابوبکر جصاص مطبع البہیۃ المصریہ

(۲) احکام القرآن، ابوبکر بن العربی، سعادۃ

(۳) الجامع الاحکام القرآن، قرطبی، دار الکتب

(۴) تفسیر بحسب المذاہب الکلامیہ

اس قسم کی تفاسیر میں کلامی نقطۂ نظر کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور عقلی دلائل سے قرآن کے مفہوم و مراد کو سمجھایا جاتا ہے۔ عقائد کی تفہیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ چند تفاسیر کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) مفاتیح الغیب معروف بہ تفسیر کبیر، مولفہ امام فخر الدین رازی مطبع امیریہ

(۲) جامع التاویل ابو مسلم اصفہانی (معتزلی)

(۳) تاویلات القرآن امام ابو المنصور ماتریدی

(۵) تفسیر بحسب العلوم العمرانیہ

عمرانیات یا معاشرتی اور تمدنی نقطۂ نظر سے کی جانے والی تفسیر اس ذیل میں آتی ہے۔ اس قسم کی تفسیر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن ہر دور کے انسانی مسائل کو حل کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ کی تفاسیر ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تفسیر المنار مولفہ علامہ رشید رضا با امداد مفتی محمد عبدہ

(۴) الدروس الدینیہ — مطبع المنار / مطبوعہ قم الازہر

(۶) تفسیر بحسب العلوم الکونیہ

علوم الکونیہ ان علوم کو کہا جاتا ہے جن پر دنیاوی ترقی و تنزل کا بہت کچھ انحصار ہے۔ آجکل یہ حیثیت سائنسی علوم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم پورے نظامِ زندگی کا احاطہ کرتا ہے تو سائنسی علوم بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن اس پر اتنا زور دینے کی ضرورت نہیں کہ قرآن بجائے کتابِ ہدایت کے سائنس کی کتاب معلوم ہونے لگے۔ اس نوع کی چند تفسیریں ہیں۔ ان میں قابلِ ذکر درج ذیل ہے۔

(۱) تفسیر الجواہر — مولف طنطاوی جوہری — مطبع مصطفیٰ حلبی

(۷) تفسیر بحسب الصوفیہ

اس قسم کی تفسیریں مسائلِ تصوف کا استخراج و استنباط آیاتِ قرآنی سے کیا جاتا ہے۔ اور تشریح و توضیح صوفیہ کے نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے۔ خاص طور پر نظریۂ وحدت الوجود کا ثبوت بہم پہنچایا جاتا ہے اس قسم کی حسب ذیل تفاسیر قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) تفسیر قرآن الکریم — مولف سہل تستری — مطبع سعادہ
(۲) عرائس البیان — 〃 ابو محمد روزبہان — 〃 ہند
(۳) تفسیر ابن عربی — 〃 عبد الرزاق کاشانی — 〃 المیریہ

برصغیر میں تفسیرِ قرآن کا کام

چونکہ پورا تحقیقی مقالہ اسی موضوع پر ہے اور اس پر کافی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اس لیے مزید کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ یہاں تفسیر کا کام بہت دیر سے شروع ہوا۔ ابتداءً عربی تفاسیر سے ہوئی۔ ان میں بھی قابلِ ذکر گجرات یا دکن میں لکھی گئیں۔ شمالی ہندوستان میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس خلا کو پورا کیا۔ ان کی تفسیر مظہری اٹھارویں صدی میں منظرِ شہود پر آئی لیکن بہترین تفاسیر میں اس کا شمار ہے۔ اردو میں تفسیر کا کام بہت پہلے شروع ہو گیا تھا اور دکن اور شمالی ہند میں بڑی تعداد میں مکمل اور جزوی تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن رواں صدی میں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ اپنے حجم اور مواد کے اعتبار سے نہایت گراں قدر ہیں۔ یہ تفسیریں کئی کئی جلدوں میں ہیں اور مفسرین نے قرآن کریم کے منشاء و مقصود کو مختلف انداز سے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علماء نے براہ راست اردو میں لکھنے کے ساتھ ساتھ متعدد مشہور عربی تفاسیر کو بھی اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اور اب کہ برصغیر کے مسلمانوں کا عربی زبان سے تعلق بہت کم رہ گیا ہے۔ عربی کے اس نادر و نایاب ذخیرہ کو ان کے لیے سہل الحصول بنا دیا ہے۔ تفسیر لکھنے کا کام ہر مکتبِ فکر کے لوگوں نے کیا ہے۔ نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے ان تفاسیر میں اختلاف کا پایا جانا تو ایک قدرتی امر ہے لیکن کسی کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

تفسیر کی جو قسمیں سطورِ بالا میں بتائی گئی ہیں ان سب کا اطلاق برصغیر میں لکھی جانے والی بالخصوص اردو کی تفاسیر پر نہیں ہوتا۔ اکثر تفاسیر میں تو کوشش کی گئی ہے کہ عام فہم انداز میں قرآن کے منشاء و مقصود کو واضح

کر دیا جائے تاکہ عام آدمی جان سکے کہ اللہ کے کلام سے دینی اور دنیوی زندگی میں کس طرح ہدایت حاصل کی جائے۔ بعض حضرات نے آیاتِ قرآنی میں تسلسل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض حضرات نے جدید ذہن کو مطمئن کرنا چاہا ہے۔ غرض ہر مفسر کے پیشِ نظر قرآنِ الحکیم کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابلِ فہم بنانا اور ہدایت پہنچانا ہے۔ اور اس مقصد کے نیک ہونے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

چونکہ برِصغیر میں مختلف مکاتبِ فکر کے مسلمان آباد ہیں لہٰذا اردو زبان میں لکھی جانے والی تفاسیر کی قسمیں اسی اعتبار سے متعین کی جا سکتی ہیں۔ یہ قسمیں ذیل میں درج ہیں۔

(۱) تفسیر بحسب سوادِ اعظم اہلِ سنت
(۲) تفسیر بحسب جماعت اہلِ سنت
(۳) تفسیر بحسب امامیہ اثنا عشریہ
(۴) تفسیر بحسب جماعت قادیانی
(۵) تفسیر بحسب جماعت احمدی لاہور

جائزہ

اس مقالے کے موضوع کی وسعت کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس کو علم ہے کہ مسلمانوں نے اپنی مذہبی کتاب یعنی قرآن حکیم کے ساتھ کس قدر اعتنا کیا ہے۔ ویسے تو جملہ قرآنی علوم پر اتنا کام ہوا ہے کہ اس کی وسعتوں کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن اس کتابِ ہدایت کی تفسیر و تشریح کی جانب کچھ زیادہ ہی توجہ کی گئی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے جب تک اس کو پوری طرح اور صحیح طور پر سمجھا نہ جائے گا اس کے مطابق عمل کے لیے قدم کیسے

آگے بڑھے گا۔ اسی ضرورت کے پیش نظر چودہ سو سال سے اس بحر ناپیدا کنار کے اندر غواصی کی جا رہی ہے اور ہر غواص نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس سے گوہر آبدار نکالے ہیں۔ اور انھیں اپنے خزینوں میں سلیقہ سے سجایا ہے۔ یہ سب مل کر اتنا بڑا خزانہ جمع ہو گیا ہے کہ اس کا ایک سرسری سا جائزہ لینا بھی کسی ایک انسان کے لیے دشوار ہے۔ چہ جائیکہ ایک طرف اس عظیم گنجینہ کا عمومی جائزہ لینا اور دوسری طرف رواں صدی کے دوران اردو ادب میں جمع شدہ سرمایہ کو کسی قدر عمیق نظر سے دیکھنا۔ ان دونوں کاموں کی وسعتوں کا تصور بھی انسان کو پست ہمت کر دینے کے لیے کافی ہے۔ لیکن چونکہ اس نیک کام کو کرنا تھا اس لیے السَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ کہہ کر کام شروع کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو تکمیل کی منزل تک پہنچا دیا۔

مقالہ ہٰذا میں کام کی نوعیت تو ظاہر و باہر ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ کتاب ہدایت کو ہمارے دینی رہنماؤں نے کس کس طرح سمجھا ہے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے جو دن میں بار بار پڑھی جاتی ہے۔ یہ دراصل بارگاہِ رب العزت میں ایک عہد ہے جو بندہ اپنے رب سے بار بار کرتا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اس کی وضاحت و صراحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس آیت کا ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ "اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور اے اللہ ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں"۔ لیکن اس کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک تو اس آیت سے عبادت اور استعانت دونوں کے لیے ایک ہی حکم نکلتا ہے۔ یعنی ان دونوں میں اللہ کے ساتھ

کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ عبادت میں تو واقعی کسی کو شریک نہیں ہونا چاہیے۔ مگر استعانت میں شرکت کی گنجائش نکلتی ہے۔ اس اختلاف کی صورت میں فیصلہ کرنا مشکل نظر آیا۔ لہٰذا ایسے بعض اختلافات کی نشاندہی کر دی گئی لیکن فیصلہ دوسروں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ اللہ جس کو جیسی توفیق دے۔

قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں اختلاف کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے، البتہ قرآن کریم میں اس قدر ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ عوام کو سمجھانے کے لیے مفسرین کو تفصیلات بیان کرنا پڑیں۔ ان تفصیلات کے بیان کرنے میں بھی کسی جگہ اختلاف محسوس ہوتا ہے۔ حتی الامکان ایسے مقامات کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

لیکن جن مفسرین کا اس مقالہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے کام کا الگ الگ جائزہ لینا اور ان کا باہم مقابلہ کرنا ہی نہایت دشوار تھا اسی لیے زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی بلکہ جستہ جستہ مقامات پر ان تفاسیر (صرف اردو تفاسیر) کا سرسری سا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس جائزہ سے ان حضرات کو کچھ سہارا مل جائے جو آئندہ الگ الگ تفاسیر پر کام کریں اور ان کا جائزہ لیں۔

جن علماء نے دو سو سال میں اردو زبان میں تفسیریں لکھی ہیں ان سب ہی نے نہایت لگن، محنت اور عقیدت کے جذبے سے کام کیا ہے اور پورے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کے بعد تفاسیر بیان کی ہیں اور اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ اسلاف سے جس قدر ممکن ہو رہنمائی حاصل کر لیں۔ اس کے باوجود کہیں کہیں نقطۂ نظر میں اختلاف ہو گیا ہے۔ لیکن یہ اختلاف بھی اکثر اوقات دلائل کی بنیاد پر ہوا ہے لہٰذا ان حضرات کو تو الزام دینا

مناسب نہیں البتہ قارئین کو غور و فکر کر کے خود کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔
اور پھر اس فیصلہ کی روشنی میں نیک نیتی سے عمل کرنا چاہیے۔

اکثر حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اردو زبان کم عمر ہے اور زیادہ تر بے توجہی
کا شکار ہے۔ ان کے اس بیان میں حقیقت کا عنصر کافی ہے۔ لیکن
اس زبان کی یہ خصوصیت بھی قابل داد ہے کہ اس کم عمری اور بے توجہی کے
باوجود کئی میدانوں میں بہت سی ترقی یافتہ زبانوں سے گوئے سبقت لے گئی
ہے۔ ان ہی میں ایک علوم اسلامی کا دائرہ ہے۔ چنانچہ اسلام کے دینی مسائل
و موضوعات پر جتنا ذخیرہ اردو میں ہے اتنا سوائے عربی کے اور کسی زبان
میں نہیں ہے۔ اس مقالہ کی تیاری کے دوران یہ حقیقت ہم پر پوری طرح
منکشف ہو گئی ہے۔ اور اس حقیقت کو جھٹلانا اب ایک ہٹ دھرم آدمی
کے سوا اور کسی کے لیے ممکن نہیں رہا ہے۔ یوں تو علوم اسلامیہ پر بھی اردو میں
بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے تراجم اور تفسیر کی
جانب تو ہمارے علماء نے کچھ زیادہ ہی اعتنا کیا ہے۔ غالباً یہ
دعویٰ کسی طرح بھی بے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اردو میں
قرآن کے جتنے ترجمے ہو گئے ہیں اتنے سب زبانوں میں ملا کر
بھی نہیں ہوں گے۔ اور تفاسیر میں بھی کیفیت اور کمیت دونوں
اعتبار سے عربی کے بعد اسی کا دوسرا نمبر ہے۔ زبان و بیان کے
اعتبار سے ان تراجم و تفاسیر میں کافی تنوع ہے۔ اگرچہ فی زمانہ
مسلمان اپنے عمل اور کردار کے لحاظ سے اس مقام پر نہیں
ہیں جہاں سے وہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں پر اپنا
تفوق جتا سکیں۔ پھر بھی برصغیر میں انفرادی اور اجتماعی طور پر
دینی علوم پر اب بھی اتنا کام ہو رہا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی

اس معاملہ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تفسیری ادب میں چونکہ تفہیم دین کی راہ ہموار ہوتی ہے اس لیے تراجم اور تفاسیر کی جانب زیادہ توجہ ہے۔ جو لوگ یہ نیک کام انجام دے رہے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں اس کے لیے جزائے خیر دے اور ان کی نیک نیتی کی برکت سے عام مسلمانوں کو عمل نیک کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِنَا اِلٰی سَوَآءِ الصِّرَاطِ وَتَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝